میں
کل اور آج

- جھگی سے محل تک رسائی کا احوال
- کامیابی کیسے ممکن ہے...؟
- اپنے مالک تک کیسے پہنچا جائے؟

صغیر احمد اسلم

بانی چیئرمین صباء ٹرسٹ صباء ہومز کی آپ بیتی

تحریر وتدوین

ابنِ مہر

میں، کل اور آج

- جھگّی سے محل تک رسّائی کا احوال
- کامیابی کیسے ممکن ہے.....؟
- اپنے مالک تک کیسے پہنچا جائے.....؟

صغیر احمد اسلم
بانی چیئرمین صبا ٹرسٹ۔ صبا ہومز کی آپ بیتی

تحریر و تدوین۔ ابنِ مہر

2017ء صباٹرسٹ۔ صباہومز راولپنڈی، جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل میں ہماری تحریری اجازت کے بغیر شائع نہیں کیا جا سکتا۔

نگران	:	صغیر احمد اسلم
مرتب	:	ابنِ مہر
سرورق	:	فیضان۔ کلرایڈ
اشاعت	:	2017
تعداد	:	1000
کوڈ نمبر	:	GNU-593
آئی ایس بی این	:	978-969-37-0975-9
طابع	:	سگما پرنٹرز، اُردو بازار، راولپنڈی۔
قیمت	:	Rs.1100/-

مزید معلومات کے لیے رابطہ:

فون 92-51-5508351, 0300-519-2204

0302-5852277

انتساب

میرے اور بشریٰ کے والدین اور اساتذۂ کرام کے نام جن کی دعاؤں نے بام عروج تک پہنچایا۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

اس کتاب کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی یتیم بچیوں اور بچّوں کی دیکھ بھال اور فلاح و بہبود پر خرچ کی جائے گی۔

(صبا ٹرسٹ، صبا ہومز)

فہرست

عرض مرتب... 18

دل کی بات... 20

باب اوّل... 32

بچپن اور تعلیم... 32

تعارف... 32

خاندانی پس منظر... 32

اباجی اور میری تعلیم... 33

داداجی کی شخصیت... 35

مالٹوں کی چوری... 35

ماں جی... 37

سکول میں داخلہ... 38

پاکستان ہجرت... 38

جان لیوا حملہ... 41

پناہ گزین کیمپ... 42

نانک کی دیانتداری... 43

کیمپ اور مصائب... 44

سرزمین پاکستان... 45

مشکل دور کا آغاز... 46

والدین کا ہاتھ بٹانا... 47

کاشت کاری کا قدیم طریقہ... 47

غربت کے گہرے سائے... 50

تعلیم اور مشکلات... 51

کمالیہ یا 756 52
زندگی پھولوں کی سیج نہیں 52
والدین کی لاعلمی 53
کالج کی تعلیم 54
زندگی کا بہترین حصہ 54
100 کلو میٹر سے زائد یکطرفہ سفر 55
شفقت کا جواب خدمت 55
زندگی آمد برائے بندگی 57
جدائی کا دن 59

باب دوم 62

عملی زندگی کا آغاز 62

بیرون ملک داخلے کی درخواست 62
نوکری اور ترقی 62
عجیب منظر 64
نوکری سے استعفیٰ 65
ایک در بند تو سو در کھلے 67
ڈیلی تاجر 68
گھر آمد 70
داخلے کی پیش کش 70
امریکی یونیورسٹی میں داخلہ 71
زادراہ کی عدم دستیابی 71
روانگی 72

باب سوم 74

بیرون ملک قیام 74

برطانیہ کا سفر 74
جمال عبدالنّاصر سے ملاقات 74
عزیز بخش۔یادگار تجربہ 75
برطانیہ میں مزدوری 76
دن رات کام 77
قرض لینے سے انکار 78
عزتِ نفس، خودداری، خودانحصاری 78
سفر امریکہ 79
امریکہ میں مزدوری سے ابتدا 80
کالج میں داخلہ 81
تعصّب 82
خودداری 84
انتہا کی بے توقیری 86
حالات کا دلیری سے مقابلہ 87
مدد خدا 88
فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ایذ (قرآن کا وعدہ) 90
سوال کرنے سے گریز 91
دال پہ گزارا 91
خودی کی حفاظت 92
حالات میں بہتری 94
گناہ سے بچنے کا نسخہ 95
ایک دلچسپ واقعہ 96
ڈگری کا حصول 99
باعزّت نوکری کی تلاش 100
براڈوے میں انٹرویو 101
ناقابل یقین دعویٰ 102

براڈوے 103
مسٹر ایرن کی خفگی 103
کامیابی کا سفر 106
بطور بلیو پنسل ترقی 107
تاریخی ذمّہ داری کا ملنا 108
پیٹ کے بجائے عزّت کی فکر 108
خطرہ مول لینا 111
مسٹر جیکسن کی سپیشل میٹنگ 113
بہترین سودا 115
کامیابی کا اہم ترین اصول 116
بائر منیجر تعیناتی 117
دباؤ میں درست فیصلہ 117
مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر (Adward W Carter) 119
خاص عنایت 120
آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا 123
عنایت ربیّ 125
اصول پسندی 125
سیکرٹری کی کایا پلٹ 127
لاس اینجلس کو ہجرت 129
لاس اینجلس میں خدمات 131
سیکرٹری کی حیرت 133
نئے باس کی آمد 134
عزّت نفس پہ سمجھوتہ نہ کرنا 134
عزت واحترام میں اضافہ 138
امریکی حکومت میں عہدے کی پیشکش 139
امریکہ میں نکٹائی کا پہلا نمونہ 141

فیشن تخلیقی ماہرین 142
براڈوے میں کلیدی حیثیت 143
محمد علی کلے اور فریزر کی تاریخی فائٹ 144
ومبلڈن ٹینس مقابلے 144
سالانہ رپورٹ 145
دیگر کاروبار (رئیل اسٹیٹ، سٹاک مارکیٹ) 146
سود سے نجات 146
شراب و جواء 147
شادی 147
پانچ رشتے 148
مثالی شریک حیات 150
جہیز 151
میں کیسے کامیاب ہوا؟ 153
پرانا وعدہ 155
براڈوے سے استعفیٰ 155
پاکستان آمد 157
دادا جی کی نصیحت پر عمل 157
پاکستان میں گھر کے حالات 159
فلاحی مرکز 161
مقصد حیات میں رکاوٹ 161
معلوم و نامعلوم رشتہ داروں کی آمد 162
کہاں جاؤں....؟ 164
مقام حیرت 165
ریاض الجنّۃ میں عزّت افزائی 166
امریکہ واپسی 168
براڈوے میں واپسی کی دعوت 168

ذاتی کاروبار کا آغاز 169
معیاری اصول 171
فوری لباس (Insta Dress) 174
گولڈن نیڈل کی شہرت 175
لاس اینجلس ٹائمز میں کالم 176
گولڈن نیڈل کا عروج 178
ہالی ووڈ سٹارز کا پسندیدہ سٹور 178
رجوع 179
خدمت خلق 180
میری کامیابی کے زرّیں عوامل 181
کایاپلٹ 183
باب چہارم 186
خاندان اور دوست 186
بیگم بشریٰ سلطانہ اسلم 186
صائمہ اور عائشہ 190
مختار احمد۔ میرا لاڈلا بھائی 199
میرے دوست 201
امریکہ میں میرا پہلا دوست 201
فریڈ براؤن اور ڈورتھی براؤن (فیملی فرینڈ) 202
ڈاکٹر ولیم جیکسن 203
باب پنجم 206
فلاحی سرگرمیاں 206
ایک حکایت 207
حقیقی اسلام کی جھلک 207

مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) 209
امن واسلام کی علمبر داری 210
اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی 211
امریکہ کا پہلا اسلامی سکول 211
اسلامی سکول کا آغاز 214
کمیونٹی کی رائے کا تقسیم ہونا 215
آمادگی کی کوشش 216
صفی قریشی 217
رؤف گجیانی 219
اورنج کریسنٹ 220
مسلم پبلک افیئرز کونسل کا قیام(MPAC) 221
امریکن مسلم ریسورس گائیڈ 222
اسلامک ریسورس انسٹی ٹیوٹ (Islamic Resource Institute) 223
فلاحی، عوامی اور سیاسی تنظیمیں 224
جامع مساجد 224
ابلاغ عامہ کا رہنما کتابچہ 225
چاند نظر آنے نہ آنے کے تنازع کا مستقل حل 225
کونسل آن اسلامک ایجوکیشن 226
رضاکارانہ کام کے بارے میرا فلسفہ 228
جن تنظیموں کی ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد کی 230
ایسا فاؤنڈیشن (Aisha Syma Aslam Family Foundation-ASA). 232
صبا ٹرسٹ 234
خدمات کا تعارف 237
فلاحی وامدادی خدمات 237
پاکستان میں آنے والا بدترین زلزلہ 2005ء 240
سیلاب 2010ء 243

میڈیکل کیمپ 244
سوا ارب روپے کی ادویات کی تقسیم 245
متاثرین بحالی منصوبہ 245
مویشی فراہمی پروگرام 245
گھروں کی تعمیر 246
سیلاب 2014ء 246
زلزلہ 2015ء 247
تعلیمی خدمات 248
ووکیشنل ٹریننگ 250
مائیکرو کریڈٹ پروگرام 251
تعمیر ملت تعلیمی پروگرام 252
بین المذاہب ہم آہنگی 252
بیرون پاکستان خدمات 254
اندرون ملک خدمات 254
اندرون ملک خدمات 255
انفرادی علاقے 257
صحراء میں پھول (Blossom in The Desert) 258
ایک گاؤں کا تذکرہ 258
صبا ٹرسٹ کا کردار 259
صبا ٹرسٹ اور ربّ نواز 261
ربّ نواز کی کہانی۔ ربّ نواز کی زبانی 261
صبا ہومز 262
صبا گرلز کا پیغام ساری دنیا کے نام 267
صبح کی دعا 267
صبا ہومز سے بچیوں کی لگن 268

صباہومز کے بارے میرا نظریہ 269
ڈرامہ 270
مادی دولت کے بجائے نظریے کو ترجیح 272
صباہومز کی نئی تشکیل 274
بچیوں کے بارے اہم معلومات 274

باب ششم 276

متفرق واقعات 276

دوست کا وقت پر نہ آنا 276
اصول پسندی 277
رشوت ستانی 277
گیس میٹر 279
وقت کی پابندی 279
میرے دوست صفّی قریشی 280
اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی میٹنگ 281
سیرت کانفرنس ﷺ 282
نماز عید 283
میں وقت کا پابند کیسے بنا؟ 284
بلا عنوان (ایک دلچسپ واقعہ) 285
دلیپ کمار اور سائرہ بانو 287
صبر و تحمل 288
ایثار کی کوشش 290
صبر و تحمل کی انوکھی مثال 291
ٹاڈشیہ کا موقّف 299
شاہی مہمان کی حیثیت سے حج 299
عجیب واقعہ 305

مقام عبرت 306
عمرہ2014ء 307
چند دلچسپ حقائق 312
اچھی صحت کا راز 314
واک اور ورزش 316
میں اور میری گولف 319
خوراک 322
صحت کے اصول 324
جب موت مجھے چھو گزری 325
حضور پاک ﷺ نے فرمایا (مفہوم) 329

باب ہفتم.. 332

خلق خدا غائبانہ کیا کہتی ہے.. 332

مولانا وحید الدین ماہنامہ الرسالہ نومبر (2003) 332
جے سالک (سابق وفاقی وزیر، چیف آرگنائزر پاکستان ہیومن رائٹس پارٹی) 339
حمید اللہ جان آفریدی (سابق وفاقی وزیر برائے ماحولیات) 340
ابرار الحق (سنگر، چیئرمین سہارا ٹرسٹ) 340
ڈاکٹر ریوفن جولیس (سابق ایم۔ این۔ اے) 341
پیٹر ای سیکلے (علاقائی صدر۔ دی چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس) 341
نٹ سویٹ (امریکی تاجر۔ 517 ایل۔ سٹینلے۔ لاس اینجلس امریکہ 7 جولائی 1976ء).. 342
فرینک۔ ایل۔ بلیک (منیجر براڈوے۔ نیویارک) 342
جیک لین (پریزیڈنٹ۔ ہیڈ ہنٹرز) 342
ڈاکٹر احمد سکر (صدر فاؤنڈیشن فار اسلامک کالج۔ امریکہ) 343
ڈاکٹر یحیٰی عبد الرحمن (سابق چیئرمین شوریٰ کونسل آف ساؤتھ کیلیفورنیا، چیئرمین بورڈ، صدر لاربیہ بینک آف وٹیئر۔ شمالی امریکہ) 343
ابو بکر وکیل (امریکہ) 343

ڈاکٹر مزمّل۔ ایچ صدیقی (کیلیفورنیا، امریکہ) 344
انور احمد خان (جنرل منیجر۔ اسلامی ریلیف۔ امریکہ) 345
سوخی کینگ (میئر پروٹم، اروائن سٹی۔ امریکہ) 346
رچرڈ جے کوہن۔ سیلز منیجر (کے۔اے سان فیبر کس۔ کیلی فورنیا) 346
ٹم جانسن (امریکی سینیٹر) 347
ڈینا رہرابیکر (کانگریس ممبر) 347
کرسٹوفر کاکس (ممبر آف کانگریس) 348
ڈاکٹر عطا (چیئرمین سوسائٹی فار انٹرنیشنل ہیلپ) 348
شکیل سیّد (ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ اسلامک شوریٰ کونسل) 348
ڈاکٹر یاسمین قاسم (دوست) 348
تھامس ایل تھار کلسن (بشپ، کیلی فورنیا، امریکہ) 349
ڈاکٹر ولیم جیکسن (ڈیزرٹ انٹرنیشنل) 349
صدیق کنڈان گل (نیو اپوسٹولک چرچ۔ پاکستان) 350
جارج گڈمین (سپروائزر، براڈوے) 350
سسٹر خدیجہ (اللہ پاک کے کرم سے انھوں نے ہمارے گھر میں اسلام قبول کیا) 351
خالد یحییٰ بلیک ان شپ (پروفیسر لی ہائے ایونیو، فلاڈلفیا) 352
نعیم شاہ جونئیر (نیشنل ڈائریکٹر۔ علم فاؤنڈیشن) 352
افضل بٹ (صدر، راولپنڈی، اسلام آباد پریس کلب) 353
محمود الحسن صاحب (سابق زونل انچارج ایدھی فاؤنڈیشن لاہور تا پشاور) 354
فرحت الکبریٰ (سابقہ ایڈ منسٹریٹر صبا ہومز) 354
احمد المطوع (داماد صغیر احمد اسلم) 359
عائشہ اسلم (دختر صغیر احمد اسلم) 361
”زندگی جئیں تو ایسی“ 363
جمیل بھٹی (صحافی۔ کالم نگار اسلام آباد) (ان کا کالم جو جولائی 2010 کو روزنامہ جناح میں شائع ہوا) 363
سید ظفر عباس (صحافی، کالم نگار، کیلی فورنیا۔ امریکہ) 367
ٹاڈ شیہ (امریکی سنگر۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ سی۔ ڈی۔ آر۔ ایس) 370

محمد خان (سیّاح، دوست) 373
Muhammad Khan (Friend, World Traveller) 374

باب ہشتم 378

میری پسند 378

اقوالِ زریں 388

اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے 390

اے ابن آدم! 391

کی جاناں میں کون بلھیا 392

ایک نظم 393

متفرق اشعار 394

تصویر گیلری 398

عرض مرتب

اس کتاب کو لکھنے میں جن لوگوں کا حصہ ہے انھیں یاد کرنا قرینۂ انصاف ہے۔
جب 2009 میں اسے لکھنے کا بیڑا اٹھایا تو نا معلوم، معلوم ہونے لگا۔ بڑی مشکل سے قریباً سات سال کی مسلسل کوشش سے آخر کار یہ کتاب وجود میں آ گئی۔ پیشہ ور یا ماہر فنِ ادب ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں بلکہ یہ ایک عاجزانہ کوشش ہے جو مالکِ کتاب اور صاحبِ کتاب کی نظر / نذر ہے۔

یہ کتاب جتنی بڑی شخصیت پہ لکھی گئی ہے اسی لحاظ سے نظر ثانی کرنے والوں کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ان میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے متحرک انتظامی قائد پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید، سجاد صاحب، وفا چشتی صاحب، سید بلال قطب، ساجدہ بیگم اور شیراز حیدر شامل ہیں۔ تیس سال پہلے شروع ہونے والی اس کتاب میں قابل قدر حصہ جناب اسماعیل شاد، بریگیڈیر (ر) افضل اور ڈاکٹر نذیر صاحب نے ڈالا ہے۔

زندگی اپنے اندر کثیر رنگ و روپ رکھتی ہے۔ ہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان طفل کی حیرت لئے جہان ورنگ وبو کو دیکھتا، جھجکتا اور ایک رنگ چنتا ہے۔ لاعلمی، بے راہبری اور تجسس اسے ان دیکھے راستوں پر روانہ کرتے ہیں۔ انسان اپنا مخصوص جہان تخلیق کرتا اور اس میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وقت آتا ہے کہ واپسی کا بگل بجتا ہے۔ اس وقت سنبھلنے، خود کو درست کرنے اور نئے سرے سے صراط مستقیم سے سفر شروع کرنے کی درخواست پہ غور نہیں کیا جاتا۔

فرد اور فطرت کا رشتہ ازلی اور ابدی ہے۔ ایک جیتا جاگتا وجود ترتیب دینا اور پھر اسے مشقت، حق تلفی، ناانصافی، ظلم و ستم سے آراستہ دنیا میں دھکیل دینا اور پھر بے آسرا چھوڑ دینا ناانصافی ہوتا۔

خدا ہر انسان کے ہر وقت رابطے میں ہے۔ وہ اس کی بات دھیان سے سنتا ہے اور اکثر قوانین فطرت سے اس کی مدد کرتا ہے۔ بعض اوقات قوانین فطرت کو بالائے طاق بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ زندگی اپنی مخصوص مدہم اور غیر محسوس لے میں پیغام قبولیت لاتی ہے۔ اس وقت تک انسان بے دھیان ہو چکا ہوتا ہے۔

خالق کے بھیجے گئے پیغام کی حقیقت سمجھنے والے ہر دور اور ہر خطے میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ ہر متلاشی کے لئے مینارۂ نور ہیں۔ زندگی کے جس رنگ کو اختیار کیا جائے اس جہان کے دروازے انسان پر وا کر دیئے جاتے ہیں۔ صراط مستقیم کے متلاشی راستے کو آسانی سے پا لیتے ہیں چاہے ان کا مذہب، رنگ اور نسل جیسی بھی ہو۔ اس رنگ میں رنگے جانے والے کو رنگ لگ جاتے ہیں۔

اس کتاب میں اگر کوئی غلطی ہو تو اسے خاکسار سے منسوب کیا جائے اور اگر کوئی اچھی بات نظر آئے تو صغیر احمد اسلم اور اوپر دیئے گئے محترم حضرات کا کارنامہ سمجھا جائے۔ دعا ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے پیش نظر لکھی جا رہی ہے، وہ پورا ہو اور لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ (آمین)۔

نیشنل بُک فاؤنڈیشن نے کمالِ مہربانی سے کتاب چھاپنے کی حامی بھری ہے۔ اُن کے ماہرین نے ادبی مصلحت کی بنا پر کتاب میں کافی تبدیلیاں کی ہیں۔ تاہم صغیر احمد اسلم صاحب کی شخصیت سے جڑی ہر اہم چیز کا بیان، ان کے کردار کی درست منظر کشی کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا اس کتاب کی ایک اشاعت نجی طور پر بھی کرائی جا رہی ہے۔ اور اس سے حاصل شدہ آمدنی یتیم بچیوں اور بچّوں کی دیکھ بھال پر خرچ کی جائے گی۔

یہ کتاب تو ایک پیغام ہے، جتنے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے اتنا اچھا ہے۔

ابنِ مہر

دل کی بات

ہمارا جہاز اس وقت بحر او قیانوس کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تا حد نگاہ خلا کی وسعتیں تھیں۔ یہ دیز ڈیز ایمرٹس (These days Emirates) کی فلائٹ تھی اور کیلی فورنیا سے دبئی پہنچ رہی تھی۔ جہاں سے میں نے پاکستان کے لئے فلائٹ لینی تھی۔ میں نے اپنی گود میں رکھے کاغذات دیکھے۔ میرا ہر سفر ہی کام کرتے گزرتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر جہاز کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ وہی خلا، وہی اس کی وسعتیں..... میں نے اس خلا کو غور سے دیکھا اور سوچا ہم میں سے کتنے ہی لوگ اس خلا کو اپنی زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔

مطمئن اور خوش حال زندگی ہر کسی کا حق ہے۔ بغور مشاہدہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انسان کی تمام کوشش اسی نکتے کے گرد گھومتی ہے کہ وہ اپنی زندگی بھرپور خوشی سے گزار سکے۔ خوشی اور مسرّت سے بھری زندگی۔ لیکن سوال یہ ہے اس خوشی تک رسائی کس طرح ہو؟ بقول شاعر:

شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، کرنیں، پھول
اس دامن میں کیا کیا کچھ ہے، ہاتھ وہ دامن آئے تو

دنیا ناخوش لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ لوگوں سے پوچھا جائے کہ کیا آپ خوش ہیں؟ تو اکثریت کا جواب ہو گا۔ شاید..... نہیں..... اور یہ غیر معمولی نہیں۔ زیادہ تر لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ وہ خوش نہیں ہو سکتا ہے وجہ انھیں معلوم نہ ہو، ہو سکتا ہے انھوں نے اس بارے غور نہ کیا ہو، ناخوشی کی ایک بڑی وجہ زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس کرنا ہے۔ وہ

چیز شاید دولت، خوبصورتی، کوئی شخص یا کامیابی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے دل کی حالت پہ غور کیا اور سوچا کیا میں مطمئن اور خوش ہوں۔ میرے اندر سے اس سوال کا لفظی جواب بر آمد ہونے کے بجائے میری پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اطمینان اور خوشی کی کیفیت ہر وقت اپنے اندر محسوس کی ہے۔ میرے اندر سے ایک اور سوال بر آمد ہوا۔ کیا اس کی وجہ مال و دولت ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے میری وہ حالت گھوم گئی جب میں مفلس اور قلّاش تھا پھر بھی خوش تھا۔ مجھے اپنی وہ پہلی گاڑی یاد آئی جو 1947 کا ماڈل تھا اور جسے امریکہ میں مردہ (Dead) تصور کیا جاتا ہے۔ وہ پرانی شیورلٹ گاڑی میرے لئے والو (Volve) اور مرسیڈیز (Mercedez) سے بڑھ کر تھی۔

خوش لباس ائر ہوسٹس نے آکر پوچھا کیا مجھے کچھ ڈرنک وغیرہ چاہیے؟ میں واپس جہاز کے اندر آ موجود ہوا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں "ڈرنک" نہیں لیتا۔ میں نے اپنی گود میں موجود کاغذات کا جائزہ لیا ابھی بہت کام پڑا تھا کیلیفورنیا (California) سے دبئی اٹھارہ گھنٹے کی فلائٹ تھی اور میرے پاس کافی وقت تھا۔ میں نے قلم نیام میں کیا اور آس پاس نظر ڈالی۔

مختلف چہرے مختلف کہانیاں بیان کر رہے تھے۔ کچھ چہرے خوش تھے، کچھ پریشان، کچھ اداس اور کچھ پہ تناؤ تھا۔ میں نے ان کی کیفیات کا تجزّیہ کیا۔ کیا سب کیفیات عارضی ہیں.....؟ اور کیا ان کیفیات میں تبدیلی بھی آئے گی؟ کیا کوئی کیفیت مستقل بھی ہو سکتی ہے؟

مغرب میں اس وقت لوگ بہت خوشحال ہیں لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن پر دولت، شہرت، خوبصورتی اور کامیابی بارش کی طرح برستی ہے لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں۔ ہالی ووڈ کے ان بیشمار فلمی ستاروں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جو خوشی اور سکون کی تلاش میں نشہ آور ادویات کا شکار ہوئے اور معدوم ہو گئے۔ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والوں کی کمی نہیں مگر دولت خوشی کا متبادل کہاں؟ انسان دولت پانے کی خواہش رکھتا ہے اور اس عمل میں پاگل ہوا جاتا ہے۔ ایک خواہش کی تکمیل پر اگلی خواہش ترتیب دینے کا جنون باقی رہتا ہے۔ ایک سیڑھی سے اگلی سیڑھی تک سفر جاری رہتا ہے..... ایسا سفر جس کی منزل کوئی نہیں..... شاید اس پہ غور نہیں کیا گیا کہ حقیقی خوشی کس چیز کا نام ہے اور یہ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟

دولت، خوبصورتی، شہرت یا کامیابی حقیقی خوشی کی ضامن ہیں اور نہ ہی ان سے ذہنی اور قلبی سکون میّسر آتا ہے۔ آج کی دنیا میں اکثر لوگ مگر انھی کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ پھر کون سی ایسی چیز ہے جو انسان کو حقیقی خوشی اور اطمینان عطا کرتی ہے۔ معذرت چاہتا ہوں میں سماجی نفسیات کا ماہر نہیں کہ لوگوں کا تجزیہ کروں۔ میں اپنا بتا سکتا ہوں کہ میں کیسے خوش رہتا ہوں یا مجھے کیا چیز خوش رکھتی ہے؟ ہو سکتا ہے جز، کل کی حقیقت بیان کر دے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی حالت پہ غور کیا۔ کیا میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں؟ یا ایسا چند لمحوں کے لئے ہوتا ہے۔ یا دیگر کی مانند، یاسیت، امید، دکھ اور خوشی آتے جاتے رہتے ہیں۔ نہ جی نہ..... کچھ ایسا ہوتا ہے جو انسان کے اندر بس جاتا ہے۔ ذرا انسانی چہرے غور سے دیکھیں۔ ایک معروضی نظر کافی ہے۔ ہر چہرہ پوری زندگی کی کہانی سنائے گا۔ کچھ

ایسا اس چہرے پہ ضرور نقش ہو گا جو اس کا تعارف بنتا ہو گا۔ مجھے احساس ہوا میری یہ کیفیت عارضی نہیں مستقل ہوتی ہے۔ کون سی چیز مجھے ہر وقت خوشی کا احساس دلاتی رہتی ہے.....؟

جواب بر آمد ہونے میں زیادہ تاخیر نہ ہوئی۔ محبت اور خدمت.....۔

محبت اور خدمت کو وسیع مفہوم میں لیا جائے۔ اللہ اور اس کے بندوں سے محبت اور خدمت..... کسی کی تکلیف اور مصیبت دور کر کے وہ راحت ملتی ہے کہ انسان بے خود ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جس کی لذّت لافانی ہے۔

زلزلے کی ہیبت سے کانپتے، دل میں اجڑے شہروں کی ویرانی لئے، بے پناہ اموات کے غم میں ڈوبے لوگوں کو سینے سے لگانا ایک نعمت ہے۔ سیلاب، جو گھر کے سازوسامان اور محفوظ خوراک کو بہالے جاتا ہے اور پورے خاندان کو بے گھر کرتا ہے۔ کیا کوئی جانتا ہے ایسے دکھ سے بھرے لوگوں کے لئے تسلی کے دو بول، پانی کی ایک بوتل، دو وقت کا کھانا اور ٹھٹھرتے جسموں کے لئے محض ایک کمبل کتنی وقعت رکھتے ہیں.....؟ ان سے پوچھئے جو اس کا علم رکھتے ہیں۔

میرے لئے ایسے لوگوں تک پہنچنا اور ان کی مدد کرنا ہر خوشی سے افضل ہے۔ اتنی خوشی تو مجھے سٹاک ایکس چینج اور رئیل اسٹیٹ میں کئی گنا زیادہ منافع حاصل کرنے پر بھی کبھی نہیں ہوئی۔

فطرت کو ماں سے تشبیہ اس لئے دی جاتی ہے کہ یہ جانداروں خصوصاً انسان کے لئے بے حد دوستانہ ہے۔ سائنس دان کائنات کو کسی بے حد لاڈلی مخلوق کے لئے خاص طور پر ڈیزائن کردہ قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان خدا کو اتنا ہی پیارا ہے تو یہ

زلزلے، سیلاب، خشک سالی اور دیگر آفات کیوں زمین کا رخ کرتی ہیں؟اس کا جواب سادہ ہے، انسان خود ایسا کرتا ہے۔ خرابی حد سے گزر جاتی ہے۔ ایسے میں ماں کی تھپکی نہیں، اس کا چانٹا کام آتا ہے۔ مرض ایسے مقام پہ جا پہنچتا ہے جہاں آپریشن ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں رحمت درمیان سے ہٹ جاتی ہے جس نے بے پناہ آفات اور مصائب کو روک رکھا ہوتا ہے۔ یہ آفات وجہ (Cause) اور اثر (Affect) کے لازمی نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ اگر یہ وقوع پذیر ہونے کے تناسب سے انسانوں پہ نازل ہوں تو کون چلتا پھرتا نظر آئے.....! مگر فطرت یا پروردگار کی رحمت انھیں آخری لمحے تک اجازت نہیں دیتی تاوقتیکہ زمین پہ ظلم حد سے بڑھ جائے اور مظلوم عاجزی سے اپنے رب کو پکارے۔ خدا اپنے بندوں پہ بے حد مہربان ہے؛ وہ ان پر ظلم نہیں کرتا۔ انسان خود ہی اپنے اور اپنے دیگر ہم نفسوں کے لئے گڑھا کھودتا اور سب کو اس میں دفن کرنے کا بندوبست کرتا ہے۔

خدا ایسا مہربان بادشاہ ہے کہ اپنی رعایا کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ جوں ہی کوئی آفت انسان کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ اس کا مداوا فوری شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ مدد کو پہنچتے ہیں۔ ان کے پاس وہ تمام کچھ ہوتا ہے جس سے کسی آفت زدہ کو سکون مل سکے۔ امداد ایسی ایسی جگہ سے پہنچتی ہے جس کا گمان مشکل ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ایسے مہربان مالک کو ہم چھوڑ بیٹھے ہیں؛ ہم نے غور کرنا چھوڑ دیا۔

کیا ہم نے کبھی اس بات پہ غور کیا ہے کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیوں آئے ہیں؟ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی چاہیے؟ ہمارے آس پاس یہ دنیا کس نے بسائی ہے؟ جب تک سوچنا شروع نہ کیا جائے ان سوالوں کے جواب معلوم نہ

ہو پائیں گے۔ زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کے لئے یہ معلوم ہونا ازحد ضروری ہے کہ اسے کس طرح گزارا جائے؟ جب ہم ایک مرتبہ متذکرہ بالا سوالات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں گے تو اس کا مطلب ہو گا ہم نے اپنے مسائل کے حل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

کسی سمت جانے سے پہلے اس جانب رخ کرنا ضروری ہے۔ زندگی بہتر بنانے کے لئے پہلے اس کے بارے سوچنا پڑے گا۔ اس سے فرد کی سمت تبدیل ہو سکتی ہے اور یہ پوری زندگی تبدیل کرنے کا باعث بنے گا۔ زندگی کو مثبت تبدیلیوں کی آماجگاہ بنانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ تاریکی سے روشنی کا پھوٹنا فطری ہے۔ زندگی کو دنیا میں جنت بنانا عین ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے فرد لاعلم ہو مگر تمام جوابات اندر موجود ہوتے ہیں ایسے سوالات کے جواب جو خود سے کبھی نہیں کئے گئے۔

فضائی میزبان پھر آ موجود ہوئی سامان خورد و نوش مہیا کیا۔ بس تھوڑا سفر باقی تھا۔ اس کے بعد دبئی چند گھنٹے گزارنے تھے اور پھر پاکستان.....ہائے میرا دیس.....؛۔

ابن خراسان! کیا تو جانتا ہے چرند پرند تیری کہانی بیان کرتے ہوئے افسردہ ہیں۔ وہ اپنے خلفاء کے بھٹک جانے پہ ہوشیار ہو گئے۔ انھیں زباں سے کہنے کی اجازت نہیں مگر وہ بیان کرتے ہیں تو سن تو سہی..... آنکھیں بند، زباں خاموش، حرکت ندارد..... کب تک سوئے گا؟ بے خبری میں بہت وقت گزر چکا؛ تو لٹ چکا؛ جان، مال و اولاد، عزت، ایمان تیرا سب کچھ لٹ چکا۔ طرح طرح کے ٹھگ، تیرے ساتھ فریب کر گئے۔ سب کچھ لاقانونیت کے گھپ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ اب جاگنے کا وقت ہے، بے چینی کی نیند سے جاگ جانا بہتر..... تو بھول گیا..... تو کہاں ہے؟ تو مسلمان ہے

اور پاکستان میں ہے۔ تیرا یہ ملک اسلام کی خاطر بنا ہے۔ تیرے بھاگ جاگے ہیں تو یہاں پہ ہے.....تجھے اس مٹی کے تمام حقوق ادا کرنے ہوں گے۔

اسلام کیا ہے؟ دین اسلام کوئی نیا دین نہیں بلکہ نسل آدم کو ان کے پیدا کرنے والے کی جانب سے کی جانے والی ہدایت کی وہ آخری کڑی ہے جو ازل سے بذریعہ وحی پیغمبروں پہ نازل ہوتی رہی۔ اس کا مقصد انسانوں کو اس بھلائی اور اس زندگی کی طرف بلانا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کی ہے؛ جو اپنی لامحدود وسعتوں میں بے پناہ خوشیاں رکھتی ہے؛ جہاں غم نام کا لفظ موجود نہیں اور جو محنت و مشقّت سے عاری ہے۔ اس مسرّت بھری زندگی کو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ زندگی دنیا کے خالق و مالک کی منشاء کے مطابق گزاری جائے۔

خالق کی منشاء کیا ہے؟ یہی بات اسلام اور اس سے قبل آنے والے مختلف مذاہب نے بیان کی۔ دراصل کسی بھی مذہب کا ماننے والا اگر اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو سمجھ کر ان پر عمل کرے تو وہ کم از کم ایک اچھا انسان ضرور بن سکتا ہے۔ ہمیں اس وقت دنیا میں جو مختلف مذاہب نظر آرہے ہیں ان کی بنیاد پہ نظر ڈالی جائے تو ان کا تعلق اسلام سے ہی ثابت ہو گا۔ اسلام ایک انسان سے اچھا انسان بننے کی تلقین کرتا ہے۔ سارا اسلام اسی ایک نقطے پر محیط ہے۔

دین اسلام کی حفاظت کا ذمّہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے اس لیے ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ ہی انشاءاللہ تعالیٰ ہو گی۔ اصل دین قرآن اور حدیث کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ ہم میں سے اکثر لوگ دین کی تشریح اپنے مطلب کے لئے کرتے ہیں تاہم اس سے دین کی حقیقی روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں ان کو اثر

ضرور پڑتا ہے اور پڑے گا جو قرآن و حدیث کی من مانی تشریح کرتے ہیں۔ دین اپنی اصل شکل میں اب بھی برقرار ہے اور ہر انسان اس پہ عمل کرنے میں آزاد ہے۔ اسلام کا کوئی فرقہ نہیں۔ اسلام کو ماننے والے مسلمان ہیں۔

کچھ لاعلم لوگوں کا ماننا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پیروی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ایسے مسلمان جابجا موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ دور حاضر کی ترجیحات و ضروریات اس زمانے سے مختلف ہیں جس میں قرآن پاک نازل ہوا۔ جو لوگ قرآن پاک پر غوروفکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کو بخوبی علم ہے کہ یہ کوئی نئے دلائل نہیں بلکہ صدیوں سے ایسی ہی باتیں ہوتی آئی ہیں اور ان کا مقصد بھی اللہ کے بتائے ہوئے راستے کے بجائے اپنی مرضی کے راستے کا انتخاب کرنے کے لیے بہانے تراشنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ انسان ازل سے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے حیلے بہانے کرتا آیا ہے۔

قرآن، انسانی، سماجی، اخلاقی، مادی اور روحانی ترقی کا سب سے بڑا حامی ہے۔ دیکھنے والوں کو اس میں پوری کائنات نظر آتی ہے۔ شرط یہ ہے اسے خود پڑھا جائے؛ خود سمجھا جائے۔ یہ فرد کے لئے اتری ہے۔ سائنس اور قرآن کا موازنہ ایسے ہی ہے جیسے کسی فائیو سٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول کا بحراوقیانوس سے موازنہ..... یہ ایک صرف مثال ہے ورنہ تناسب یہ بھی نہیں بنتا۔ یہ اور بات ہے کہ پنج ستارہ ہوٹل سے جڑے لوگ اپنے تالاب کی خوب تشہیر کرتے ہیں جب کہ سمندر اپنی بے پناہ عظمت اور ہیبت کے باوجود خاموش رہتا ہے..... اس کا وجود ہی اس کی عظمت کا گواہ ہے۔

عملے کی جانب سے اعلان ہوا کہ ہم کچھ ہی دیر میں دبئی انٹرنیشنل ائرپورٹ پہ اتر

رہے ہیں۔ میں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اپنے ہم سفروں سے خیر مقدمی کلمات کہے اور سفر میں اچھا رفیق بننے پہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ ضروری مراحل سے گزر کے میں لاؤنج میں جا پہنچا۔ یہاں سے میں نے پاکستان کے لئے جہاز لینا تھا۔

اے ابن خراسان- کیا تو واقف ہے کہ تیرا شرف کیا ہے.....؟اور کون کون تیرے اس شرف کے درپے ہے.....؟

تیرے غنیم تیری تاک میں ہیں۔ تیری عزت،مال،اولاد،اخلاق،ایمان سب کچھ لوٹتے جاتے ہیں۔ تو کھلی آنکھوں سے نیند میں ہے۔ اپنے سامنے سب کچھ لٹاتا جاتا ہے۔ تیرے گھر، بازار، گلیاں محلے، مسجد و اسکول کچھ بھی محفوظ نہیں۔ غنیم ہر جہت سے حملہ آور ہے۔ جہاں جان نہیں لیتا،وہاں ایمان ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے۔ تیرے شفاخانے ہوں یا اسکول، تیرے کارخانے ہوں یا کھیت، ہر طرف دھول اڑتی ہے۔ تو اپنا شرف،اپنے بھاگ سنبھال۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ تو اپنا مقام دیکھ اور خوف کھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے..... مگر ٹھہر.....میں کچھ دیکھتا ہوں.....۔

رب کا قانون اٹل اور ابدی ہے اور وہ سب کے لئے برابر ہے۔ جانور ہوں یا انسان، مسلم ہوں یا غیر مسلم، پرندے ہوں یا پودے، سیارے ہوں یا ستارے، سب اس کی زد میں آتے ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے رہے اس کا لازمی نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ چلیں سب کچھ بھول کے واپس چلتے ہیں۔ جیسے رب نے ہمیں دنیا میں بھیجا تھا ویسا ہی بننے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔ یہ اتنا آسان ہے جتنا سانس لینا۔ بس خود سے سرگوشی کرنے کی ضرورت ہے کہ بہت ہو گئی۔ اب باقی عمر ویسے رہیں گے جیسے رب کی مرضی ہے؛ جیسے قرآن حکم دیتا ہے؛ جیسے سرکار ﷺ کی خوشی ہے۔

خدا نے جب فرشتوں کو جناب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس کے پیچھے یقیناً عظیم معرفت ہو گی۔ یہ بات خلاف عقل ہے کہ اتنے بزرگ و برتر خدا نے ایسے کام کا حکم جاری فرمایا ہو جس کی کوئی منطق ہی نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے آدمؑ کو زمین پہ خدا کا خلیفہ تسلیم کرنا ہے۔ یہ خدا کے احکام براہ راست وصول کر کے دنیا تک پہنچائیں گے۔ خدا نے سب کو جتلا دیا کہ آپ نے میرے آدمؑ اور ان جیسے سب کے آگے احتراماً سر جھکانا ہے۔ کیوں کہ خدا کا مادی وجود دنیا میں نہیں اگرچہ وہ ہر جگہ ہے اور ایسا انسانوں کی آزمائش کی خاطر کیا گیا۔ مادی وجود ان پیغمبروں کے تھے جو انسانوں کے درمیان موجود رہے اور جو دنیا کو رب کے بارے بتاتے رہے۔ وہ بتاتے کہ وہ ہے..... ہاں..... خدا کی قسم..... وہ ہے..... اور بالکل اکیلا ہے ..... اس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں۔

ہاں..... مجھے بھی روشنی نظر آئی ہے۔ ہماری تمام غلطیوں، گناہوں، کوتاہیوں اور ظلم و زیادتی کو معاف کیا جا سکتا ہے اگر ہم اس روشنی کو پا لیں۔ ہمارا مالک اس سے بھی زیادہ برداشت رکھتا ہے۔ اس کی رحمت اور محبت سارے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اپنی طرف آئے اپنے بندے کو مایوس نہیں کرتی۔ تب انسان سے بندہ جنم لیتا ہے جو نومولود طفل کی مانند ہوتا ہے۔ ایسا بننا ہے تو رب کی جانب واپس پلٹ..... ساتھ روشنی لیتا چل..... کبھی نامراد نہ ہو گا۔

ہم اپنا سب کچھ لٹا چکے مگر ایک چیز باقی ہے۔ یہ وہی روشنی باقی ہے جو ہمیں کنارے لگا سکتی ہے۔ بس دل کی گہرائی سے اسے اپنانا پڑے گا۔ خود سے ایک دھیمی سرگوشی کی ضرورت ہو گی۔ وہ روشنی ہماری کل متاع ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اسے بھول چکے ہوں۔ پلٹ اس روشنی کی جانب جسے اہل کائنات عشق مصطفی ﷺ کہہ کر یاد کرتے

ہیں۔ جب آنکھ کھلے اور اپنا شرف یاد آئے تو ذہن پہ زور ڈال کے یاد کر لینا کہ کسی نے تیرے بارے کیا خوب کہا تھا

اے ابن خراسان.....ہاں..... یہ سرکار دوعالم ﷺ نے تیرے ہی بارے میں فرمایا تھا۔ ”مجھے اس جانب سے محبت کی ہوا آتی ہے۔“.....شک کو دل سے دور کر.....اٹھ کھڑا ہو.....اپنے رب کی طرف چل.....اس کے سب سے پیارے اور سب سے بہترین انسان کے طریقے کی طرف..... کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ بہت مشکل ہے؟..... خوب سمجھ لو یہ آگاہی درست نہیں..... یہ ایسا ہی آسان ہے جیسا سانس لینا.....پھر بھی اگر تو سمجھتا ہے کہ آج کے دور میں مشکل ہے.....تو سن..... تجھے ایک سچی داستان سناتا ہوں..... جس میں ایک ذرّا آفتاب کے ذرا قریب ہوا..... جس نے ذرّے کو روشن کر دیا.....۔

میں نے اپنا سامان سمیٹا.....جانے کا وقت ہو چکا تھا.....۔

امید ہے اللہ دل کی بات دل تک پہنچا دے گا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں
(اقبالؒ)

صغیر احمد اسلم
کیلی فورنیا
2017

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر، عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم نا گزیر
از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

(اقبالؒ)

ترجمہ: اے میرے رب !تو دونوں جہانوں کا غنی جب کہ میں ایک عاجز فقیر ہوں۔

اے میرے مالک! قیامت کے روز مجھے معاف فرما دینا اور حساب لینے سے درگزر فرمادینا

لیکن اگر میر احساب کتاب لیناتو مقدر فرما چکاتو ایک مہربانی فرمادینا

میر احساب کتاب آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظروں کے سامنے نہ لینا؛ میں ان کی نگاہوں کا سامنانہ کرپاؤں گا۔

باب اوّل

بچپن اور تعلیم

تعارف

میرا نام صغیر احمد اسلم ہے۔ میں 12 مارچ 1936 کو ضلع جالندھر میں پیدا ہوا۔ جالندھر، بھارت (انڈیا) کے صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ میرے قصبے کا نام بڈھن وال تھا۔ میرے ابا جی محترم حاجی سردار محمد اور ماں جی کا نام سائرہ بی بی ہے۔ ہم تین بھائی ہیں۔ میرے دونوں بھائی مرید احمد اور مختار احمد اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں (اللہ تعالی ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے) ۔ میری دو بہنیں ہیں جن میں بڑی ہمشیرہ کا نام نذیراں بی بی اور چھوٹی کا زاہدہ پروین ہے۔

خاندانی پس منظر

میرے ابا جی اور دادا جان محمد عیسیٰ زمیندار اور انتہائی خوشحال خاندان سے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں ہمارا گھر تین منزلہ حویلی پر مشتمل تھا۔ اس کی صندوقچی نما چھت اور شیشم کے دروازوں پہ کندہ کاری کے خوبصورت نمونے دیکھنے میں بہت بھلے لگتے۔ ہمارا شمار اپنے علاقے کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے کنویں کا پانی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے کئی زمیندار مل کر ایک مشترکہ کنواں کھود لیتے جہاں سے وہ باری باری اپنی فصلوں کو پانی لگاتے۔ ہماری ملکیت میں کئی ذاتی کنویں تھے جہاں سے ہماری زمینیں سیراب ہوتیں۔ میرے دادا جان بہت عقل مند اور دیانت دار انسان تھے۔ پورے علاقے میں ان کو

عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کے درمیان جھگڑے کی صورت میں تصفیہ کراتے۔ دونوں فریقین ان کے فیصلے کا احترام کرتے۔ میرے داداجی کی دانش مندی زبان زدعام تھی۔

اباجی اور میری تعلیم

میرے والد صاحب غصے کے انتہائی تیز تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم پڑھائی میں اتنی ہی دلچسپی لیں جتنی لینی چاہیے یا جتنی وہ چاہتے تھے۔ خصوصاً میں اگر تعلیم پر توجہ نہ دیتا تو ان کو بہت برا لگتا۔ وہ ہماری ہر خواہش پوری کرتے اور جواباً ہم سے یہ توقع رکھتے کہ ہم دل لگا کر پڑھیں۔

ایک مرتبہ میں نے سکول سے بلاوجہ چھٹی کرلی۔ میرا ارادہ تھا کہ چھٹی کا دن سیر و تفریح میں گزاروں گا۔ میں اسی خیال میں گھر سے نکلا اور گھومتے پھرتے زمینوں پہ پہنچ گیا جہاں اباجی کام کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دور سے آتے دیکھا تو کام سے اپنا ہاتھ روک لیا اور میرا انتظار کرنے لگے۔ میں فاصلے سے ہی ان کے غصے کی تپش محسوس کر سکتا تھا۔ سکول سے چھٹی کرنے کی ساری خوشی کافور ہو گئی اور میں مرے مرے قدموں سے ان تک پہنچا۔

”تم سکول کیوں نہیں گئے؟“ انھوں نے پوچھا۔

”میں آج سکول نہیں جاؤں گا“ میں نے جواب دیا۔ پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے میں نے اپنی طرف سے تگڑی مگر ایک احمقانہ دلیل پیش کی۔

”مختار بھی تو اکثر چھٹی کرتا ہے اور بڑے بھائی تو سکول جاتے ہی نہیں اس لیے میں نے سوچا کہ آج چھٹی کرلوں۔“

”چلو ابھی سکول جاؤ“ انھوں نے درشت لہجے میں حکم دیا۔ مگر پھر بھی میں نے ضد کی۔

"اب بہت دیر ہو چکی ہے میں سکول نہیں جاؤں گا۔"

ابا جی کے ہاتھ میں ایک چابک تھا جس سے وہ بیلوں کو ہانک رہے تھے۔ انھیں میری بات سن کے اتنا غصہ آیا کہ انھوں نے تین مرتبہ وہ چابک مجھے رسید کیا اور کہا!

"فوراً سکول جاؤ۔"

اچھا ابا جی! جاتا ہوں..... میں نے دوڑ لگا دی۔

"اپنی ماں کی گود میں جا کے نہ بیٹھ جانا۔"

میں نے ان کی یہ بات وہاں سے بھاگتے ہوئے سنی اور سیدھا گھر آیا پھر برق رفتاری سے بستہ اٹھا کے بھاگا اور سکول پہنچ کر ہی دم لیا۔ باقی گھر والوں نے میری اس پھرتی کو تعجب سے دیکھا تھا مگر میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں اس بات پہ غور کرتا۔

وہ سکول سے چھٹی کی میری آخری شعوری کوشش تھی۔ اس کے بعد میں سکول سے بلاوجہ کبھی غیر حاضر نہ ہوا۔ وہ ایسی پٹائی تھی جو مجھے ہمیشہ یاد رہی اور میرے بڑے کام آئی۔ آپ شاید یہ پڑھ کر حیران ہوں کہ اس کے بعد میں نے سکول میں مسلسل حاضری کے کئی انعامات جیتے اور جب تک تعلیم حاصل کرتا رہا کبھی سکول سے چھٹی نہ کی۔ جب میں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو کبھی دفتر سے بھی چھٹی نہ کی۔ اگر اس وقت ابا جی کوئی سخت رد عمل ظاہر نہ کرتے تو میں تعلیم کی اہمیت سے واقف ہو پاتا نہ ہی پڑھ لکھ کر ایک کامیاب انسان بنتا۔

ابا جی اکثر مجھے کہتے "بیٹا! تم بہت بہادر ہو اور تم وہ سارا کچھ کر سکتے ہو جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مجھے امید ہے تم میری لاج رکھو گے۔"

خدا جانتا ہے کہ میری زندگی میں بہت مشکل اور کٹھن لمحات آئے مگر ابا جی کے کہے وہ سادہ الفاظ ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتے اور مشکلات سے نکلنے میں میری مدد کرتے رہے۔

داداجی کی شخصیت

داداجی کو مجھ سے اور مجھے ان کے ساتھ بہت پیار تھا۔ میں ہر وقت ان کے پاس رہنے کی کوشش کرتا۔ ان کے ساتھ بِیتے لمحات یاد کرکے میرا وجود آج بھی جوش، ولولے اور تازگی سے بھر جاتا ہے۔ وہ ان پڑھ ضرور تھے مگر ان کی دانش مندی ضرب المثل تھی۔ ان کی دانائی سے معمور باتوں نے مجھے زندگی کے بہت سے معاملات کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ انھوں نے جو بھی نصیحت کی میں نے اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ داداجی کے کہنے پر میں نے زندگی بھر تمباکو نوشی نہیں کی۔ جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تو میرے دوستوں نے بارہا مجھے سگریٹ پینے کی دعوت دی لیکن میں ہمیشہ سگریٹ سے پرہیز ہی کرتا رہا۔

ایک مرتبہ میرے داداجی نے مجھے کہا: ”جب تم سکول جاؤ گے تو تم سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوں گی میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو مجھے آکر ضرور بتانا تاکہ اس کا تدارک کیا جاسکے۔ کبھی جھوٹ مت بولنا۔ جو بات جیسی ہو ویسی ہی بتانا۔“

مالٹوں کی چوری

ایک مرتبہ ہم سب دوست سکول سے واپس آ رہے تھے تو ہم نے ایک قریبی باغ سے مالٹے توڑنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت باغ میں کوئی رکھوالا موجود نہ تھا سو ہم نے اس میں گھس کر خوب اودھم مچایا۔ جتنے مالٹے ہم نے کھائے اس سے کہیں زیادہ ضائع کر دیئے۔ ہم اس شغل میں کافی دیر مصروف رہے اور اس کے بعد گھروں کو لوٹے۔

گھر پہنچ کے میں نے اپنے داداجی کو ساری بات بتا دی۔ انھوں نے پہلے تو سچ

بولنے پر مجھے شاباش کے علاوہ انعام دیا اور پھر بولے ”کیا تم جانتے ہو وہ باغ کس کا ہے؟“

میں نے کہا: ”جی اچھی طرح جانتا ہوں وہ باغ غلام نبی کا ہے جو ہمارے علاقے کا بڑا زمیندار اور امیر آدمی ہے۔“

وہ کہنے لگے

”ہاں وہ امیر آدمی ہے مگر تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آج کل اس نے یہ باغ ایک شخص کو ٹھیکے پہ دے رکھا ہے جس کا نام راشد خان ہے اور وہ ایک غریب آدمی ہے۔ وہ اتنا غریب ہے کہ اس کے بچوں کے پاس پہننے کو اچھے کپڑے اور جوتے تک نہیں۔ اب ہو سکتا ہے کہ ان کو دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہ ہو کیوں کہ آپ لوگوں نے اس کا باغ اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔ میں پریشان ہوں کہ اب اس کے بچوں کا کیا بنے گا؟“

دادا جی کے لہجے میں کچھ ایسا تاسّف تھا جس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ وہ ایک درد مند انسان تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے ”بیٹا! تم ایسا کرو کہ راشد خان کے پاس جا کے معافی مانگو اور اتنے ہی مالٹے اپنے باغ سے توڑ کے ساتھ لے جاؤ جتنے آپ لوگوں نے اس کے توڑے ہیں تا کہ اس کا نقصان کسی حد تک پورا ہو جائے۔“

میں نے ہراساں ہو کے کہا ”میں نہیں جاؤں گا وہ میری پٹائی کرے گا۔“

دادا جی نرمی سے بولے ”میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ میں تمہارے ساتھ ایک اور لڑکا بھی بھیجتا ہوں۔ تم جاؤ تو سہی۔“

دادا جی کے اصرار اور اپنے ضمیر کی خلش مٹانے کی خاطر میں تیار ہو گیا۔ میں نے ایک لڑکے کو ہمراہ لیا۔ اپنے باغ سے جا کے مالٹے توڑے اور راشد خان کے گھر چلا گیا۔ میں نے اسے جا کے مالٹے پیش کیے اور ساری صورت حال بتا کر معافی مانگی۔ جب اسے ساری بات کا پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا

”یہ سب آپ کے اچھے خاندان اور درست تعلیم و تربیت کا اثر ہے۔ اسی لیے

ہم آپ کے دادا جی کو اپنا رہنما(Advisor Leader) مانتے ہیں۔"

اسے خوش دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ یہ واقعہ آئندہ زندگی میں میرے بڑے کام آیا اور میں نتائج کے اعتبار سے اسے اپنے ذہن سے محو نہ کر سکا۔ اس وقت اگر میرے دادا جی چاہتے تو میری جگہ اپنے کسی ملازم کو بھیج سکتے تھے مگر انھوں نے خاص طور پر مجھے بھیجا تا کہ مجھے دوسروں کے زیاں کا احساس اور سبق حاصل ہو۔

ماں جی

ماں جی نہایت ہی پرہیز گار اور رقیق القلب خاتون تھیں۔ اپنے عزیز و اقارب میں اپنی ملنساری اور نرم مزاجی کی وجہ سے بے حد مقبول تھیں۔ وہ ایک صابر اور شفیق خاتون تھیں۔ میری تعلیم و تربیت میں ان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا۔ وہ موقع پر ہی میری غلطی درست کرنے کی کوشش کرتیں۔ میرے کردار کی تعمیر میں ان کی گہری دلچسپی نے نہایت فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اکثر مجھے نصیحت کرتیں "بیٹا ! بڑوں کا احترام کرو۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔ غصے سے پرہیز کرو۔ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔"

ہمارے علاوہ میرے تایا کا خاندان بھی ہمارے ساتھ حویلی میں مقیم تھا۔ میری تائی جان مزاج کی تھوڑی سخت تھیں لیکن محلے والوں نے کبھی ہمارے گھر سے لڑائی جھگڑے کی آواز سنی نہ اس کی نوبت آئی۔ ماں جی کے ہوتے ہوئے ہمارے دروازے سے کوئی فقیر کبھی خالی ہاتھ واپس نہ گیا۔ گاؤں کے سب لوگ ماں جی کے اخلاق، محبت، سادگی، اور نیک سلوک کے معترف تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ سے بے پناہ محبت رکھتی تھیں۔ عبادات اور نوافل کا کثرت سے اہتمام کرتی تھیں۔

ماں جی کا انتقال کمالیہ (پاکستان) میں ہوا۔ ان کے جنازے میں خلق خدا امڈ آئی۔ لوگ ایسے روتے تھے جیسے ان کا اپنا بزرگ وفات پا گیا ہو۔ آنے والے وقتوں میں وہ

جنازہ ایک مثال بن گیا۔ علاقے کے لوگ آج تک ان کے جنازہ کو یاد کرتے ہیں۔ دعا ہے اللہ پاک انھیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔(آمین ثم آمین)

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

سکول میں داخلہ

ہمارے گاؤں بڈھن وال میں کوئی سکول نہ تھا اس لئے تعلیم حاصل کرنے کے لئے مجھے قریبی گاؤں "ننگل انبیا" کا رخ کرنا پڑا۔ ننگل انبیا میں وہ مشہور سکول واقع ہے جہاں سے پاکستان کے سابق وزیراعظم چوہدری محمد علی نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس سکول کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا۔ میں نے وہاں پہلی جماعت سے لیکر چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مجھے عارضی طور پر اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیوں کہ اسی دوران پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا۔ یہ اعلان ہوتے ہی ہر طرف بڑے پیمانے پر ہنگامے شروع ہو گئے۔ اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان فسادات کوئی انوکھی بات نہ تھی لیکن ان کی نوعیت حالیہ فسادات کے سامنے معمولی تھی۔ مسلمان لمبے عرصے سے اپنا وطن پانے کی جدوجہد کر رہے تھے جب انھیں گوہر مقصود ہاتھ آیا تو انھوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر پاکستان ہجرت کرنا شروع کر دی۔

پاکستان ہجرت

پاکستان کے قیام کو اگر ایک معجزہ قرار دیا جائے تو ہجرت کو میں اس وقت کی سب سے بڑی آزمائش قرار دوں گا۔ یہ ہجرت اپنی نوعیت کے لحاظ سے تاریخ کی سب

سے بڑی ہجرت ہے۔
پاکستان قدرت کے رازوں میں سے ایک بہت بڑا راز ہے۔ آپ دنیا کی تاریخ اٹھا کے دیکھ لیں آپ کو اس کی مثال مدینہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ دنیا میں توحید کا احیاء مکہ شہر سے ہوا اور چہار سو پھیلا۔ مدینہ میں ایسی ریاست قائم ہوئی جس نے بالآخر روئے زمین کو عدل و انصاف اور امن و سکون سے بھر دیا۔ مکہ سے مدینہ بمشکل چار، ساڑھے چار سو کلومیٹر دور ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ سفر تئیس (23) سال میں طے ہوا۔ یہ تو مکہ اور مدینہ والے صاحب ﷺ جی ہی تھے جنھوں نے اتنی جلدی اپنا کام کر لیا۔ اب پاکستان کو عطائے مدینہ بنتے کتنی دیر لگتی ہے۔ اڑسٹھ (68) سال ہو چکنے کے بعد بھی لگتا ہے مدینہ کی میم تک نہیں پہنچے۔ اللہ پاک مدینہ منورہ کی نورانیت کے صدقے پاکستان کو وہ سب کچھ عطا فرمائے جس سے اس کی شان بڑھتی ہو۔ (آمین)

جوں ہی پاکستان بننے کا اعلان ہوا، پورے ہندوستان میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ اس دوران انسان نے انسان سے درندوں جیسا سلوک کیا۔ انگریز سرکار کی سرپرستی میں ہندوؤں اور سکھوں نے چن چن کر مسلمانوں کو ختم کرنا شروع کیا۔ ہر طرف آگ تھی، خون تھا اور چیخ و پکار..... کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس نے لاشے گرتے، بچوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ اور بستیوں کو ویران ہوتے نہ دیکھا ہو۔ ایسی باعصمت خواتین کو جنھیں کسی نامحرم آنکھ نے بھی نہ دیکھا تھا سرِعام درندگی کا نشانہ بنایا گیا۔ درحقیقت الفاظ ان مظالم کی منظر کشی سے معذور ہیں جو مہاجرین پر بِیتے، جو ہم پر بیتے۔

بے شمار قافلوں میں سے ایک قافلہ حاجی محمد عیسیٰ کا بھی تھا جو پاکستان ڈھونڈنے نکلا۔ قافلے میں شامل افراد میں کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ پاکستان کہاں واقع ہے اور کدھر جانا ہے؟ یہ قافلہ جو کئی خاندانوں پہ مشتمل تھا اپنا سب مال اسباب، گھر بار اور ڈھور ڈنگر چھوڑ چھاڑ دیوانہ وار نکل کھڑا ہوا۔ ان سب کے سر پر پاکستان پہنچنے کی دھن سوار تھی۔

ماں جی نے ہجرت سے پہلے اپنے تمام زیورات مویشیوں کے باڑے میں دفن کر دیئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بعد میں کسی مناسب موقع پر آ کر وہ نکال لیں گی۔ سب نے ہی پر نم آنکھوں سے اپنے گھروں کو چھوڑا۔ راستے کی مشکلات کا سب کو اندازہ تھا اس کے باوجود سب لوگ پاکستان جانے کے لیے پر عزم تھے اور ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرنے کے لئے ذہنی طور پہ بالکل تیار.....۔

ہم مسلسل چلتے رہے کہیں پہ رکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہندو اور سکھ بلوائیوں سے مڈ بھیڑ کا خطرہ سر پہ منڈلا رہا تھا۔ ہم نے جلد از جلد فاصلہ طے کرنے کی کوشش کی۔ جو خوراک ہمراہ لے کر چلے تھے وہ راستے میں ختم ہو گئی۔ ہم لوگوں نے رکنے کے بجائے سفر جاری رکھا اور بھوکے پیاسے ہی چلتے رہے مگر کب تک، آخر کار ہمارے قدموں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ہمیں رکنا پڑا۔ سب سوچنے لگے کہ جسم و جاں کا رشتہ بر قرار رکھنے کے لیے کیا کیا جائے۔ بوڑھوں اور بچوں کے لیے یہ صورتحال خاص طور پہ خطرناک تھی ان کے لئے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس وقت ہم نے آپس میں صلاح مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے۔

میرے والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ قریبی گاؤں سے خوراک حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ یہ ایک خطرناک مہم جوئی تھی تاہم یہ خطرہ ہمیں مول لینا ہی تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ بھوک ہمیں ختم کرنے کے درپے تھی۔ ہندو اور سکھوں کے مسلح جتھے بو سونگھتے پھرتے تھے۔ زندگی اچانک ہی غیر محفوظ اور بے یقینی کے عالم سے دوچار ہو گئی تھی۔

ہمیں علم نہ تھا کہ جس گاؤں سے ہم لوگ خوراک حاصل کرنے جا رہے ہیں وہ سکھوں کا ہے ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا اور وہاں پہ کس قسم کے خطرات ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اگرچہ میں کم عمر تھا لیکن یہ برداشت نہ کر سکا کہ میرے والد صاحب اکیلے ہی اپنی

جان خطرے میں ڈالیں اس لیے ہزار منع کرنے کے باوجود میں ان کے ہمراہ ہو لیا۔

جان لیوا حملہ

ہم دونوں باپ بیٹا چھپتے چھپاتے قریبی گاؤں جا پہنچے۔ ہم اگرچہ غیر مسلح تھے مگر پوری طرح چوکنا اور ہوشیار تھے۔ ہم ایک دکان پہ پہنچے اور کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا۔ ابھی ہم نے اپنی خریداری ختم کی ہی تھی کہ اچانک ایک طرف سے شور و غلغلہ بلند ہوا۔ میں نے اباجی کا رنگ فق پڑتے دیکھا۔ انھوں نے فکر مندی سے میری جانب دیکھا۔ اسی اثنا میں سکھوں کی ایک ٹولی منظر پہ نمودار ہوئی۔ وہ تلواروں اور برچھیوں سے مسلح تھے اور بے ہنگم انداز میں آوازیں بلند کر رہے تھے۔ شاید انھیں گاؤں میں ہمارے داخلے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار ہم پہ حملہ آور ہونے کو لپکے۔

اباجی نے چِلّا کر کہا ”بھاگو! بیٹا بھاگو۔“

اور ہم اپنی جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگے۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے دوڑے۔ لیکن ہماری اور ان کی رفتار میں واضح فرق تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی وہ ہماری جان لینے کے لیے بھاگ رہے تھے اور ہم اپنی جان بچانے کے لیے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم اتنا تیز بھاگے جتنا بھاگ سکتے تھے اور ان کی پہنچ سے دور نکل گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہماری جان بچ گئی اور ہم صحیح سلامت اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ گئے۔

بے شمار تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ہم نکودر میں واقع ایک پناہ گزین کیمپ میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کے ہم نے سکون کا سانس لیا۔ خیال تھا کہ اب ہماری مصیبتیں کم ہوں جائیں گی۔ کیوں کہ ایک لحاظ سے یہاں ہماری جان محفوظ تھی لیکن ابھی سکون کا وقت نہ آیا تھا اور یہاں مزید امتحان ہمارے منتظر تھے۔

پناہ گزین کیمپ

اس عارضی کیمپ میں پاکستان جانے کے خواہشمند مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد جمع تھی لیکن سہولیات تو کجا ضروریات تک مہیا نہ تھیں۔ اس کیمپ میں کھانے پینے اور رہنے کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہاں موجود سب مہاجرین ہی مصیبت کے عالم میں تھے۔ یہ ایک اجتماعی مصیبت تھی جس کا سامنا ہم سب لوگ کر رہے تھے۔ کھانے پینے کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات ہمیں درختوں کے پتے ابال کے کھانے پڑتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم نے زمین پہ اگنے والی بوٹی جسے پھکڑا کہتے ہیں، کو بھی بطور غذا استعمال کیا تھا۔ ہم اس بوٹی کو پانی میں ابال کے وہ پانی پی لیتے یوں جسم کچھ توانائی حاصل کر لیتا۔ اگر کبھی نہانا پڑ جاتا تو ایک لوٹا پانی نہانے کے لیے فراہم کیا جاتا جس سے ہم بڑی احتیاط سے اپنے جسم کو گیلا کرتے یہی غسل کہلاتا۔

سب مہاجرین کی کہانی بھی تقریباً یکساں تھی۔ سب ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کا شکار ہوئے تھے۔ انھیں اپنے گھر بار چھوڑنے کا غم تھا۔ جہاں ان کے آباؤ اجداد رہتے تھے۔ گزرے شب و روز کی تلخ و شیریں یادیں دل کو کچوکے لگاتیں۔ ظاہر ہے سب کچھ ایک لمحے میں تو بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ حالات کی تلخی بھولنے میں وقت لگتا ہے اور وہ "وقت" ابھی نہیں آیا تھا۔ لمحۂ موجود تو ظلم وجور کے مقابلے میں صبر وبرداشت کی تاریخ رقم کرنے پہ مصر تھا۔ دکھ اور درد چہرے کے نقوش کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتے تھے۔

یہاں میں آپ کو ایک چونکا دینے والا واقعہ سنانا چاہتا ہوں کیونکہ اس غیر معمولی واقعے کو نقل نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اس واقعے سے آپ کو یہ اندازہ بخوبی ہو سکے گا کہ زندگی اپنے دامن میں کتنی جہات سمیٹے رکھتی ہے۔

نانک کی دیانتداری

ہمارا قافلہ جب پاکستان کی جانب روانہ ہوا تو قافلے میں شامل لوگوں نے جگہ جگہ قتل وغارت اور تباہی کے مناظر دیکھے۔ ماں جی کو بہت جلد صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہو گیا۔ وہ لوک حکمت رکھتی تھیں۔ انھیں پتہ چل گیا کہ اب وہ وقت کبھی نہیں آئے گا جب وہ اپنے گھر واپس لوٹ کر زیورات نکال سکیں۔

ہمارے گھر میں ایک ہندو گوالا دودھ لینے آیا کرتا تھا جس کا نام نانک تھا۔ اس کے باپ دادا بھی ہمارے گھر دودھ لینے آیا کرتے تھے یوں ان سے ہمارے تعلقات بہت پرانے تھے۔ ایک دن نانک اپنی شناخت چھپائے ہم لوگوں کو تلاش کرنے نکلا۔ پتہ نہیں کتنی ہی دیر تک وہ ہمیں ڈھونڈتا پھرا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ وہ اپنے ہمراہ کھانا بھی لایا تھا اور بہت لمبا سفر طے کر کے ہم تک پہنچا تھا۔ اسے اس طرح ہمارے دربدر ہونے کا بہت افسوس تھا۔

جب اس کے واپس جانے کا وقت ہوا تو اس وقت ماں جی نے ایک خطرہ مول لیا انھوں نے رازداری سے نانک کو اپنے اعتماد میں لیا۔ اپنے گھر میں اس جگہ کی نشان دہی کی جہاں پہ انھوں نے زیورات دبائے تھے اور نانک سے درخواست کی کہ کسی طریقے سے وہ زیورات ہم تک پہنچا دے۔ نانک یہ سن کر چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے زیورات لادینے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گیا۔ جب اس بات کا رشتہ داروں اور دیگر احباب کو پتہ چلا کہ ماں نے نانک کو زیورات لانے کی ذمہ داری سونپی ہے تو سب نے کہا کہ اب زیورات کو بھول جاؤ پہلے تو کسی قدر امید تھی کہ اگر کبھی واپس لوٹے تو شاید زیورات مل جائیں لیکن اب تو آپ نے زیورات اپنے ہاتھ سے دشمنوں کے حوالے کر دیئے ہیں۔ غرضیکہ سب احباب نے ایسی ہی مایوس کن باتیں کیں۔ ماں نے سب سنا اور سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ نہ جانے کیا سوچتی تھیں؟

چند دن بعد جب سورج اپنے معمول کے مطابق مشرق سے طلوع ہوا تو وہ بے پناہ حیرتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ دن اپنے ہمراہ اس بات کا ثبوت لایا تھا کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ اور ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ نانک زیورات لیے آ پہنچا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں نیکی ڈال دی تھی۔ اس نے دوسرے ہندوؤں کے بر عکس جو مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے، انسانیت کی لاج رکھ لی اور سارے زیورات لا کر ایمانداری سے ماں جی کے حوالے کر دیئے۔

ماں جی نے نانک کو انعام کے طور پر کچھ زیورات دینے چاہے مگر نانک نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ شرمندہ نہ کریں میں نے یہ کام کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا۔ آپ لوگوں کے ہم پہ بہت زیادہ احسانات ہیں اور میں احسان فراموش نہیں۔ میں نے تو محض اپنا فرض ادا کیا ہے۔ وہاں موجود سب لوگ یہ معاملہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس واقعے نے میرے دل و دماغ پہ انمٹ نقوش چھوڑے۔

کیمپ اور مصائب

کیمپ کے اندر ہماری مشکلات میں مزید اضافہ ایسے ہوا کہ ایک مرتبہ شدید طوفانی بارش ہوئی۔ ہوا اور بارش اتنی تیز تھی کہ ہمارے کیمپ اکھڑ گئے۔ کپڑوں اور بستروں سمیت سارا سامان گیلا ہو گیا۔ جو تھوڑی بہت خوراک ہمارے پاس موجود تھی، ضائع ہو گئی۔ بارش اتنی دیر تک برسی کہ ہمارا کیمپ دریا کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہ رات ہم سب لوگوں کو درختوں پہ گزارنی پڑی۔ زمین پہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

آنے والے دن مزید مشکل اور بھیانک ثابت ہوئے۔ کیمپ میں پانی کھڑا ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں۔ بچے اور بوڑھے خاص طور پر بیماریوں کا نشانہ بنے۔ کیمپ میں علاج معالجہ کی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ناکافی ادویات سے ان کا علاج کرنے کی کوشش کی گئی مگر بے سود..... متعدد افراد جن میں زیادہ

تعداد بچوں اور بوڑھوں کی تھی، اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کئی افراد شدید علیل ہو گئے اور چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ مہاجرین کو اپنے علاوہ ان مریضوں کو سنبھالنے کی وجہ سے زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

میں اپنے آس پاس دیکھتا اور حیرت سے سوچتا کیا چند ہفتے پہلے تک ان حالات کا تصوّر بھی کیا جا سکتا تھا جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں امن و سکون سے تھے۔ حالات کم از کم اتنے تو خراب نہ تھے۔ اب تو جو بھی چہرے نظر آتے وہ غم و یاس میں ڈوبے اور کھوئے کھوئے نظر آتے تھے۔ گہری سوچوں میں گم کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میرے پیارے دادا جان بھی ایسی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے اور شدید بیمار ہو گئے۔ باقی لوگوں کی طرح ہم نے کیمپ میں موجود ناکافی ادویات سے علاج کرنے کی کوشش کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہمیں اس کیمپ میں کئی ماہ تک رہنا پڑا۔ یہ عرصہ بہت طویل محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم صدیوں سے اس کیمپ میں پناہ گزین ہیں۔ دن گزرنے کا نام ہی نہ لیتے اور راتیں اس سے زیادہ طویل محسوس ہوتی تھیں۔ اتنے مشکل حالات ہم نے کیسے گزارے؟ اور اتنی تکالیف ہم نے کیسے برداشت کیں؟ یہ میں بتا نہیں سکتا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی خصوصی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو ہم سب نہ جانے کب کے ختم ہو گئے ہوتے۔

سرزمین پاکستان

خدا خدا کر کے آخر وہ دن آیا جب ہمیں پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ روح کو سرشار کر دینے والا لمحہ تھا جب ہم پاکستان کی سرزمین مقدس پہنچے۔ کئی طرح کی مصیبتیں برداشت کرنے اور تکالیف سہنے کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچے

تھے اگرچہ اسے پانے میں ہم بہت کچھ کھو چکے تھے۔

جب ہمارا قافلہ گوجرہ کے قریب ایک گاؤں ''سیتلاں'' میں اترا تو شام ہو چکی تھی اور پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر ایک نگاہ قافلے پر ڈالی تو دکھ کی ایک تیز لہر میرے دل میں دور تک اتر گئی۔ ہندوستان سے چلنے والا وہ بڑا قافلہ کہیں گم تھا جو پاکستان کی تلاش میں نکلا تھا۔ یہ تو تھکے ہارے چند سوگوار افراد تھے جو ڈھلتی شام میں سایوں کی مانند نظر آتے تھے اور اپنے کئی پیاروں کو راستے میں ہی چھوڑ آئے تھے..... منوں مٹی تلے..... ابدی نیند سوتے۔

مشکل دور کا آغاز

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ہم نے گوجرہ کے قریب ایک گاؤں ''سیتلاں'' میں رہائش اختیار کی۔ میرے دادا جی بیماری سے صحت یاب نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ وفات کے وقت ان کے چہرے پر یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ پاکستان کی سرزمین پہ اپنی جان دے رہے ہیں۔

پاکستان پہنچنے کے بعد ہم خالی ہاتھ اور تہی دامن تھے۔ اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ خوشحالی کے دن خواب ہوئے اور ضروریات زندگی آسیب کی مانند بال کھولے ہمارے سر پہ کھڑی تھیں۔ اب ہمیں نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کرنا تھی۔ یہ ایک نئے مگر مشکل دور کا آغاز تھا اور اس مرحلے سے نمٹنے کے لیے ہم سب کو سخت محنت کرنا پڑی۔

''سیتلاں'' نامی اس گاؤں میں کوئی سکول نہ تھا۔ مجھے پڑھنے کا بے حد شوق تھا اس لیے میں نے علاقے کے واحد گورنمنٹ سکول میں داخلہ لے لیا جو گوجرہ شہر میں تھا۔ یہ سکول ہمارے گاؤں سے تقریباً سات میل دور تھا۔ میرے ساتھ بھائی مختار نے بھی اسی سکول میں داخلہ لیا۔ ہم دونوں بھائی بائیسکل پہ آیا جایا کرتے۔ سات میل اچھا خاصا

فاصلہ تھا۔ میں بائیسکل چلاتے چلاتے تھکن سے چور ہو جاتا۔ سخت گرمی اور سردی کے موسم میں سکول جانا ایک عذاب نظر آتا تھا۔ راستے میں تقریباً ڈیڑھ سے دو میل کا علاقہ ریتلا تھا اور اس میں بائیسکل نہیں چل سکتی تھی اس لیے مجھے بائیسکل کندھے پہ اٹھانا پڑتی تھی۔ سخت سردی میں زمین پہ ہر طرف کہرا (Frost) جما ہوتا جبکہ گرمی کے موسم میں ریت تپ کر آگ کی طرح گرم ہو جاتی تھی۔ میرے پاؤں میں پھٹے پرانے جوتے ہوتے جس کی وجہ سے پاؤں جلنے لگتے۔ مجھے لگتا شاید میں کوئی مجرم ہوں جو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے انگاروں پہ چل رہا ہے۔ میں اس وقت سخت مشکل میں تھا لیکن تعلیم تو حاصل کرنا تھی اس لئے یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا۔

والدین کا ہاتھ بٹانا

سکول سے واپسی پہ میں ابا جی کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا جو زمین ہم نے کاشتکاری کے لیے لے رکھی تھی اس کا زیر زمین پانی کھارا اور پینے کے قابل نہ تھا۔ کھیتوں میں کام ختم کر کے میں جانوروں کے لیے چارے کا انتظام کرتا۔ چارہ کاٹتا اور سر پہ لاد کے لاتا پھر مشین میں ڈال کے اس چارے کو چھوٹا چھوٹا کرتا۔ یہ ہاتھ سے چلنے والی مشین تھی۔ اس کو چلانے میں بازو اور کندھوں کی ساری طاقت استعمال کرنی پڑتی۔ یہ کام محنت طلب اور مشکل تھا۔ خاص طور پہ مکئی کے خشک پودے کو مشین میں ڈال کے چھوٹا چھوٹا کترنا بہت مشقت طلب تھا۔ اس میں ایک نقصان یہ تھا کہ اس میں سے چھوٹے ذرات اور دھول مٹی باہر آتی جو سانس کے ذریعے اندر منتقل ہوتی رہتی۔ یہی ذرات آگے چل کے میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئے۔

کاشت کاری کا قدیم طریقہ

اس زمانے میں کھیتی باڑی کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے قدیم روایتی

طریقوں پر ہی انحصار کیا جاتا۔ جدید مشینری کے استعمال کا کوئی تصور نہ تھا۔ زمین سے فصل حاصل کرنے کے لیے کسان اور بیل کو بہت محنت کرنا پڑتی۔ کھیتی باڑی میں بیلوں کا استعمال عام تھا۔ ہل چلانے، پانی لگانے اور کنویں سے پانی کھینچنے میں ان سے کام لیا جاتا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام تھے جو یہ انسان کے فائدے کے لئے پیدا کی جانے والی مخلوق سر انجام دیتی۔

جب گندم کی فصل کاٹنے کا زمانہ آتا تو میں اور ابا جی صبح کی نماز ادا کر کے کھیتوں میں نکل جاتے صبح سویرے کام کرنا تھوڑا آسان تھا کیونکہ اس وقت دھوپ میں اتنی شدّت نہ ہوتی۔ جب دن تھوڑا سا چڑھتا اور دھوپ تیز ہو جاتی تو ہمارے جسموں سے پسینہ پانی کی طرح بہنا شروع ہو جاتا۔ ہم درانتی کی مدد سے فصل کاٹتے اور پھر اسے گٹھوں کی صورت میں باندھتے۔ اس کے بعد بیل گاڑی کے ذریعے گندم کے ان گٹھوں کو ایک سخت اور ہموار قطعہ زمین تک پہنچاتے۔ یہاں پہ گندم کو فصل سے علیحدہ کرنے کا مرحلہ آتا اس میں بھی بیل ہی استعمال کیے جاتے۔ یہ طریقہ کار مشکل اور پیچیدہ تھا۔ مثل مشہور ہے کہ "جب بیلوں کو گندم گاہنے کی اپنی محنت اور مشقت یاد آتی ہے تو وہ جگالی کرنا بھول جاتے ہیں۔"

اس طریقہ کار میں فصل کو زمین پہ بچھا کے اس کے اوپر بیلوں کو دائرے کی صورت میں چلایا جاتا۔ ان کے پیچھے لکڑی کا ایک بھاری تختہ، جسے مقامی زبان میں "پھلا" کہتے ہیں، بندھا ہوتا۔ بیلوں کی آنکھوں پہ پٹی باندھی جاتی تا کہ وہ اس بات کو پا نہ سکیں کہ وہ ایک دائرے کی صورت میں گھوم رہے ہیں۔ یوں بیل اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھے مست انداز میں گھومے جاتا۔ میلوں چلنے کے باوجود وہ ہمیشہ ایک ہی جگہ پہ رہتا اور سمجھتا بہت دور نکل آیا ہے..... ہم انسانوں کی مانند..... مادی طور پر خیرہ کن ترقی کے باوجود ہماری اکثریت فکری طور پر ایک ہی جگہ پر مقیم رہتی ہے۔

جیسے جیسے بیل اس گندم کو اپنے سموں اور خاص کر پیچھے بندھے تختے کے ذریعے باریک کرتے، کسان پیچھے سے اس گندم کو الٹ پلٹ دیتے۔ شروع میں ایسی تنگلی استعمال کی جاتی تھی جس کے دندانے قدرے فراخ ہوتے تھے۔ اس تنگلی کی مدد سے ہم گندم کے پورے پودے کو الٹ پلٹ کرتے رہتے جو بتدریج چھوٹا ہوتا جاتا۔ جب گندم مزید باریک ہو جاتی تو ہم ایک اور تنگلی استعمال کرتے جس کے دندانے تنگ ہوتے تھے تاکہ باریک ہوتی گندم اس میں سما سکے۔ کبھی کبھار بیلوں کو چلانے والا کسان تختے پہ مزید وزن ڈالنے کے لئے اس کے اوپر کھڑا ہو جاتا۔

اب بھی پاکستان کے چاروں صوبوں سمیت شمالی علاقوں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوتی ہاں میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پاکستان کے سینکڑوں پسماندہ دیہاتوں میں 2017ء میں بھی ایسے ہی کھیتی باڑی ہو رہی ہے جیسی 1955ء میں ہوتی تھی۔ کھیتی باڑی میں انسانوں اور جانوروں کی مشترکہ کوشش صدیوں پرانی ہے مگر آج کل پوری دنیا میں زیادہ پیداوار کے حصول کے لئے جدید طریقے رائج ہیں۔ پاکستان میں انفرادی سطح پر کیئے گئے تجربات نے چشم کشا حقائق آشکار کئے۔ میرا ایک مرتبہ سندھ کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں ایک زمیندار نے کاشتکاری کے لئے جدید نظام وضع کر رکھا ہے۔ اپنی زمین پہ کام کرنے والے کسانوں کو ممکنہ حد تک بہترین سہولیات فراہم کر رکھی ہیں۔ انھیں روٹی، کپڑے، چھت اور بچوں کی تعلیم جیسی سہولیات دے رکھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہاں کسان اور ان کے خاندان خوش ہو کے دل سے کام کرتے ہیں۔ دوسرا زمیندار نے بیج اور کھاد کے اوپر خصوصی فوکس کر رکھا ہے۔ اچھے بیج کے علاوہ انھوں نے گوبر کی کھاد کو کھیتوں تک پہنچانے کا نہایت اچھا اور جدید نظام اپنایا ہے۔ ان عوامل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب آپ ان کے کھیتوں میں داخل ہوتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ کھیتوں میں ترتیب اور نفاست نظر آتی ہے۔ اجناس کے علاوہ دیگر

سبزیوں کی پیداوار عام شرح کے مقابلے کئی گنا زیادہ ہے۔ ہر فصل بے حد صحت مند اور توانا نظر آتی ہے۔ ہر جنس کی فصل بے انتہا پھل لاتی ہے۔ اگر انفرادی سطح پر زراعت کو جدید بنایا جاسکتا ہے تو سرکاری سطح پر کیوں نہیں.....؟

جب مطلوبہ حد تک گندم خوشوں سے علیحدہ ہو جاتی تو اس سے بھوسے کو علیحدہ کرنے کے لئے ہوا چلنے کا انتظار کیا جاتا۔ جب تک ہوا نہ چلتی تو یہ اہم کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔ جب ہوا چلتی تو اس بھوسے اور گندم کے آمیزے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لئے بانس کے بنے ہوئے چھج (Sifner) کی مدد سے ہوا میں بکھیرا جاتا۔ یوں انسانوں کے لئے گندم اور جانوروں کے لئے بھوسہ علیٰحدہ علیٰحدہ ہو جاتے۔ مویشی اور انسانوں کی جان توڑ مشترکہ محنت کے بعد جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کا وسیلہ پیدا ہو جاتا۔

غربت کے گہرے سائے

خطے میں غربت عام ہونے کی وجہ سے میرا بچپن بھی دیگر افراد کی طرح غربت اور کسمپرسی کے عالم میں گزرا۔ تقسیم برصغیر سے پہلے ہماری معاشی حالت قابل رشک حد تک اچھی تھی۔ ہجرت کی وجہ سے ہمیں اپنا تمام مال اسباب اور جائیداد بھارت میں چھوڑ کے آنا پڑی۔ پاکستان آکے ہمارے حالات انتہائی خستہ ہو گئے تھے۔ ہم ایسے مکان میں رہتے تھے جسے جھگی کہنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ یہ لفظ ہمارے گھر کو بیان کرنے کے لئے نہایت مناسب ہے۔ بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے پاس ہاتھ دھونے کے لیے صابن تک نہ ہوتا تھا۔ گزر بسر بمشکل ہو رہی تھی۔ ان تمام حالات اور تنگ دامنی کے باوجود ہمیں کوئی پچھتاوا نہ تھا اور ہم ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے تھے۔ میں نماز باقاعدگی سے ادا کرتا اور قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ میری کوشش ہوتی کہ میں سب سے پہلے مسجد پہنچ کر اذان دینے کا شرف حاصل کر سکوں۔

دوسرے بچوں کے برعکس کھیل کود کا وقت میرے پاس بہت کم تھا۔ میرا روزانہ کا معمول ایسا تھا کہ کھیل کود کے لیے وقت ہی نہ بچتا۔ جب کبھی لمبے وقفوں کے بعد میرے پاس تھوڑا سا فارغ وقت ہوتا تو میں فٹ بال، کبڈی یا ہاکی کھیلنا پسند کرتا لیکن اس کا موقع کم ہی ملتا۔ میں شروع ہی سے بھاگنے دوڑنے میں بہت تیز تھا اور اپنے ساتھی لڑکوں کو دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیتا۔ اسی طرح بائیسکل تیز چلانے میں بھی میرا کوئی ثانی نہ تھا۔ بازو پکڑنے کے مقابلے میں بھی بڑے شوق سے حصہ لیتا اور اکثر اوقات جیت جاتا۔

میں نے پانچویں اور چھٹی جماعت انہی حالات میں گوجرہ شہر سے پاس کی۔ میرے سکول آنے جانے کی مشکل صورت حال سے میرے والدین بخوبی آگاہ تھے اور اس بارے فکر مند تھے۔ وہ میری مشکل کا حل ڈھونڈ رہے تھے۔

تعلیم اور مشکلات

میرے والدین نے مجھے اپنے خالہ زاد عبدالکریم کے پاس بھیج دیا جو پیپلز کالونی فیصل آباد میں رہتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ میں آرام سے اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔ فیصل آباد میں گھر کا حجم کم اور رہنے والے افراد زیادہ تھے۔ میری وہاں آمد سے گھر مزید چھوٹا پڑ گیا۔ اس وجہ سے گھر کے مکینوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا میرا وہاں قیام ایک سال سے زیادہ طول نہ پا سکا۔ میں نے فیصل آباد میں رہتے ہوئے ساتویں جماعت پاس کی۔ فیصل آباد رہنے کا تجربہ زیادہ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔

میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شدت سے خواہش مند تھا۔ میں نے اپنے والدین کی رضامندی سے اپنے ماموں کے گھر کمالیہ جانے کا فیصلہ کیا اور ارادہ کیا کہ باقی تعلیم وہاں سے مکمل کروں۔ کمالیہ میں میرے ماموں آڑھت کا کاروبار کرتے تھے اور بہت خوشحال تھے ان کا کمالیہ شہر میں واقع گھر بھی کافی کشادہ تھا۔

کمالیہ یا 756

میں نے ماموں کے گھر جا کے سکون کا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب زندگی آرام سے گزرے گی اور میں اپنی تعلیم پہ توجہ دے سکوں گا۔ یہ تو میرا خیال تھا کسی "اور" کے خیال میں ابھی مجھے حالات کے مزید تھپیڑے کھانے کی ضرورت تھی۔ یوں معاملہ کچھ الٹا ہو گیا۔ صرف ایک ہفتے کے بعد ہی میرے ماموں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کمالیہ شہر کے بجائے ان کے ڈیرے پہ رہنا ہو گا جو کمالیہ شہر سے پانچ میل دور تھا..... چک نمبر.....756.....

چک نمبر سات سو چھپن میں میرے ماموں کی زمین تھی۔ ماموں نے یہ "خوش خبری" بھی سنائی کہ مجھے وہاں پہ ان کے نوکر لعل کے ساتھ کام بھی کرنا ہو گا۔ جس میں جانوروں کی دیکھ بھال، ان کے لیے چارے کا انتظام، فصلوں کو پانی لگانا اور باڑے کی صفائی ستھرائی وغیرہ شامل تھی۔ میں نے یہ سب کچھ تحمل سے سنا اور سر تسلیم خم کیا؛ خاموشی سے اپنا سامان اٹھایا اور چک نمبر سات سو چھپّن روانہ ہو گیا۔

"زندگی پھولوں کی سیج نہیں" میں نے سوچا.....

زندگی پھولوں کی سیج نہیں

اگلے دن سے میں نے اپنا معمول بنالیا کہ علی الصبح تقریباً تین بجے بیدار ہوتا اور لعل کے ساتھ کام کاج کرتا۔ یہ کام مختلف نوعیت کے ہوتے جس میں فصلوں کی دیکھ بھال، ان کو پانی لگانا، مویشیوں کے لیے چارے کا انتظام، دودھ دوہنا اور باڑے اور ڈیرے کی صفائی شامل تھی۔ میں اس وقت تک کام کرتا رہتا جب تک سکول جانے کا وقت نہ ہو جاتا۔ کام سے فارغ ہو کے میں جلدی سے غسل کرتا، لباس تبدیل کرتا، ناشتہ کرتا اور کتابیں اٹھا کے بھاگم بھاگ سکول روانہ ہوتا۔ ڈیرے پہ اگرچہ بائیسکل موجود تھی لیکن

اس کو استعمال کرنا میرے لیے ممنوع تھا کیونکہ وہ صرف میرے کزن کے لیے مخصوص تھی۔ سکول آنے جانے کے لیے میں دس میل کا فاصلہ پیدل طے کرتا۔ آسمان نے ایسے دن بھی دکھائے کہ بعض اوقات میرا کزن بائیسکل پہ سوار مجھے مکمل طور پہ نظر انداز کرتے ہوئے میرے پاس سے گزر جاتا اور میں پیچھے پیدل ہی چلتا رہ جاتا۔ اس قسم کے ناقابل برداشت حد تک تلخ لمحات میں بھی میں صبر سے کام لیتا رہا۔

والدین کی لاعلمی

میرے والدین میری موجودہ حالت سے بے خبر تھے۔ انھیں اطمینان تھا کہ میں کمالیہ شہر مزے سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ میں نے انھیں اپنے اوپر بیتنے والے کڑے حالات سے بے خبر رکھا۔ جب میں گھر جاتا تو اپنے والدین کے سامنے ماموں اور ان کے گھر والوں کی تعریف کرتا اور ان کے اچھے روّیوں کے فرضی قصے سناتا۔ میں جس آزمائش سے گزر رہا تھا اس کا تذکرہ میں نے اپنے گھر والوں سے دو وجوہات کی وجہ سے نہ کیا۔ ایک تو میرا خیال تھا کہ ان کو تکلیف ہو گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہو سکتا تھا میرے والدین جذبات میں آ کر مجھے وہاں سے واپس بلا لیتے یوں میری پڑھائی کا حرج ہوتا۔ میں جس سکول میں زیر تعلیم تھا اس کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا اور میں کسی قیمت پہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے چھوڑوں۔ اس لیے میں نے اس تمام عرصے میں ہمت، حوصلے اور صبر سے کام لیا۔ کوئی بھی حرف شکایت زبان پہ لائے بغیر سر جھکا کے وہ وقت گزارا۔

وقت دبے پاؤں اپنے مخصوص انداز میں گزرتا رہا۔ پتہ نہیں انسان اور وقت کہاں سے آتے اور کہاں چلے جاتے ہیں.....؟ انہی حالات میں تین سال گزر گئے۔ جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں نے اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ سو فیصد حاضری اور بہترین کارکردگی کے دو انعامات بھی حاصل کیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے صبر کا پھل عطا فرمایا اور خاندان بھر میں اپنے والدین کا نام روشن کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرورِ وسوز و ثبات
(علّامہ اقبال)

کالج کی تعلیم

اگلا اور مشکل مرحلہ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ کالج کی فیس اور ہاسٹل کے اخراجات ہمارے گھر کی کل آمدن سے بھی زیادہ تھے۔ میں اپنے والدین کی تہی دامنی سے خوب واقف تھا لیکن تعلیم کے شوق سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے خوب غوروخوص کیا۔ اپنے والدین سے بھی مشورہ کیا اور اس کے بعد ساہیوال کے کالج میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ساہیوال کے نواح میں میری خالہ رہتی تھیں جن کے پاس میں رہائش رکھ سکتا تھا اس سے میرے ہاسٹل کے اخراجات بچ جاتے۔ اگرچہ میری خواہش یہ تھی کہ میں فیصل آباد یا لاہور کے کسی اچھے کالج میں داخلہ لوں کیونکہ ان کا تعلیمی معیار بہت اچھا تھا لیکن میرے گھر کے حالات آڑے آئے اور میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

ع یہاں کسی کو کبھی حسب آرزو نہ ملا

زندگی کا بہترین حصہ

خالہ اور خالو نے میرے سر پہ دست شفقت رکھا اور ہر طرح کا تعاون کیا۔ انھوں نے ہمیشہ ہر طرح سے میرا خیال رکھا اور مجھے بے حد عزّت سے نوازا حتیٰ کہ میں پچھلے تمام تلخ تجربات بھول گیا۔ میرا ان کے ساتھ گزرا زمانہ ایسی تاریخی رومانوی داستان جیسا حسین ودلکش ہے جو دل پہ نقش ہو جائے۔
میں نے کالج میں داخلہ لیا اور پڑھائی شروع کر دی۔ کالج کا ماحول بہت اچھا تھا۔

کالج آنے جانے کے لئے مجھے تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ خالو نے مجھے بائیسکل لے دی تھی۔ جس سے میں بڑی آسانی کے ساتھ کالج آجا سکتا تھا۔

میں نے کالج میں جن پروفیسر صاحبان سے استفادہ کیا ان میں سے چند ایک مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد بھلی صاحب انگریزی کے پروفیسر تھے انھوں نے برطانیہ سے تعلیم حاصل کی تھی اور بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر آغا صاحب ہمیں ریاضی (Math) پڑھاتے تھے اور بہت لائق تھے۔ نسیم اختر صاحب اردو اور فارسی کے پروفیسر تھے اور خود بھی بہت اچھے شعر کہتے تھے۔

100 کلومیٹر سے زائد یکطرفہ سفر

خالو کی دی ہوئی سائیکل نے میرا بہت ساتھ دیا۔ میں اس پر کالج آتا جاتا دیگر رشتے داروں سے ملنے بھی اسی سائیکل پہ جاتا۔ میں نے اس پر بڑا لمبا سفر طے کیا۔ میں اس پہ ساہیوال سے چیچہ وطنی جاتا، پھر وہاں سے کمالیہ پہنچتا، کمالیہ سے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور وہاں سے گوجرہ جاتا، گوجرہ سے ہوتا ہوا میں فیصل آباد، پھر وہاں سے اپنی پھپھو کے ہاں جڑانوالہ پہنچتا، پھر وہاں سے مذکورہ بالا راستے سے واپس ساہیوال عازم سفر ہوتا۔ میں ان تمام شہروں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرتا، پھر اگلے شہر اگلے رشتہ دار سے ملنے چل پڑتا۔ یہ تمام سفر تقریباً سو کلومیٹر سے زائد بنتا ہے جو میں سائیکل پہ طے کرتا تھا۔

شفقت کا جواب خدمت

خالہ اور خالو کی شفقت دیکھ کر میرا دل کرتا کہ میں ان کی خوب خدمت کروں۔ میرے دل میں ان کے لیے احترام و محبت کے بے پایاں جذبات تھے اور میں موقع کی تلاش میں رہتا کہ کسی طریقے سے ان کے احسانات کا بدلہ دے سکوں۔

میرے خالو روزانہ چک نمبر چھیانوے (96) سے ساہیوال جاتے جہاں سے وہ

عارف والا کے لیے بس پکڑتے۔ اپنے گاؤں سے ساہیوال شہر تک جانے کے لیے وہ سائیکل استعمال کرتے۔ گاؤں سے شہر کے رستے میں پانی کا ایک بہت بڑا نالہ تھا۔ جس کے اوپر پل نہ ہونے کی وجہ سے نالے کے اوپر سے چھلانگ لگا کے گزرنا پڑتا۔ اگر راہ گیر کے پاس سائیکل ہوتی تو مشکل مزید بڑھ جاتی کیوں کہ سائیکل اٹھا کے چھلانگ لگانا بڑا مشکل کام تھا۔ جوان لوگوں کے لیے تو مشکل تھا ہی مگر معمر لوگوں کے لیے مشکل ترین.....۔

میں نے اپنے خالو کی خدمت کا ایک موقع اس طرح پیدا کیا کہ جب ان کی گھر واپسی کا وقت ہونے لگتا تو میں اس سے کچھ دیر قبل ہی اس مقام پہ پہنچ جاتا جہاں سے وہ نالہ پار کیا جاتا تھا۔ میں چوں کہ وقت سے پہلے ہی پہنچ جاتا اس لیے اپنے ہمراہ نصاب کی کوئی کتاب لے جاتا اور خالو کے آنے تک اس کا مطالعہ کرتا رہتا تاکہ وقت ضائع نہ ہو جب خالو آ جاتے تو ان سے بائیسکل لے کر میں نالا پار کراتا۔ خالو ہر مرتبہ مجھے منع کرتے اور کہتے "آپ کا یہاں آنا ضروری نہیں۔"

لیکن شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ میرا وہاں آنا کتنا ضروری تھا اور مجھے ان کی خدمت کر کے کتنا سکون ملتا تھا۔ اسی طرح صبح کو کالج جانے سے پہلے ان کے سائیکل کو نالہ پار کراتا اس کے بعد میں کالج روانہ ہوتا۔ میں نے پورے چار سال تک اس خدمت کو ذمہ داری سے نبھایا۔ چاہے آندھی آئے یا طوفان، بارش ہو یا بادل، میں اپنے مقررہ وقت پر پہنچتا اور یہی خدمت سر انجام دیتا۔ میں نے ایک اور طریقے سے بھی خالو جان کی خدمت کرنے کا موقع پیدا کیا۔ وہ حقّہ پینے کے عادی تھے اور اپنے لیے حقّہ خود ہی تیار کیا کرتے تھے۔ خاص طور پہ تہجد کی نماز کے بعد وہ حقّہ ضرور پیا کرتے تھے۔

جو لوگ حقّہ تیار کرنے کے بارے جانتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ یہ ایک محنت طلب اور مشکل کام ہے۔ میں نے خالو کا یہ کام بھی خود ہی سنبھال لیا تاکہ انھیں خود حقّہ تیار کرنے کی زحمت نہ ہو۔ اس کے لیے میں تہجد کی نماز سے ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہوتا۔

لکڑیاں تلاش کرتا اور ان سے کوئلے بناتا۔ جتنی دیر میں کوئلے تیار ہوتے میں اتنی دیر میں جا کے حقّے کا پانی تبدیل کر لاتا اس کے بعد میں تمباکو تیار کر کے حقّے میں ڈالتا پھر تمباکو کے اوپر کوئلے رکھ کر سلگاتا۔ حقّہ تیار کرتے ہوئے مجھے مجبوراً دو چار کش لگانے پڑتے تاکہ تسلّی ہو جائے کہ حقّہ اچھی طرح تیار ہے۔

جب خالو تہجد کی نماز سے فارغ ہو جاتے تو میں تازہ حقّہ ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ مجھے اپنے داداجی کی نصیحت بھی اچھی طرح یاد تھی جس میں انھوں نے مجھے حقّہ پینے سے منع کیا تھا لہٰذا میں حقّہ تیار کرنے کے بعد اچھی طرح سے کلیاں کرتا اور مسواک کے ذریعے دانت صاف کرتا۔ پھر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ مجھے حقّہ پینے کی عادت سے محفوظ رکھے اور اپنے داداجی کی نصیحت پہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے تمباکو نوشی کی عادت نہ پڑی۔

زندگی آمد برائے بندگی

میں نماز روزہ کا پابند ایک عام سا لڑکا تھا۔ ایسے آپ کو دیہات میں لاکھوں مل جائیں گے جو دیہاتی ثقافت کے زیرِ اثر نماز، روزہ کی پابندی اور اپنے والدین کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی خاص مقصد ہو نہ ہو، تاہم ان میں اپنے خاندانی پس منظر کے علاوہ مروّجہ دیہی خوبیاں اور خامیاں موجود ہوتی ہیں۔ نظریہ کسی کسی کے اندر پنپتا ہے جو کسی خاص واقعے کے نتیجے یا مسلسل تربیت کے زیرِ اثر اپنے کمال کو پہنچتا ہے جو دنیا میں کمال کرنے کی صلاحیت دیتا ہے۔

میں شروع ہی سے اسلامی زندگی گزارنے کی طرف مائل تھا مگر خالہ اور خالو نے مجھے ایک نیا راستہ، ایک نئی نہج عطا کی۔ انھوں نے مجھے خدمت انسانیت کا درس دیا۔ میری معلومات کے ذخیرے میں گرانقدر اضافہ کیا اور ایک اچھا مسلمان بننے میں بہت مدد دی۔ نماز میں پہلے ہی باقاعدگی سے ادا کرتا تھا۔ اب کوشش ہوتی کہ میں ”سیتلاں“

کی طرح یہاں بھی مسجد میں جا کے اذان دوں اور باجماعت نماز ادا کروں۔ انھی دنوں تلاوت قرآن پاک کا شوق میرے اندر مزید پروان چڑھا اور میں نے ایک رمضان المبارک میں سات مرتبہ قرآن پاک مکمل کیا۔ دوسروں کی مدد اور خدمت کرنے کا جذبہ میرے اندر آکاس بیل کی طرح اپنی جڑیں مضبوط کرتا رہا۔ شعور کی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے حق و باطل میں فرق کرنا بھی سیکھا۔

میرا وہ وقت کسی چوڑے پاٹ والے دریا جیسا پرسکون تھا۔ وقت بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتا رہا۔ کچھ باتیں اگر صیغۂ راز میں ہی رہیں تو شاید زندگی اور انسانیت کا مفاد اسی میں ہے۔ علم و آگاہی کو برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ علم جس کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ یہ مروجہ علوم دنیا سے ذرا ہٹ کے ہے لیکن اس کا تعلق بھی ظاہر ہے انسانوں ہی سے ہے۔ یہ علم کچھ مخصوص لوگوں تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔ ہر کسی کو ہر بات نہیں بتائی جاسکتی۔ پتہ نہیں..... کیوں؟ کیوں کہ علم و آگاہی کو برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ جنید بغدادی نے رنجیدہ ہو کر کیوں کہا کہ میں اسی دن سے ڈرتا تھا.....؟

کیا دل میں یہ خیال آنا کوئی جرم ہے کہ انسانوں کو اپنی اصل حقیقت کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ چند دہائیوں بعد روئے زمین کی پوری نسل انسانی مٹی میں مل جاتی ہے اور ان کی جگہ دھیرے سے نئے لوگ سنبھالتے ہیں۔ پہلے والے لوگ کہاں گئے؟ بعد میں آنے والے کہاں سے آئے؟ اس دنیا سے جاتے لوگوں نے اپنی پوری زندگی کی کمائی آنے والی نسل کو کیوں سونپ دی؟ مرتے وقت اپنی جمع پونجی ساتھ لے کر کیوں نہ گئے؟ جیتے جی تو کسی کو نہیں دی۔

کالج میں آخری سال کے دوران میں نے ایک ٹائپنگ کورس بھی کیا۔ آخری سال کے دوران ہی میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے بیرون ملک جانا چاہیے

اس کے لیے میں نے مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے خط و کتابت شروع کر دی۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے میں نے بی۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

یہ چار سال جو میں نے خالہ اور خالو کے ساتھ چک نمبر چھیانوے میں گزارے میری زندگی کا ناقابل فراموش باب ہیں۔ خالہ اور خالو میرے احسان مند تھے کہ میں نے ان کے بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ان کا ہاتھ بٹایا اور ان کے بچوں کو پڑھنے کے لیے راغب کیا جبکہ میں ان کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا تھا۔ انھوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ بے مثال تھا۔ ہمارے دوسرے رشتہ داروں کے برعکس انھوں نے مجھے حقیقی عزّت و احترام سے نوازا جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

جدائی کا دن

آخر وہ دن آ پہنچا جب ہمیں الوداعی پارٹی دی گئی۔ یہ کالج میں ہمارا آخری دن تھا۔ جہاں کچھ چہرے خوشی سے تمتماتے تھے وہیں کچھ چہرے ملول اور اداس تھے۔ چار سال.....زندگی کا ایک یادگار حصّہ.....اتنی آسانی سے کون جدا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے آس پاس کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ اتنے مانوس.....اور اتنے قریب.....مجھے قدرے سکون محسوس ہوا۔ لیکن اگلا پل لرزا دینے والا تھا۔ وہ پل یہ آگہی رکھتا تھا کہ کل اس وقت ہم کہاں ہوں گے.....اور کتنے دور.....کل.....جس نے ضرور آنا ہے.....کل..... جس کو سب نے بھلا رکھا ہے.....۔

جب میں بی۔اے کی ڈگری ہاتھوں میں تھامے خوشگوار یادوں کا البم ذہن میں محفوظ کیے، چک نمبر چھیانوے سے رخصت ہوا تو میری آنکھیں نم تھیں۔ میرے دل میں جلتی محبت کی آنچ آہستگی سے تیز ہوتی گئی جیسے شدید سردی میں انگاروں کی تپش کا لطف.....میں دوسروں کی خدمت اور حقیقی خوشی کے راز سے واقف ہو چکا تھا۔ میں یہ

بات جان چکا تھا کہ زندگی کی حقیقی خوب صورتی اور لطف انسانی خدمت میں ہی مضمر ہے۔

گھر کے دروازے پر میرے خالو کا تمام خاندان جمع تھا۔ میں ایک طویل عرصہ ان کے ساتھ رہا..... سب خوش تھے کہ میری تعلیم مکمّل ہوئی اور سب کے دل غم سے بھرے تھے کہ جدائی کا وقت آ پہنچا تھا۔ ان کے آنسو مجھے واپس کھینچتے..... مگر میں رک نہیں سکتا تھا۔ میں نے دور جانا تھا اور کسی پڑاؤ پہ اپنے قیام کو طول نہیں دینا تھا۔ مگر آنسو..... آنسو چاہے کسی کے بھی ہوں اپنے اندر بے پناہ طاقت رکھتے ہیں۔ انسانوں کا رب، انسان کے سارے گناہ پل بھر میں معاف فرما دیتا ہے۔ چاہے وہ گناہ، آسمان پہ سجے ستاروں، چاہے ریت کے ذرّوں سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں..... شرط مخلص آنسو ہیں.....۔ آنسو آپ کے ارادے کو متزلزل کر سکتے ہیں۔ میں نے ڈگمگانے سے پہلے ہی قدم باہر کی جانب بڑھا دیئے۔

"اگر میری منزل دور نہ ہوتی تو میں رک جاتا" میں نے خود سے کہا۔

مذہب اپنے اعتقادات میں عام حقائق کا ایسا نظام ہے جسے اگر خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور انہماک کے ساتھ اپنایا جائے تو یہ انسانی سیرت و کردار بدل سکتا ہے

(پروفیسر وائیٹ ہیڈ۔ برطانیہ)

باب دوم

عملی زندگی کا آغاز

بیرون ملک داخلے کی درخواست

بی۔ اے کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے والدین کا سہارا بنوں گا اور گھر کے اخراجات میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ میرے والدین کی معاشی حالت ایسی نہ تھی کہ میں مزید تعلیم حاصل کر سکتا اس لیے میں نے نوکری تلاش کرنی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں کو خط بھی لکھتا رہا۔ میں نے اتنی کثرت سے خطوط لکھے کہ ایک دن میرے والد صاحب مذاق میں کہنے لگے "بیٹا! لگتا ہے تم میری ساری کمائی خط لکھنے میں ہی اڑا دو گے۔"

مجھے ان لکھے گئے خطوط کے جواب کا انتظار تو تھا مگر میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لیے میں نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور جلد مجھے ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کا لاٹری کا کاروبار تھا۔ میں اس وقت نوجوان تھا، حال ہی میں پڑھائی سے فارغ ہوا تھا اور عملی زندگی کا تجربہ برائے نام تھا۔ میں یہ ملازمت ملتے ہی بہت پرجوش ہو گیا۔ کمپنی اور اس کے کام کے بارے میں زیادہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

نوکری اور ترقی

بطور سیلزمین میرا کام اپنی کمپنی کی مصنوعات متعارف کرانا اور ان کی فروخت میں اضافہ کرنا تھا۔ ابتدائی طور پر چند گاؤں میری ذمّہ داری میں دیئے گئے۔ میں نے

پوری تن دہی سے کام کیا اور اتنی اچھی سیل کی کہ ان لوگوں نے بہت جلد مجھے پوری تحصیل کا انچارج بنا دیا۔

یہ غالباً 1954ء کی بات ہے۔ لوگ اتنے پڑھے لکھے نہ تھے مگر بھرپور رکھ رکھاؤ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے میری تعلیم چونکہ اچھی تھی اس لیے مجھے ہر جگہ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ میں نے اس کام کے دوران اپنی تعلیم کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے کام کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ اس توجہ اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمپنی کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ مجھے اسی رفتار سے ترقی ملتی گئی۔ کمپنی والوں نے بہت جلد پہلے تو ضلعی انچارج اور اس کے بعد مجھے پورے صوبہ پنجاب کا سیلز منیجر بنا دیا۔ کمپنی کی انتظامیہ میرے کام سے بہت خوش تھی۔ میری تمام تر توجہ اپنے کام پہ مرکوز تھی۔ کمپنی کی طرف سے دیا گیا ہر ہدف میں پورا کرنے کی کوشش کرتا اور اکثر و بیشتر وقت سے پہلے حاصل کر لیتا۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور میں کمپنی کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور مجھے اگلے عہدے پر ترقی دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ عہدہ پورے پاکستان کے سیلز منیجر کا تھا۔ میری تنخواہ اور دیگر مراعات میں اضافہ کر دیا گیا۔ کاروباری دورے کے دوران کمپنی کی طرف سے ہوٹل میں قیام وطعام کے علاوہ، گاڑی اور رہنمائی کے لیے عملہ مہیا کیا گیا۔ سفر کرنے کا خرچ بھی کمپنی کے ذمہ تھا۔ اس ملازمت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے پورے پاکستان کی سیر کر لی۔ میری عملداری میں آزاد کشمیر بھی آتا تھا مجھے اس جنّت نظیر وادی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کمپنی کا چیف ایگزیکٹو میری کارکردگی سے اتنا خوش تھا کہ اس نے میرے اعزاز میں ایک پارٹی کا اہتمام کر ڈالا۔ پورے ملک میں کام کرنے والے نمایاں عہدے داروں کو اس پارٹی میں شرکت کی دعوت دی گئی۔

عجیب منظر

میرے اعزاز میں دی جانے والی یہ پارٹی کئی حوالوں سے ایک یادگار پارٹی تھی جو میں آج تک نہیں بھول پایا اور شاید کبھی نہ بھول پاؤں۔ میں مقرّرہ دن لاہور میں منعقد ہونے والی اس پارٹی میں جا پہنچا۔ جس وقت پہنچا تو وہاں پہ اک عجیب ہی منظر دیکھا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس کی میں اس وقت، اس مقام پر توقع نہیں رکھتا تھا۔ زیادہ تر ہمارے ساتھ وہ واقع ہوتا ہے جو ہماری سوچ اور توقع سے ماورا ہوتا ہے ہماری ساری منصوبہ بندی اور سوچ دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پتہ نہیں میں گھر سے کیا سوچ کے نکلا تھا اور نہ جانے کیا واقع ہونے جارہا تھا؟

میزوں پہ جام دھرے تھے۔ اس "بازار" کے باسی نسوانی وجود میزوں کے درمیان تھرک رہے تھے۔ وہاں موجود لوگ مدہوشیوں کی منزلوں کی جانب اڑان بھر رہے تھے۔ ماحول میں سگریٹ اور شراب (Liquor) کی ملی جلی بو پھیلی تھی۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا..... یہ کیا ہو رہا ہے.....؟ میں نے خود سے پوچھا..... یہ سوال کافی دیر تک میرے اندر گونجتا رہا مگر جواب بر آمد نہ ہوا..... شاید سوال کرنے والے اور جواب دینے والے کا علم برابر ہی تھا..... تب میں نے صورت حال کے پوری طرح واضح ہونے تک صبر سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ایسے ماحول میں میری طبیعت مکدّر ہوئی جاتی تھی۔ میں نے سب کے ساتھ جا کے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ جو کچھ وہ کر رہے تھے میں اس میں ان کا ساتھ دوں۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ میں کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ نافرمان لوگوں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شریک گناہ کریں۔ میں خود پہ جبر کیے بیٹھا رہا۔ جبر اس حوالے سے کہ میں وہاں مزید بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد جب شراب خانہ خراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا تو ان لوگوں نے وہ کچھ اگلنا شروع کیا جو ان کے اندر تو موجود تھا مگر انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا..... سچ..... جسے ایک نہ ایک دن ظاہر ہونا ہے۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھا ان لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ وہ نشے کے زیر اثر ایک دوسرے سے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے اور ان لوگوں کا مذاق اڑا رہے تھے جن کو وہ لاٹری کے نام پہ الّو بنا رہے تھے..... وہ لوگ فراڈ کر رہے تھے.....۔

جب پوری تصویر میرے سامنے آئی تو میں ششدر رہ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ کیسے میں لاٹری کے نام پہ لوگوں کو دھوکہ دینے والوں کا حصّہ ہوں۔ میں پہلے ہی اس ماحول میں بے کل اور ایک اجنبی کی مانند بیٹھا تھا۔ یہ سب سن کے میں شدید قسم کے احساس گناہ اور بے چینی کا شکار ہو گیا۔ اس نئی صورت حال نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ میں نے اسی وقت ایک طرف جا کے سادہ کاغذ پہ استعفیٰ لکھا اور جیب میں ڈال لیا۔ یہ اپنے مستقبل کو داؤ پہ لگانے والی بات تھی مگر اس وقت پرواہ کسے تھی؟ مجھے سمجھ آ گیا تھا کہ یہ پارٹی کیوں ہو رہی تھی؟ ظاہر ہے ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ جیسے کمایا ویسے ہی خرچ کیا۔

نوکری سے استعفیٰ

اسی اثناء میں میرے باس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اسے شاید علم ہو چکا تھا کہ میں پرہیز کر رہا ہوں۔ گناہ کرنے والے کی نفسیات اس وقت ایسی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اپنے ضمیر کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچ سکے اور اسے یہ توجیہہ پیش کر سکے کہ وہ اکیلا نہیں.....۔ نفس لوّامہ..... ظاہر ہے کچھ اور وجوہات بھی ہوں گی۔

میرا باس اس وقت نشے میں تھا۔ اس نے خمار آلود نگاہوں سے میری طرف

دیکھا اور مجھے شراب پیمانے میں ڈالنے کا حکم دیا۔ میں تو پہلے ہی غصّے سے بھرا بیٹھا تھا میں نے فوراً ہی انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ تم میرے ملازم ہو اور میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں اب تمہارا ملازم نہیں رہا..... کیونکہ میں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے یہ کہہ کر میں نے اپنا استعفیٰ اس کے سامنے پھینک دیا۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے اسے میری بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ جب اسے میری بات کی سمجھ آئی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس کا نشہ ایک دم ہرن ہو گیا ہو۔ اس نے فوراً کہا۔
”ارے! آپ ناراض ہو گئے میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

میں نے غصّے اور افسوس کی ملی جلی کیفیت میں جواب دیا ”جناب! میری اور آپ کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ نے پہلے بھی کچھ ایسی ناپسندیدہ باتیں کی تھیں جو میں نے بڑی مشکل سے برداشت کیں۔ اب آپ مجھے شراب ڈالنے کا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو آج پتہ چلا ہے آپ غریب لوگوں کا خون چوس رہے ہیں۔ مجھے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ میں اپنے خدا کو کیا جواب دوں گا؟ اس لئے میں ابھی اور اسی وقت یہ نوکری چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ “

اس نے دوبارہ مجھ سے معذرت کی اور ساتھ میں لالچ دینے کی کوشش کی، کہنے لگا ”ہم آپ کو پورے پاکستان کا انچارج بنا رہے ہیں اور آج کی یہ پارٹی اسی مقصد کے لئے تھی۔ ہم آپ کی تنخواہ بڑھا دیں گے، کمیشن بھی پہلے کی نسبت دوگنا ہو گا۔ مراعات میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ بلکہ آپ جو کچھ کہیں گے ہم وہ کرنے کو تیار ہیں۔ آپ یہ ملازمت چھوڑ کر مت جائیں۔“

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے اشارے پہ ایک دو لوگ مجھے روکنے کی نیت سے میرے پیچھے آئے لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا کیوں کہ مجھے رکنا تھا نہ میں رکا۔

وہاں سے آتے ہوئے میں نے ایک نگاہ عبرت اپنے آس پاس ڈالی۔ شرکائے محفل اپنے ارد گرد سے بے نیاز اوٹ پٹانگ حرکتوں میں مصروف تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور ان کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ وہ خود کو اپنی ذہانت کی داد دے رہے تھے کہ کس چالاکی سے وہ دوسروں کو بے وقوف بنا رہے ہیں؟ آدھی رات ہو چکی تھی اور تاریخ تبدیل ہونے کو تھی۔ میں اپنی تاریخ تبدیل کرنے کے عزم کے ساتھ رخصت ہوا۔ مجھے ان اپنے تئیں ذہین فراڈیوں پہ ترس آ رہا تھا جن کی ذہانت کو یہ علم بھی نہ تھا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے اور وہ اس دنیا میں کیوں بھیجے گئے؟

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(علّامہ اقبال)

میں وہاں سے سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے اپنے اوپر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتار پھینکا ہو۔ میں نے ایک طرح سے نوکری چھوڑ کر خطرہ مول لیا تھا کیونکہ اب میں بے روزگار تھا۔ گھر کے حالات میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ آئی تھی مگر میرا نوکری چھوڑنے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ مزید کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے غیر دانستہ طور پر ہونے والے اس گناہ کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور ابھی تک اس گناہ کی معافی مانگتا رہتا ہوں۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار

ایک در بند تو سو در کھلے

کہتے ہیں کہ ایک در بند تو سو در کھلے۔ پروردگار نے اپنی رحمت سے میرے لیے روزگار کے نئے دروازے کھول دیئے میں جب گھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا ایک گہرا

دوست عبدالرشید میرا انتظار کر رہا ہے اور کئی دفعہ گھر آ چکا ہے۔ اس وقت ذرائع ابلاغ اتنے جدید اور عام نہ ہوئے تھے کہ ہمارا آپس میں بلاتوقف رابطہ ہو سکتا۔ ہماری ملاقات چند دن کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔

جب وہ مجھے ملا تو چھوٹتے ہی بولا "یار! میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے پوچھا "کیوں خیریت ہے؟" اس نے کہا "میرے پاس ایک بہترین کاروباری منصوبہ ہے۔" میں نے پوچھا "وہ کیا؟"

تب اس نے مجھے فیصل آباد سے چھپنے والے ایک اخبار کے بارے میں بتایا جو سرمائے کی کمی کی وجہ سے بند پڑا تھا۔ اس کا ایڈیٹر ناظم الدین، عبدالرشید کا دوست تھا۔ اب عبدالرشید یہ چاہتا تھا کہ میں، عبدالرشید اور ناظم الدین مل کر وہ اخبار چلائیں۔ اسے علم تھا کہ میرے پاس کچھ رقم پس انداز ہے جس کو استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے بات اچھی طرح سمجھ لی ہے اور میں سوچ کر جواب دوں گا۔ میں نے پیشکش کے بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا۔ خود بھی کافی سوچ بچار کی اور اس کے بعد اس اخبار کو چلانے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

ڈیلی تاجر

ہم نے فیصل آباد سے "تاجر" کے نام سے ایک روزنامہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک تجارتی اخبار تھا۔ اس میدان میں ہمارا مدمقابل "ڈیلی بزنس" نامی اخبار تھا جو بہت اچھا جا رہا تھا۔ تاجر کو شائع اور متعارف کرانا ایک چیلنج سے کم نہ تھا کیونکہ ہمارے پاس سرمائے کی قلّت تھی۔ ہمارا اخبار فی الحال عملے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ایڈیٹر سے اخبار فروشی تک کے تمام مراحل سے ہم تینوں کو ہی نپٹنا تھا۔ ہم نے صرف اخبار لکھنے کے لئے کاتبوں کی خدمات حاصل کیں باقی ذمہ داریاں جیسے چپڑاسی، کلرک اور اخبار فروشی وغیرہ ہم نے خود ہی سنبھال لیں۔ ایک پرنٹنگ پریس

سے ہم اخبار چھپواتے۔ خود ہی لیبل لگا کر اسے بس اڈے یا ریلوے اسٹیشن پہنچاتے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ ڈیلی بزنس سے پہلے پہلے ہمارا اخبار لوگوں تک پہنچ جائے۔

اخبار کی نوعیت کے لحاظ سے گردونواح کی تجارتی منڈیوں خاص کر غلّہ منڈیوں سے آگاہ رہنا بہت ضروری تھا۔ نیز اخبار کی فروخت کے لیے مؤثّر روابط کی بھی ضرورت تھی۔ چونکہ میں اخبار میں سرکولیشن منیجر کی ذمہ داری بھی ادا کر رہا تھا اس لیے میں نے متعدد شہروں مثلاً گوجرانوالہ، جھنگ، سرگودھا، پاکپتن، ساہیوال، عارف والہ، خانپور، رحیم یار خان، ملتان، خانیوال، پشاور، اور متعدد دوسرے شہروں کی غلہ منڈیوں میں اپنے اخبار کو متعارف کرایا۔ اخبار کی فروخت کے لیے ہر علاقہ کے تاجروں کے ساتھ اپنے روابط مستحکم کیے۔ خوش قسمتی میرے ساتھ تھی۔ میں جلد ہی اپنے اخبار کے لیے موزوں تعداد میں قارئین تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہم نے اپنے اخبار میں چند بنیادی اور اہم تبدیلیاں کیں جس میں اس کا لے آؤٹ اور ڈیزائننگ تبدیل کرنا شامل تھا۔ "ڈیلی بزنس" میں اجناس کی جو قیمتیں شائع ہوتیں وہ تقریباً ایک ہفتہ پرانی ہوتیں کیونکہ وہ لوگ یہ قیمتیں مختلف علاقوں سے بذریعہ ڈاک منگواتے۔ ہم نے بذریعہ ٹیلی فون وہ ریٹ لینا اور اپنے اخبار میں شائع کرنا شروع کر دیئے۔ جو زیادہ سے زیادہ ایک دن پرانے ہوتے تھے۔ اس نمایاں فرق نے بھی لوگوں کو ہمارے اخبار کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

"تاجر" ایک کامیاب اخبار ثابت ہوا اور اس نے ڈیلی بزنس کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پنجاب کے وسطی اور زیریں علاقوں میں ہم نے تقریباً اسّی فیصد (80%) کاروبار پہ قبضہ جما لیا۔ جب ہمارا کاروبار پنجاب میں مستحکم ہو گیا تو ہم نے صوبہ سندھ میں اپنا اخبار متعارف کروانے کا سوچا۔ کچھ عرصے بعد ہم نے کراچی سے اخبار نکالنا شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہم نے جلد ہی صوبہ سندھ کے باقی علاقوں میں اپنے اخبار کی تقسیم

شروع کر دی۔ ایک سال کے اندر اندر ہم نے پورے پاکستان میں "ڈیلی بزنس" کو پیچھے چھوڑ دیا۔

اس ایک سال کے دوران میں اپنے گھر نہ جاسکا۔ میں اپنے کام میں جنون کی حد تک غرق تھا۔ میرے والدین نے جب بذریعہ ڈاک بہت زیادہ اصرار کیا اور میرے دوستوں نے مجھے گھر جانے پر مجبور کیا تو میں چند دن کی رخصت لے کر گھر آیا۔ اخبار میں اس وقت میں جنرل منیجر کی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ اپنے کام اور اخبار سے خوب مطمئن تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ گھر جانے سے میری زندگی ایک نئے رخ پہ چل نکلے گی اور میں دوبارہ صحافت کی دنیا میں واپس نہ جاسکوں گا۔

گھر آمد

لمبے عرصے کے بعد جب میں گھر پہنچا تو گھر والے بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے معذرت کی اور وضاحت پیش کی کہ میں کیوں اتنا عرصہ ان سے دور رہا۔ ماں جی نے مجھے خوب پیار کیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ڈاک کا ایک بنڈل اٹھا لائیں اور میرے حوالے کیا۔ یہ ان خطوط کے جواب تھے جو میں نے مختلف ممالک کی جامعات کو لکھے تھے۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے ڈاک کھولی کیوں کہ بہت ساری جامعات نے مجھے داخلے کی پیشکش بھیجی تھی۔

داخلے کی پیش کش

مجھے بیرون ملک سے جن تعلیمی اداروں نے داخلے کی پیشکش بھیجی تھی ان میں انگلینڈ کی مانچسٹر (Manchester) ،بلیک برن لندن(Black Bern, London) کے علاوہ امریکہ کی نیویارک (New York) ، ہیوسٹن(Huston) ، شکاگو (Chicago) ، واشنگٹن۔ ڈی۔ سی(Washington-DC) ، میری لینڈ(Mari

Land) اور کیلی فورنیا (California) کی جامعات شامل تھیں۔ میں نے اپنے والدین اور باقی رفقاء سے مشورہ کیا اور کافی سوچ بچار کے بعد امریکی ریاست کیلی فورنیا(California) کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے اخبار کے دونوں ساتھیوں کو مطلع کیا کہ میں مزید اخبار کا حصّہ نہیں رہ سکتا کیوں کہ مجھے پڑھائی کے لئے باہر جانا ہے۔ دونوں نے میرے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

امریکی یونیورسٹی میں داخلہ

میں نے داخلے کے لیے درخواست تیار کی اور ضروری کاغذات کے ہمراہ کیلی فورنیا یونیورسٹی بجھوادی۔ اس کے بعد میں نے امریکہ جانے کے طریقہ کار کے بارے معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ میں امریکی سفارت خانے گیا اور وہاں سے امریکہ جانے کے طریقہ کار کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ امریکی مشنریز سے ملا۔ ان سے امریکہ کے لوگوں اور موسم کے بارے پوچھا۔ انھوں نے مجھے گراں قدر معلومات فراہم کیں۔ جب کیلی فورنیا یونیورسٹی سے داخلے کا گرین سگنل ملا تو میں نے امریکی ویزا کے لیے درخواست بجھوادی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے ویزا مل گیا۔

زادِراہ کی عدم دستیابی

میرا ویزا لگ کر آ گیا مگر ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں اپنی تمام جمع پونجی اخبار چلانے میں خرچ کر بیٹھا اور اب میرے پاس امریکہ کا ہوائی ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہ تھے۔ میں بہت پریشان ہوا کہ کیا کروں؟ اللہ میاں نے پھر کرم نوازی کی اور خالو نیاز میری مدد کو آئے۔

یہ وہی خالو نیاز تھے جن کے پاس رہتے ہوئے میں نے بی۔ اے کیا تھا۔ انھوں نے کچھ رقم بطور قرض دی مگر یہ رقم بھی ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے کے لیے ناکافی تھی۔

اس پر خالو نیاز نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ بذریعہ بحری جہاز انگلینڈ چلے جاؤ، وہاں میرا ایک دوست ہے جس کا نام عزیز بخش ہے وہ آپ کو امریکہ کے ٹکٹ کے پیسے دے دے گا۔ میں یہاں پہ اتنے ہی پیسے اس کے گھر والوں کو ادا کر دوں گا۔ مجھے ان کا یہ مشورہ اس لیے بھی پسند آیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے انگلینڈ کے ویزہ کے لیے درخواست جمع کرادی۔

میرا فوری طور پہ امریکہ جانا ممکن نہ تھا کیوں کہ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہ تھے۔ میں نے اس رکاوٹ کو عزم وہمّت سے عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا برطانیہ کا ویزہ لگ کر آگیا۔ چونکہ بحری جہاز کا ٹکٹ نسبتاً سستا تھا اس لیے میں نے اسی ذریعۂ سفر کو منتخب کیا۔ میں نے خالو نیاز کے دیئے ہوئے پیسوں سے بحری جہاز کا ٹکٹ خریدا۔ یوں ان حالات میں امریکہ براستہ برطانیہ روانہ ہوا۔

اگرچہ میرے والد صاحب کو بھی میری جدائی کا صدمہ تھا مگر انھوں نے کمال ہمت سے ضبط کر رکھا تھا لیکن ماں رو رہی تھی.....وہ مجھے بار بار کہے جاتی..... او میرے پتّر..... اتنے دور نہ جا..... میں ان کو سمجھانے میں ہلکان ہوا جاتا تھا کہ میرا جانا کتنا ضروری ہے..... میں گھر بیٹھ کے کبھی بھی ایک بڑا آدمی نہیں بن سکتا..... میں نے ان کو قائداعظم محمد علی جناح کی مثال بھی دی جو پڑھنے کے لیے باہر گئے اور واپس آکر مسلمانوں کی قیادت کی اور پاکستان جیسی عظیم نعمت دلائی۔

روانگی

جس وقت جہاز نے روانگی کا بھونپو بجایا تو مجھے اس کی آواز درد اور سوز میں ڈوبی محسوس ہوئی۔ جدائی انسان سے ہو یا وطن سے..... برابر کی تکلیف دہ ہوتی ہے..... جدائی ایک ناقابل بیان تکلیف کا نام ہے..... جدائی محبت کے دریائے خوں کی معاون ندی ہے..... مجھے ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ یاد آیا لیکن میں رک نہیں سکتا تھا..... میری

منزل بہت دور تھی..... "نہ جا بیٹا..... مجھ سے اتنے دور نہ جا۔ "..... میں رک نہیں سکتا تھا..... "نہیں ماں....."

میں نے ایک آخری نگاہ اپنے وطن کی سر زمین پہ ڈالی اور خود سے عہد کیا..... اے میرے پیارے وطن، میرے پیارے پاکستان..... میں لوٹ کر آؤں گا..... تیری خدمت کرنے کیلئے..... تیری سر زمین پہ بسنے والے سب لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے..... اپنی ماں کی خدمت کرنے کے لیے..... مجھے ابھی جانا ہے اور ضرور جانا ہے..... ایک روشن کل کے لئے..... میں اس تکلیف دہ سفر کو برداشت کرنے صرف اس لئے نکلا ہوں تاکہ تیرے لئے اچھا کر سکوں..... تیرے لئے ایک خوشگوار اور روشن کل ڈھونڈ کے لا سکوں۔ میں ابھی سے اس کل کا انتظار کرتا ہوں..... تو بھی کرے گا نا.....؟ میرا سوال لہروں کے دوش پہ دور تک پھیلتا گیا..... ریڈیائی لہروں کی مانند.....

میں نے کان لگا کر جواب سننے کی کوشش کی..... جہاز کے انجن کی آواز اور لہروں کا شور..... جواب ندارد تھا..... میں نے محسوس کرنے کی کوشش کی..... مجھے ایسا لگا کہ میں صحرا میں پانی ڈھونڈتا پھر رہا ہوں..... تب ہوا مٹّی کا پیغام لے کر آئی..... ایک معطّر جھونکا میری روح کو سرشار کر گیا..... میں خوش ہو گیا..... مجھے میرا جواب مل چکا تھا.....

باب سوم

بیرون ملک قیام

برطانیہ کا سفر

ہمارا یہ سفر سترہ دن پہ محیط تھا جس میں ہم نے راستے میں کئی جگہ پڑاؤ کرنا تھا۔ راستے میں سمندر نے ہمارے لئے کوئی مشکل کھڑی نہ کی اور پرسکون رہا یہاں تک کہ ہم مصر کے ساحل پہ جا پہنچے۔

جمال عبد النّاصر سے ملاقات

خوش قسمتی سے پاکستان کے ایک وزیر بھی بحری جہاز میں ہم سفر تھے جن کی ملاقات مصر کے صدر جمال عبد النّاصر سے طے تھی۔ ہمارے جہاز نے ایک دن کے لئے مصر میں رکنا تھا۔ جب بحری جہاز قاہرہ(Cairo) کی بندرگاہ پہ لنگرانداز ہوا تو انھوں نے مجھے اور جہاز پہ موجود تین مزید طالب علموں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ہمیں تردّد کیسے ہو سکتا تھا؟ ہم لوگ بخوشی تیار ہو گئے۔

بندرگاہ سے ایک پروٹوکول آفیسر کی معیّت میں ہم صدارتی محل پہنچے۔ جہاں پہ ہماری خوب خاطر مدارت کی گئی۔ رات کا کھانا ہم نے جمال عبد النّاصر کے ساتھ صدارتی محل میں کھایا۔ مجھے وہ سب کچھ ایک خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ میں پاکستان کے دیہات سے تعلق رکھنے والا ایک غریب اور عام سا لڑکا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مسلم دنیا کے اتنے اہم اور بڑے لیڈر کے ساتھ یوں چلتے چلتے ملاقات ہو جائے گی۔ بہر حال یہ میری زندگی کے وہ یادگار لمحات ہیں جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مصر سے روانہ ہونے کے بعد کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا اور ہم بخیریت برطانیہ پہنچ گئے۔

عزیز بخش۔یادگار تجربہ

میں لندن کی ساؤتھمپٹن پورٹ (Southampton port) پہ اترا۔ وہاں سے عزیز بخش کی طرف روانہ ہوا جو میرے خالو کا دوست تھا اور گلاسگو (Glasgow) میں رہتا تھا۔ میرا برطانیہ آنے کا مقصد عزیز بخش سے ملاقات تھی تاکہ پیسے ادھار لے کر امریکہ کا ٹکٹ خرید سکوں ورنہ میں تو امریکا جارہا تھا جہاں کیلی فورنیا یونیورسٹی میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں بڑے خوشگوار موڈ میں عزیز بخش کے پاس پہنچا اور انھیں ساری صورت حال بتائی۔ میں نے کہا "میں آپ کے دوست نیاز علی کا بھانجا ہوں اور انھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں نے امریکا جانا ہے جہاں میرا داخلہ ہو چکا ہے۔ میرے پاس امریکہ کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے نہیں۔ خالو نیاز نے مجھے یہاں اس لئے بھیجا ہے کہ آپ نہ صرف ٹکٹ خریدنے میں میری مدد کریں گے بلکہ مجھے سوٹ بھی خرید کر دیں گے۔ آپ جتنے پیسے مجھے دیں گے میرے خالو اتنے ہی پیسے پاکستان میں آپ کے گھر والوں کو ادا کر دیں گے۔" میں نے خوشی خوشی ان کو تفصیل بتائی۔

عزیز بخش زمانے کے سرد و گرم سے واقف انسان معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے ہاں یا ناں میں بات کا جواب دینے سے گریز کیا، کہنے لگے "پہلے بھی آپ کی طرح ایک لڑکا میرے پاس آیا تھا اور اتفاق سے اسے بھی آپ کے خالو نیاز علی نے ہی بھیجا تھا۔ میں نے اسے نہ صرف امریکہ کا ٹکٹ لے کر دیا بلکہ سوٹ بھی سلوا کر دیئے۔ لیکن اس نے امریکہ جا کر ادھار واپس کرنا تو درکنار، خط لکھنا تک گوارا نہ کیا اور میں ایسا احمق ہوں کہ آج تک اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ کافی دیر تک ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ ان کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے انکار کا انداز تھا۔ جب پوری تصویر میرے سامنے آئی تو مجھے

بری طرح سے دھچکا لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ عزیز بخش سے کسی قسم کی توقع رکھنا فضول ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی میں یکدم پریشان ہو گیا کیوں کہ میں اب آگے جا سکتا تھا نہ پیچھے۔

میں نے خود پہ قابو رکھا اور اپنی حالت ان پہ ظاہر نہ ہونے دی۔ بڑے ہی معتدل انداز میں پوچھا کہ آیا یہاں پہ کوئی اور پاکستانی بھی موجود ہیں؟ انھوں نے مجھے چند لوگوں کے بارے میں بتایا۔ میں ان سے کوئی بھی گلہ کیئے بنا وہاں سے اٹھ گیا۔

میں انگلینڈ آیا ہی عزیز بخش سے پیسے لینے کے لئے تھا ورنہ میری منزل تو امریکہ تھی۔ اب اچانک ہی سارا کچھ بدل گیا تھا۔ میں اس یکسر تبدیل ہو جانے والی صورتحال کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا۔ مجھے اپنی حالت پہ شدت سے رونا آیا اور میں گلاسگو کے ایک پارک میں بیٹھ کے خوب رویا۔ میرے آس پاس سے لوگ گزرتے رہے کسی کو اس بات سے غرض نہ تھی کہ میں کیوں دھاڑیں مار مار کر روئے جاتا ہوں.....؟

جب میرے دل کی بھڑاس نکل گئی تو میں نے خود کو نئی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے خود کماؤں گا۔ اگر خالو نیاز علی نے مجھے مشورہ نہ دیا ہوتا تو میں کبھی قرض نہ مانگتا۔ عزیز بخش کے روّیے کی وجہ سے مجھے بہت ٹھیس پہنچی اور میں نے دوبارہ ان کے پاس نہ جانے کا عہد کیا۔

برطانیہ میں مزدوری

میں پارک سے اٹھ کے اپنے ایک ہم وطن، جس کا نام ”بوٹا“ تھا، کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے تمام صورت حال بتائی اور درخواست کی کہ وہ کام تلاش کرنے میں میری مدد کرے۔ اس نے مجھے بڑے کارآمد مشورے دیئے اور بتایا کہ کہاں کہاں پہ کام مل سکتا ہے؟ وہ رات میں نے بوٹے کے پاس ہی گزاری۔ اگلے دن ڈاک خانے جا کر میں نے

کیلیفورنیا یونیورسٹی کو لکھ بھیجا کہ میں اس وقت برطانیہ میں ہوں اور جلد امریکہ نہیں آسکتا لہذا میرے داخلے کی تاریخ بڑھائی جائے۔ یہ کام کرنے کے بعد میں نے کام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد مجھے ریلوے سٹیشن پہ کام مل گیا۔

یہ کام بہت مشکل اور سخت محنت کا متقاضی تھا۔ اس میں مال گاڑی کے متحرک ڈبوں کو آپس میں ہک (Hook) کے ذریعے ملانا اور جدا کرنا ہوتا تھا۔ اس میں انجن ایک بوگی لے کر آتا تھا، جس کو پہلے سے موجود بوگی کے ساتھ منسلک کرنا ہوتا تھا۔ اگر یہ کام پہلی ہی کوشش میں سرانجام پاجاتا تو ٹھیک، ورنہ انجن کی رفتار کے ساتھ ساتھ بھاگ کر یہ کام کرنا پڑتا جب تک کہ بوگی انجن کے ساتھ نہ لگ جائے۔ اس کام کے دوران ہاتھ پہ سخت چوٹ پڑنے کا اندیشہ موجود رہتا۔ سردیوں میں یہ کام نسبتاً زیادہ مشکل تھا پھر بھی میں کرتا رہا کیونکہ مجھے نوکری کی سخت ضرورت تھی۔ جب میں اس کام سے بری طرح تنگ آگیا تو میں نے اپنے سپروائزر سے بات کی کہ میں اس نوکری کو مزید جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو کسی اور جگہ کام دے دیا جائے۔ میں آپ جیسے اچھے ورکر کو کھونا نہیں چاہتا۔

دن رات کام

کچھ دن بعد مجھے اس نے مطلع کیا کہ ابھی اس کے پاس قلی کی آسامی خالی ہے اگر میں کرنا چاہوں تو.....؟ میں نے فوراً حامی بھرلی۔ کیونکہ یہ نوکری اسٹیشن کی عمارت کے اندر تھی اس لئے اس میں سردی سے بچاؤ ممکن تھا۔ یہ نوکری قدرے آسان تھی اور اس میں ٹپ بھی مل جایا کرتی۔ چند ماہ کے بعد میرا اس سے بھی جی بھر گیا اس لیے اسے بھی چھوڑ دیا۔ اگلی نوکری کے لئے میں نے بس کنڈکٹر کا انتخاب کیا۔ اس میں تنخواہ اچھی تھی اور ہفتہ، اتوار کو جب گورے چھٹی کرتے تو میں اوور ٹائم (Over Time) لگاتا۔

اگست 1957ء تک تقریباً ایک سال کے دوران میں نے بہت کچھ کما لیا۔ میں

نے امریکہ کے ٹکٹ کے پیسے علیحدہ رکھّے اور خالو نیاز کو ان کے قرض کی ادائیگی کر دی اس کے علاوہ میں نے نو سو پچاس (950) پاؤنڈ گھر بھی بھجوا دیئے۔

قرض لینے سے انکار

اس دوران عزیز بخش سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی۔ انھوں نے میری مدد کرنے پر اصرار کیا۔ انھیں خوف تھا کہ خالو نیاز ان سے ناراض ہو جائیں گے۔ میں نے نرمی سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں خالو نیاز کے زور دینے پہ انتہائی مجبوری کے عالم میں آپ کے پاس آیا تھا ورنہ میں قطعاً آپ کو مدد کے لئے نہ کہتا۔ میں اپنی قوت بازو پہ بھروسہ کرنے والا انسان ہوں مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں نے آپ سے سوال کیا تھا۔

عزیز بخش نے مجھے قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے مسلسل انکار کیا کیوں کہ مجھے اب قرض کے پیسوں کی ضرورت نہ رہی تھی اور میرے پاس ٹکٹ خریدنے کے پیسے موجود تھے۔

عزتِ نفس، خودداری، خود انحصاری

دراصل عزّت نفس، خود داری، اور خود انحصاری ایسے اصول ہیں جو کسی بھی انسان کی کامیابی میں کلیدی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات (Complete Code of Life) ہے۔ ہر دور، ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں حددرجہ قابل عمل نظام زندگی ہے۔ اسلام ہی ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے عین مطابق گزاری جائے۔ اپنی خودداری اور عزّت نفس پہ کوئی حرف نہ آنے دیا جائے۔ مشکلات تو زندگی کا ایک لازمی جزو ہوتی ہیں۔ ہر انسان جو سوچے اگر ویسا ہی ہو جائے تو دنیا کا نظام کیسے چل سکتا ہے؟ انسانی تصّور اور کوشش کو تقدیر

اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتی ہے جس سے دنیا کی موجودہ شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔

ہم لوگ اپنی کم فہمی، جلد بازی اور غوروفکر نہ کرنے کی بنا پر اس حقیقت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اپنی متعیّن کردہ راہوں اور خود ساختہ اصولوں پہ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ ہمارے سامنے ذلت ورسوائی اور ناکامی کی صورت میں آتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی غلطیوں سے سبق سیکھیں، الٹا تقدیر کا شکوہ کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتے رہتے ہیں۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

(علامہ اقبالؒ)

سفر امریکہ

میں نے برطانیہ میں محنت مزدوری کر کے اتنے پیسے بنا لیے کہ اب امریکہ کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ میں نے حقیقی معنوں میں ایک ایک پائی اکٹھّی کی تھی۔ پورا ایک سال لگا تھا تب جا کے اس قابل ہوا تھا کہ ٹکٹ کے پیسے اکٹھے کر سکوں۔ میں نے شینن ائرپورٹ گلاسگو سے یونائیٹڈ ائرلائن کے طیارے کے ذریعے امریکہ کے لئے روانگی اختیار کی۔

27 اگست 1957ء وہ دن تھا جب میں نے امریکی ریاست کیلی فورنیا میں قدم رکھا۔ اس ریاست کا صدر مقام سیکرامنٹو (Sacramento) ہے۔ میرے والد صاحب نے مجھے ایک شخص کا پتہ بتایا تھا جو 1905ء سے امریکہ میں مقیم تھا ان کا نام بابا امیر الدّین تھا۔ میں سیدھا ان کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے کھانا

کھلایا۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آیا میں آرام کرنا چاہتا ہوں یا سیر..... میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا میرے پاس کالج کی فیس کے لئے پیسے موجود نہیں۔ مجھے نہ آرام کی ضرورت ہے اور نہ سیر کی۔ میرے پاس اس وقت کل پچاس ڈالر ($50) ہیں۔ اس لئے آپ برائے مہربانی کام تلاش کرنے میں میری مدد کریں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کل صبح چلیں کیوں کہ ابھی آپ تھکے ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے اصرار کیا کہ برائے مہربانی مجھے ابھی لے چلیں۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ بالآخر انھوں نے میری خواہش کا احترام کیا۔

میں خیر سے امریکہ تو پہنچ گیا تھا مگر میرے پاس پیسے نہ تھے۔ مجھے پہلے کچھ ڈالر کمانے تھے تاکہ میں کالج میں داخلہ لے سکوں۔ یہ میرے لئے ایک نئی آزمائش تھی۔ میں اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

امریکہ میں مزدوری سے ابتدا

بابا امیر الدّین مجھے نزدیکی قصبے یوبا سٹی (Yoba City) لے گئے اور وہاں ایک بزرگ غلام محمد سے ملوایا۔ یہاں غلام محمد کی کافی زمین موجود تھی جس پہ پھلوں کے باغات لگے ہوئے تھے۔ مجھے یہیں پہ کام کرنا تھا۔ میں نے امریکہ میں اپنے کام کی ابتدا پھل توڑنے سے کی۔

امریکہ آمد کے اگلے ہی روز میں گلے میں تھیلا لٹکائے، سیڑھی پہ چڑھا آڑو توڑ رہا تھا۔ وہ گرمیوں کے دن تھے اور گرمی ایسی تھی کہ ملتان یاد آتا تھا۔ پسینہ ایسے بہتا تھا جیسے پانی۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ پھلوں کو کیڑوں اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ان پہ سپرے کیا گیا تھا جس کی بو شدید تھی اور جو جسم پر لگنے سے جلن کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ اگرچہ میں ایک کسان کا بیٹا تھا اور محنت و مشقّت میرے لیے نئی چیز نہ تھی مگر یہ کام ایسا تھا کہ مجھے دن میں تارے نظر آ گئے۔ اب میں اپنے جسم پہ کھجلی کرتا یا پھل

توڑتا؟ دونوں کام ایک ہی وقت میں کرنے کو زور ڈالتے۔ ظاہر ہے ایک وقت میں ایک ہی کام کیا جا سکتا تھا اور وہ پھل توڑنا تھا کیوں کہ معاوضہ مجھے کھجلی کرنے کا نہیں دیا جاتا تھا۔

اس دوران مجھے فارم پہ ہی رہائش رکھنی پڑی جہاں پہ صفائی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کھانا ایسا ہوتا کہ ہمارے دیہات کی پھوہڑ اور غیر سلیقہ مند عورت بھی اس سے اچھا بناتی ہو گی۔ روٹی کہیں کہیں سے پکی ہوئی ہوتی اور سالن کے تمام اجزأ قابل شناخت حالت میں دستیاب ہوتے۔ لیکن کیا کریں پیٹ تو آخر بھرنا تھا۔ شام کو ڈالر ملنے کی امید میں میری کچھ ڈھارس بندھتی ورنہ میں پھل توڑتا اور روتا رہتا۔ اگر میرے والد صاحب نے میرا نام "بہادر" نہ رکھا ہوتا اور میری جیب میں کرائے کے پیسے ہوتے تو میں یقیناً وہاں سے بھاگ کر واپس پاکستان پہنچ جاتا۔ کبھی کبھار مجھے لگتا کہ شاید میرے والد صاحب نے اسی دن کے لیے میرا نام "بہادر" رکھا تھا۔ اس لئے میں نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا اور سختی کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

آڑو کا موسم ختم ہوتے ہی ناشپاتی کا موسم شروع ہو گیا اور اس کے بعد انگوروں کا۔ دھیرے دھیرے موسم تبدیل ہوتے رہے مگر میرا کام اتنا ہی محنت طلب اور صبر آزما رہا..... بہرحال جب پھل توڑنے کے تمام موسم تمام ہوئے تو کالج میں داخلہ لینے کا موسم آ چکا تھا۔ میں نے اپنا معاوضہ وصول کیا اور وہاں سے ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا بھاگا..... پیچھے مڑ کے بھی نہ دیکھا۔ اب میرے پاس اتنے پیسے بن چکے تھے کہ میں کالج میں داخلہ لے سکوں۔

کالج میں داخلہ

بالآخر مجھے میرے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ میں نے سیکرامنٹو سٹیٹ کالج (Sacramento State College) میں ایروناٹیکل انجینئرنگ (Aeronautical Engineering) میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت عموماً پاکستان میں زیادہ تر والدین اپنے

بچّوں کو انجینئر یا ڈاکٹر ہی بنانا چاہتے تھے لہٰذا اپنے والد صاحب کی خواہش پر میں نے انجینئر بننے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ مضمون اپنے اندر دلچسپی کی کئی وجوہات رکھتا تھا جس میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس کلاس کے اختتامی سال کے بعد تمام طالب علموں نے اپنے ہی ہاتھ سے جوڑے گئے (Assembled) جہاز میں سفر کرنا تھا مگر پتہ نہیں کیوں میں بہت جلد اس مضمون سے اکتا گیا۔ میں نے اپنی کونسلر مسز ہیفورڈ (Mrs. Hayford) سے درخواست کی کہ میں اپنا مضمون تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے وجہ پوچھی تو میں نے کہا مجھے اس مضمون میں کوئی دلچسپی نہیں۔ انھوں نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں کہاں باز آنے والا تھا؟ میں ہر دوسرے روز ان کے پاس پہنچ جاتا۔ تنگ آکر انھوں نے مجھے اجازت دے دی اور یوں میں ایروناٹیکل انجینئرنگ سے بزنس ایڈمنسٹریشن (Business Administration) میں آگیا۔ اگرچہ میرے باقی کلاس فیلوز نے میرا بہت مذاق اڑایا مگر مجھے پروانہ تھی کیونکہ یہ مضمون مجھے پسند نہ تھا۔ میں ان کے مذاق اڑانے کی وجہ سے وہ مضمون نہیں پڑھ سکتا تھا جو میرے لئے غیر دلچسپ تھا۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میرا پسندیدہ مضمون تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز کرلی۔ مسائل اور مصائب ہمراہ تھے۔ مجھے اپنے دستیاب وسائل کے مطابق گزارا کرنا تھا اور فی الوقت وسائل دستیاب نہ تھے۔ میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ کوشش کررہا تھا کہ کہیں پہ کوئی نوکری مل جائے تاکہ میں اپنا خرچہ پانی چلاسکوں۔

تعصّب

امریکہ کے ہر کالج میں شعبۂ روزگار ہوتا ہے۔ یہ شعبہ مالی مسائل کے شکار طالب علموں کو نوکری حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ شعبے کے سربراہ کی ذمّہ داری ہوتی

ہے کہ وہ مختلف کمپنیوں اور اداروں کے ساتھ رابطے میں رہے اور طالب علموں کو نوکری حاصل کرنے میں مدد کرے۔

ہمارے کالج کے شعبہ کی سربراہ مسز پیٹرسن (Mrs. Peterson) تھیں۔ میں ان کے پاس کئی مرتبہ گیا اور درخواست کی کہ وہ نوکری حاصل کرنے میں میری مدد کریں۔ لیکن جواب میں ان کا روّیہ بڑا ہی تعصّب آمیز تھا۔ انھوں نے میری درخواست پہ کوئی سرگرمی دکھائی نہ ہی مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ میں نے ان کے روّیے کو معمول کے روّیے سے تعبیر کیا اور خاموش رہا۔

کچھ عرصے بعد میں دوبارہ ان کے پاس گیا اور پھر اس کے بعد جاتا ہی رہا لیکن ان کا روّیہ پہلے سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ میں نے جب اس کا ذکر اپنے چند طالب علم ساتھیوں سے کیا تو پتہ چلا کہ تمام ایشیائی طالب علم ان کے نشانہ پر ہیں اور وہ انھیں نوکری دلانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں اور رویہ ہتک آمیز ہوتا ہے۔ ہم سب کچھ عرصے تک برداشت کرتے رہے مگر جب ان کے روّیے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو ہم نے احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے چند طالب علم ساتھیوں کی مدد سے شعبۂ روزگار کی انچارج کے خلاف کالج انتظامیہ کے سامنے ایک پٹیشن فائل کی جس میں ان کے رویے سے دلبرداشتہ سب طالب علموں نے دستخط کر رکھے تھے۔ ہم نے کالج انتظامیہ کے سامنے تمام صورت حال رکھی کہ کس طرح وہ خاتون تعصّب آمیز رویئے کا مظاہرہ کررہی ہیں اور اس وجہ سے کتنے ہی لوگ مصیبت میں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کالج کی انتظامیہ نے بروقت اقدام کرتے ہوئے اس خاتون کو وہاں سے تبدیل کر دیا اور ہم سب طلبہ نے کسی حد تک سکون کا سانس لیا۔

خودداری

اسی دوران میری نظر کا چشمہ ٹوٹ گیا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ میں چشمہ بنوا سکتا اس لیے میں کئی دن بغیر چشمے کے گھومتا رہا۔ میری کونسلر مسز ہیفورڈ کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ وہ ایک نیک اور ہمدرد خاتون تھیں۔

انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر ایک کارڈ میری طرف بڑھایا اور کہا "یہ ایک چرچ کا ایڈریس اور فون نمبر ہے جہاں سے آپ چشمہ لے سکتے ہیں۔ اس پہ کوئی خرچ نہیں آئے گا۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ وہ سمجھیں کہ شاید میں مسلمان ہونے کی بنا پر چرچ میں جانے سے گریزاں ہوں۔ انھوں نے مجھے ایک روٹری کلب (Rotary Club) کا پتہ بتایا اور کہا کہ آپ کو وہاں سے بھی چشمہ مل سکتا ہے۔

میں نے ادب سے کہا "شاید میں اپنی بات آپ کو سمجھانے میں ناکام رہا۔ دراصل میں مفلس ضرور ہوں لیکن خیرات قبول کرنا مجھے گوارا نہیں۔ یہ چرچ کا مسئلہ تو ہے ہی نہیں۔"

"پھر کیا کرو گے۔ آپ کی نظر کمزور ہے اور آپ کے پاس چشمہ موجود نہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"میں اپنے ہاتھوں کی کمائی سے اپنے لیے چشمہ خریدوں گا" میں نے عزم سے کہا اور اٹھ کے آ گیا۔

میں نے کام کی تلاش جاری رکھی۔ چند دن کے بعد مسز ہیفورڈ نے دوبارہ مجھے اپنے آفس میں بلایا اور پوچھا "کوئی کام ملا"؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے

لگیں.....پھر کہا

"کیا کام کر سکتے ہو"؟

میں نے کہا"میں ایک کسان کا بیٹا ہوں محنت کرنا جانتا ہوں۔ کام جیسا بھی ہو کر لوں گا۔"

انھوں نے مجھ سے پوچھا"مالی کا کام کر سکتے ہو"؟میں نے کہا"جی بالکل۔"

انھوں نے مجھے ہفتے والے دن اپنے گھر آنے کو کہا۔ اگلے دن ہفتہ تھا؛ میں پہنچ گیا۔

مجھے باغیچے کی صفائی کرنی تھی اور کیاریاں بنانی تھیں۔ میں نے باغیچے پہ ایک نظر ڈالی۔ باغیچہ کیا تھا ہر طرف جھاڑ جھنکار پھیلا ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا یہ باغیچہ مکینوں کی عدم توجہی کا شکار ہے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر کام شروع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے کیا کرنا ہے؟میں نے آٹھ سے دس انچ گہری زمین کھود کے اس میں سے گھاس پھونس جڑوں سمیت نکال لی تا کہ وہ دوبارہ نہ اگے۔ اس کے علاوہ فالتو پودے بھی نکال دیئے۔ پورے باغیچے کی صفائی کی۔ پانی لگانے کے لئے کیاریاں بھی بنا دیں۔ جب کام ختم ہوا تو مشکل سے یقین آتا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے۔

مسز ہیفورڈ نے جب آکر باغیچے کو دیکھا تو بہت خوش ہوئیں۔ فوراً ہی بیس ڈالر نکال کر میری طرف بڑھائے۔ میں نے پیسے لینے کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھایا تو انھوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

میں نے کہا"میں یہ پیسے نہیں لے سکتا۔"

پوچھا"کیوں نہیں لے سکتے آپ کا چشمہ ٹوٹ چکا ہے اور آپ کو نئے کی ضرورت ہے ان پیسوں سے آپ نیا چشمہ خرید سکتے ہیں۔"

میں نے پھر انکار کیا

انھوں نے کہا"آپ نے اتنا اچھا کام کیا ہے کہ آپ ان پیسوں کے حقدار ہو۔"

میں نے احترام سے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ میں ایک مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ ہمارے ہاں سرے سے یہ تصور ہی مفقود ہے کہ استاد سے کچھ لیا جائے بلکہ ہم استاد کو دیا کرتے ہیں۔ آپ میری استاد ہیں اس لئے میں آپ سے پیسے نہیں لے سکتا۔"

میں نے ان کے بے پناہ اصرار کے باوجود پیسے نہ لئے اور چلا آیا۔ اگلے دن جب میں کالج پہنچا تو انھوں نے پھر مجھے دفتر طلب کیا جب میں پہنچا تو انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر کہنے لگیں

"آپ عجیب انسان ہیں چرچ سے عینک لینا چاہتے ہیں نہ روٹری کلب سے۔ میرے گھر آپ نے اتنی محنت سے کام کیا پھر اس کا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی ہوں کہ میرا پالا کیسے انسان سے پڑا ہے اور میں آپ کا کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔"

وہ حقیقتاً میرے لئے پریشان لگ رہی تھیں۔ میں ان کے لہجے میں خلوص اور اپنائیت واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ میں نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ انھوں نے ایک خط میرے حوالے کیا اور کہا "یہ خط آس پاس کے گھروں میں دکھاؤ ہو سکتا ہے کسی کو آپ کی ضرورت ہو بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ کو ضرور کام مل جائے گا۔"

اس خط میں مسز ہیفورڈ نے مجھے کام دینے کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے میرے کام اور رویے کی تعریف کی تھی اور لوگوں سے درخواست کی تھی کہ مجھے ضرور کوئی کام دیا جائے۔ (خط کا عکس تصویر گیلری میں موجود ہے)

انتہا کی بے توقیری

مجھے چونکہ کام کی سخت ضرورت تھی اس لئے میں سکول سے واپس آتے ہی اس کام میں جت گیا۔ میں نے لوگوں کے گھروں کی گھنٹی بجانی شروع کر دی۔ میں ان کو وہ خط دکھاتا اور کام کے لئے درخواست کرتا۔ بعض لوگ یوں تنگ کئے جانے پہ غصّے میں

آ گئے۔ انھوں نے مجھے گالیوں سے نوازا، بعض نے برا بھلا کہنے پہ اکتفا کیا اور کچھ نے آدھی بات سن کے ہی دروازہ بند کر دیا۔ یہ سلسلہ تواتر سے چلا حتیٰ کہ اپنی بے توقیری اور ناقدری دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ناکام و نامراد واپس لوٹا اور اللہ تعالیٰ سے حالات کی بہتری کے لئے دعا کی۔

اگلے دن نئے جذبے کے ساتھ کام کی تلاش میں نکلا۔ گھنٹی بجانا اور دستک دینا شروع کی۔ مجھے کام کی سخت ضرورت تھی اور اگر کام نہ ملتا تو نوبت فاقوں تک آ جاتی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا مگر نتیجہ حسب سابق رہا۔ سورج غروب ہوا تو میں تھکا ہارا واپس آیا۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

(سیّد صادق حسین شاہ)

حالات کا دلیری سے مقابلہ

اگرچہ حالات بدترین تھے مگر میں مایوس نہ تھا اور میرے حوصلے جوان تھے۔ میں نے خود پر لازم کر لیا کہ مقصد حاصل کرنے تک مایوسی یا خودترسی کا شکار نہیں ہوں گا۔ اپنے مقصد سے لگن اور عزم و ہمّت کامیابی کے راز ہیں اس کے ساتھ ساتھ انسانی غیرت و خودداری وہ اعلیٰ صفات ہیں جو آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ جدوجہد کرنے اور آگے بڑھنے پہ اکساتی ہیں۔ قسمت ایسے لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ میں حالات سے دلبر داشتہ نہ ہوا اور اپنے معمول کو جاری رکھا۔ ہر روز میں ایک نئے عزم کے ساتھ نکلتا اور گھروں میں کام کے بارے میں پوچھتا۔ جواباً زیادہ تر مجھے گالیاں ہی کھانے کو ملتیں۔ اسی تگ و دو میں کئی روز گزر گئے۔

مددخدا

بالآخر اللہ تعالیٰ کی مدد آ پہنچی اور ایک تراسی (83) سالہ ضعیف بڑھیا مسز فرگوسن (Mrs. Ferguson) کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ انھوں نے مجھے اگلے ہفتے کے روز اپنے گھر کام کے لئے آنے کو کہا۔ میں وہاں سے خوشی خوشی کمرے میں واپس آیا۔ شکرانے کے نفل پڑھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اب مجھے ہفتے کے دن کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ہفتے کو مجھے کالج سے چھٹی تھی۔

مقّررہ دن کو میں وقت سے پہلے ہی خاتون کے گھر پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے گھر کی صفائی کا کام سونپا۔ مجھے بڑی مشکل سے کام ملا تھا اس لئے میں نے خوب دل لگا کے کام کیا اور پورے گھر کی صفائی بہترین طریقے سے کی۔ کونے کھدرے تک نہ چھوڑے۔ کچن کی صفائی کی اور برتن بھی دھوئے۔ جب کام ختم کیا تو ہر چیز چمک رہی تھی۔ میں نے جب واپسی کی اجازت چاہی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا

"کتنے پیسے لوگے؟"

میں نے جواب دیا "جو آپ دے دیں۔"

انھوں نے مجھے پانچ ڈالر دیئے۔ میں خوش ہو گیا۔ یہ کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھا۔ انھوں نے مجھے اگلے دن یعنی اتوار کو دوبارہ بلایا۔ اگلے دن میں نے کمرہ رنگ کیا اور پورے گھر کی صفائی کی۔ جس میں باتھ روم بھی شامل تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد جب میں نے رخصت چاہی تو انھوں نے وہی سوال کیا۔

"کتنے پیسے لوگے؟"

میرا جواب بھی وہی تھا۔ "جو آپ دے دیں۔"

انھوں نے مجھے سات ڈالر دیئے اور اگلے ہفتے پھر بلایا۔ میں اگلے ہفتے ان کے گھر پہنچا اور پہلے کی طرح صفائی، ستھرائی کے علاوہ مالی کا کام بھی سرانجام دیا۔ انھوں نے آخر

پہ مجھ سے وہی سوال پوچھا کہ کتنے پیسے لو گے؟ میں نے بھی وہی جواب دیا۔ ''جو آپ دے دیں۔''

انھوں نے مجھے شفقت سے دیکھا اور دس ڈالر نکال کر دیئے۔ پھر نہ جانے ذہن میں کیا آیا کہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ مجھے بہت عمدہ قسم کا کھانا کھلایا اور ہمراہ لے جانے کے لیے بھی دیا۔ میرے ساتھ ان کا سلوک رحم دلانہ تھا۔ کہنے لگیں

''تم میرے پوتے جیسے ہو اور بہت محنتی ہو۔ ہر کام بہت اچھے طریقے سے کرتے ہو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں پہ مزدوری کا معاوضہ سوا ڈالر فی گھنٹہ ($1.25) ہے۔ تم نے تین روز تک بارہ گھنٹے (12) روزانہ کام کیا ہے۔ اس حساب سے تمہارے کل چھتیس (36) گھنٹے بنتے ہیں تم نے جس اچھے طریقے سے کام کیا ہے اس حساب سے تم کم از کم دو ڈالر فی گھنٹہ کے حقدار ہو۔ یہ لو بقایا پیسے۔''

میں ان کی ایمانداری دیکھ کے ہکا بکّا رہ گیا۔ انھوں نے مجھے گن کر دو ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے ادائیگی کر دی جو کل پچاس ڈالر ($50) بنتے تھے۔ بائیس ڈالر ($22) وہ مجھے پہلے ہی دے چکی تھیں۔ اس طرح انھوں نے مجھے کل بہتّر ڈالر ($72) دیئے جو اس وقت ایک بڑی رقم تھی کیونکہ مجھے ایک ایک سینٹ (Cent) کی ضرورت تھی۔ میں یہ رقم پا کر خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اس رحمدل خاتون نے اسی پہ اکتفا نہ کیا بلکہ مجھے کہا کہ میں اگلے ہفتے ان کے گھر آ جاؤں وہ اپنے محلے کی باقی عورتوں کو مجھ سے ملوا دے گی تاکہ میرا روزگار چلتا رہے۔

اگلے ہفتے جب میں پہنچا تو مسز فرگوسن نے پہلے سے ہی محلے کی عورتوں کو گھر بلا رکھا تھا۔ انھوں نے ان تمام عورتوں سے میرا تعارف کرایا۔ میرے کام کے انداز اور روّیے کی تعریف کی اور سفارش کی کہ مجھے کام دیا جائے۔ خواتین نے اپنے اطمینان کے لئے مجھ سے کچھ دیر سوال و جواب کئے۔ جس کے بعد وہ سب خواتین اپنے مختلف گھریلو کام مجھ سے کروانے پہ تیاّر ہو گئیں۔

مسز فرگوسن کمرے سے ایک کیلنڈر اٹھا کے لائیں پھر اس پہ فرداً فرداً سب کے ساتھ میرا ٹائم مقرّر کر دیا۔ میں نے ان سب پر واضح کر دیا تھا کہ میں صرف ہفتہ اور اتوار ہی کو پورا دن کام کر سکتا ہوں باقی دنوں میں چونکہ میں کالج پڑھنے جاتا ہوں اس لئے پورا دن کام نہیں کر سکتا۔ ہاں صبح سویرے چند گھنٹوں کے لئے ضرور آسکتا ہوں۔ میں گھر واپس آیا تو ایک مرتبہ پھر سجدۂ شکر بجالایا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ (قرآن کا وعدہ)

یوں اگلے ایک ڈیڑھ ماہ کے لئے میری بکنگ ہو گئی۔ میرا معمول بن گیا کہ میں صبح سویرے بیدار ہوتا۔ تہجّد کی نماز ادا کرتا، شیو بناتا، پھر صبح کی نماز ادا کر کے کالج جانے کے لئے کپڑے اور کتابیں تیّار کر کے رکھ دیتا۔ جیسے ہی اجالا نمودار ہونے لگتا تو میں کیلنڈر کے مطابق کام والے گھر پہنچ جاتا۔ وہاں پہ مختلف قسم کے گھریلو کام سرانجام دیتا۔ سات بجے میں "دڑکی" لگا کے (بھاگ کر) کمرے میں پہنچتا، غسل کرتا، ناشتہ کر کے بھاگم بھاگ کالج کی طرف روانہ ہو جاتا کیونکہ آٹھ بجے سے پہلے کالج پہنچنا ضروری تھا۔ یہ تمام وقت بھگدڑ اور افراتفری کی حالت میں گزرتا۔

میں نے کالج میں پورے یونٹ لے رکھے تھے جن کی تعداد پندرہ تھی۔ میں کلاسز کے درمیان بریک نہ لیتا اس لئے میری پہلی کلاس صبح آٹھ بجے شروع ہوتی اور آخری ایک بجے تک ختم ہو جاتی۔ عام طور پر امریکہ کے تعلیمی اداروں میں طالبعلم ہر کلاس کے بعد کچھ دیر آرام کرنے یا سماجی طور پر راہ و رسم بڑھانے کے لئے بریک لیتا ہے۔ مجھے چونکہ لگاتار کلاسز لینی ہوتی تھیں اس لئے میں بریک ٹائم نہ لیتا جس کی وجہ سے کئی مرتبہ مجھے اپنی کونسلر کی جانب سے ڈانٹ بھی پڑتی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح صحت خراب ہو سکتی تھی مگر میری مجبوری تھی کہ میں نے تھوڑا آرام کرنے کے بعد کام پہ پہنچنا ہوتا تھا اس لئے میں ہر مرتبہ ان کو طرح دے جاتا۔

اللہ تعالیٰ انسانوں سے کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔“ اس کو دوبارہ دہرا کر تاکید فرمائی جاتی ہے کہ ”ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔“ تو تمام انسانوں کے مالک اور ربّ سے سچّا کون ہے؟ اس نے اپنے لطف و کرم کی بنا پر میرے حال پہ رحم فرمایا اور مشکل حالات کے بعد میرے لئے آسانی پیدا فرمائی۔

سوال کرنے سے گریز

میرے روم میٹ کا نام عبدالباری تھا اور ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ ہم نے کالج سے تقریباً چھ (6) میل دور ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پہ لے رکھا تھا۔ عبدالباری کے دادا پچھلے کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم اور بہت خوشحال تھے۔ عبدالباری کے پاس اپنی کار تھی جس پہ وہ کالج آتا جاتا تھا۔ شروع کے دنوں میں میرے پاس کار تو کجا بس کے کرائے کے لئے دس سینٹ بھی نہ ہوتے تھے اس لئے میں پیدل کالج آتا جاتا تھا۔

کالج کے دوست مجھے اکثر کہتے کہ یار تم پیدل آنے کے بجائے عبدالباری کے ساتھ آ جایا کرو۔ آخر تم لوگ ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے اور ایک ہی کالج میں پڑھتے ہو۔ میں ان کو جواب دیتا کہ دیکھیں، کیا اسے نہیں معلوم کہ میں پیدل آتا جاتا ہوں۔ جب اسے اس بات کا بخوبی علم ہے تو میں کیوں کہوں کہ مجھے اپنے ساتھ لے آیا کرے۔ اگر اسے خود احساس ہوتا تو وہ کہہ دیتا۔ اس کی بات الگ ہے لیکن میں اسے نہیں کہوں گا۔ یہ میری خودداری کے خلاف ہے۔

دال پہ گزارا

کھانے کے لئے میں دال (Split Peas) خرید لیتا کیوں کہ یہ بہت سستی تھی۔ اس کے ساتھ جو سب سے کم قیمت ڈبل روٹی ملتی وہ خرید کے تین چار دن تک

استعمال کرتا رہتا۔ اگرچہ یہ کوئی مکمّل غذا تو نہ تھی مگر پیٹ بھرنے اور کام کاج کرنے کے لئے توانائی ضرور مہیا ہو جاتی تھی۔

چند ماہ کے بعد میں نے کالج کے ساتھ ایک کمرہ کرائے پہ لے لیا یوں کالج آنے جانے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ میری مالک مکان اٹلی کی رہنے والی ایک بوڑھی خاتون مسز مسینا (Mrs. Massina) تھی۔ اس کا روّیہ میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ وہ میرے ساتھ اپنے عزیزوں جیسا سلوک کرتی۔ (جب میری شادی ہوئی تو میں اپنی بیوی بشریٰ کے ہمراہ لاس اینجلس آ گیا جو کہ سیکرامنٹو سے چھ سو پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک مرتبہ میں بیگم کے ہمراہ مسز مسینا کو ملنے پہنچا لیکن مجھے اکیلے ہی واپس آنا پڑا کیوں کہ مسز مسینا نے بے حد اصرار کرکے بشریٰ کو چند دن کے لئے اپنے پاس رکھ لیا اور کہنے لگی کہ یہ میرا حق ہے۔ میں ان کے خلوص کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور اکیلا ہی واپس آ گیا)۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے ایک کینری(Cannery) میں ملازمت کر لی جہاں پھلوں کو ڈبوں میں بند کیا جاتا تھا۔ میں کالج سے واپس آ کے تھوڑی دیر آرام کرتا اس کے بعد کینری چلا جاتا جہاں پھلوں کے ڈبے متحّرک بیلٹ پہ رکھنا میری ذمّہ داری تھی۔

خودی کی حفاظت

کینری میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں جس شعبے میں کام کر رہا تھا اس کے سپروائزر کا نام جارج تھامپسن تھا۔ اس نے ایک دن مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا "تمہارا نام بہت مشکل ہے اس لئے آئندہ میں تمہیں باب(Bob) کے نام سے پکاروں گا" (واضح رہے کہ امریکہ یا یورپ جا کے بہت سے مسلمان اپنا نام تبدیل کر لیتے ہیں اور عموماً جارج (Georg)، رک(Rick) یا باب(Bob) قسم کا نام رکھ لیتے ہیں)۔ میں نے کہا کہ

میرے والدین نے میرا نام صغیر احمد اسلم رکھا ہے (میں نے اپنے نام کے ہجے "صغیر احمد اسلم" کر کے بتائے) آپ کو ان تین ناموں میں سے جو بھی آسان لگتا ہے آپ پکار لو۔ میرے نام کے بڑے خاص معنی ہیں اس لئے میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔"

لیکن اس پہ میری بات کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اصرار کیا کہ وہ مجھے باب کے نام سے ہی پکارے گا۔

اگلے دن جب میں اپنا کام کر رہا تھا تو اس نے مجھے آواز دی! "باب! وہ کارٹن اٹھا کے ادھر لے آؤ۔" مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے آواز دے رہا ہے لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی اور اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے مجھے پھر پکارا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بلند تھی لیکن میں پہلے کی طرح لاتعلق بنا رہا۔ آخر کار وہ غصے میں طنطناتا ہوا میرے پاس پہنچا اور میرے کندھے کو زور سے ہلا کے بولا

"باب ! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

میں نے ناگواری سے کہا "میرا نام باب نہیں صغیر احمد اسلم ہے اور میں اسے تمہارے لئے تبدیل نہیں کر سکتا۔ نام تبدیل کرنا تو ایک طرف میں تمہارے جیسے بندے کے ساتھ کام تک نہیں کرنا چاہتا۔ میں ابھی جا کے استعفیٰ دیتا ہوں۔"

میں ہیومن ریسورس (HR) کے دفتر کی جانب چلا تو وہ بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے دفتر جا کے ساری صورت حال بتائی اور ان سے کہا کہ اگر میری خدمات کی ضرورت ہے تو مجھے کسی اور شعبے میں بھیج دیں ورنہ میرا استعفیٰ قبول کریں۔ منیجر نے کہا کہ ہم آپ جیسے اچھے ورکر کو کہیں جانے نہیں دیں گے۔ انھوں نے مجھے دوسرے شعبے میں بھیج دیا۔ حالانکہ مجھے اس نوکری کی سخت ضرورت تھی لیکن میں اپنی عزّت نفس پہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔

حالات میں بہتری

ہفتہ اور اتوار کو جب کالج سے چھٹی ہوتی تو میں لوگوں کے گھروں میں کام کرتا۔ یہ کام مختلف نوعیت کے ہوتے جس میں مالی کے علاوہ گھر کا کام مثلاً سیمنٹ، بجری سے تعمیر، باڑ کی مرمت، باتھ روم و کچن کی صفائی، گھر کی جھاڑ پونچھ، رنگ و روغن اور برتن دھونا شامل تھے۔ چند ماہ تک یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرا کام اتنا بڑھ گیا کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہ رہی۔ اب میں نے لوگوں کے گھر کی گھنٹی بجانا چھوڑ دی۔ اس کے بجائے اب لوگ میرے فون کی گھنٹی بجایا کرتے۔ میرے پیشہ ورانہ روّیئے اور کام کی تعریف کرتے اور اپنے کام کے لئے درخواست کرتے۔ اس وقت تک میرے پاس اپنی کوئی سواری نہ تھی اس لئے لوگ مجھے گھر سے لے جاتے اور واپس بھی چھوڑ جاتے۔ بعض اوقات اگر ایسا نہ ہوتا تو میں پیدل ہی کام پہ چلا جاتا۔ بعد میں ایک خاتون نے مجھے بائیسکل لے کر دی جس سے میرا آنا جانا آسان ہو گیا۔ یہ سب اللہ پاک کی رحمت سے ممکن ہوا جو اپنے بندوں پہ بڑا مہربان ہے اس نے اپنے وعدے کے مطابق مشکل کے بعد آسانی پیدا فرمادی۔

میرا کام آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا۔ میں نے اپنے جیسے دوسرے طالب علموں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کا سوچا جن کو مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ میں نے خود کو بطور ٹھیکے دار رجسٹر کروایا اور لائسنس حاصل کیا۔ وزیٹنگ کارڈ اور اشتہار بنوائے۔ اس اشتہار میں "گھریلو و کاروباری امور، ہر کام کے ماہر" جلی الفاظ میں چھپوایا۔ اس تمام کاوش کا اچھّا نتیجہ بر آمد ہوا اور میرے گاہکوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ اب میں نے گھنٹوں کے حساب سے کام کرنا چھوڑ دیا اور ٹھیکے کے حساب سے کام لینا شروع کر دیا۔ میں بیک وقت اپنی پڑھائی، نوکری اور کاروبار پہ توجہ دے رہا تھا۔ میرے معاشی حالات بہتری کی طرف مائل تھے۔ جلد ہی میں نے گھر پیسے بھجوانا شروع کر دیئے۔ تمام کاموں کے ساتھ ساتھ میں نماز باقاعدگی سے ادا کرتا اور قرآن پاک کی تلاوت کرتا، چاہے چند آیات ہی کیوں نہ

ہوں۔ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ میری کوئی نماز قضا نہ ہو۔

گناہ سے بچنے کا نسخہ

میری بیگم بشریٰ سلطانہ کے نانا ذیلدار اور کافی متموّل تھے۔ وہ بھی تنگل انبیاء کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے چوہدری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران مالی مدد کی تھی۔ اس وجہ سے وہ بشریٰ کے نانا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ دوسری طرف میں چوہدری محمد علی کی شخصیت سے متاثّر تھا۔ (وہ ان چند ایک راہنماؤں میں شامل ہیں جنھوں نے وزارت سے استعفیٰ دیا تھا ورنہ وطن عزیز میں استعفیٰ دینے کا رجحان بہت کم ہے) میں نے بشریٰ کے نانا جی سے درخواست کی کہ میری ان سے ملاقات کروا دیں۔

ایک مرتبہ جب میں پاکستان آیا تو انھوں نے میری ملاقات چوہدری محمد علی سے کراچی میں طے کروا دی۔ میں جب ان سے ملا تو پوچھا "آپ انگلینڈ جیسے ملک میں رہ کر آئے ہیں یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ شراب، جواء، جنسی معاملات و ترغیبات اور دیگر برائیوں سے خود کو بچا سکے جو اس معاشرے میں عام ہیں اور ان تک ہر کسی کی رسائی بے حد آسان ہے۔"

وہ کہنے لگے "بیٹا! اس کا حل بہت سادہ ہے آپ نماز باقاعدگی سے پڑھا کرو تمام بری چیزیں دور بھاگ جائیں گی۔ نماز پڑھنے سے اسلام آپ کے اندر در آئے گا جسے مغربی دنیا کی چکا چوند ہرگز متاثر نہ کر پائے گی۔"

چوہدری صاحب کی یہ نصیحت، جس کا میں پہلے سے ہی عامل تھا، سن کر میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اپنی نمازوں کا بے حد خیال رکھوں گا اور ہمیشہ وقت پہ ادا کروں گا۔

آنے والے وقت میں بہت سی مشکلات اور امتحان مجھ پہ وارد ہوئے لیکن

اللہ تعالیٰ کے کرم سے کسی چیز کو خود پہ حاوی نہ ہونے دیا اور مشکلات پر قابو پا لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک شخص نماز باقاعدگی سے ادا کرتا رہے تو برائیاں اس کے قریب بھی نہیں آئیں گی۔ قدرتی طور پر اس کے آس پاس ایسے لوگ ہوں گے جو نیک فطرت ہوں گے اور اس کو اچھائی کی طرف مائل ہونے میں مدد کریں گے۔

درحقیقت انسانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اچھّائی یا برائی میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کریں۔ اپنی روزمرہ زندگی میں ہمیں کئی بار اس انتخاب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم روزانہ کی بنیاد پر اچھّے راستوں کا انتخاب کریں اور ایسا کرنا مستقل جاری رکھیں تو بالآخر ہماری پہچان اچھائی ہوگی جو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اور لافانی چیز ہے کیوں کہ اس کا تعلّق انسانوں کو زمین پر بسّانے والے رب سے جڑتا ہے۔

اگر ہم برائی کے راستے کا انتخاب کریں تو یہ انتخاب یکے بعد دیگرے اور ایک دوسرے سے جڑی تخریب کا باعث بنتا ہے۔ اس کا حتمی سرا شیطان سے جاملتا ہے۔ جس کا بالآخر نتیجہ دنیا میں فساد اور تباہی و بربادی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

خیر نماز تو میں پہلے سے ہی پڑھتا تھا لیکن اس کے بعد میرے ذوق و شوق میں اضافہ ہو گیا۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسش نماز بود
زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

(شیخ سعدی)

ایک دلچسپ واقعہ

جب میرے حالات کچھ بہتر ہوئے تو میں نے دو سو امریکی ڈالر ($200) میں

ایک پرانی کار خرید لی جو 1947ء کا ماڈل تھی۔ اس حوالے سے ایک انتہائی دلچسپ واقعہ مجھے یاد آرہا ہے جو میں آپ تک پہنچانا چاہوں گا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب مجھے امریکہ آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ میری انگریزی بس واجبی سی تھی۔ مجھے ایک پارٹی میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ دعوت اپنے پاکستانی لوگوں نے دی ہے تو کیوں نہ اپنے وطن کی یادوں کو تازہ کر لیا جائے۔ اسی غرض سے میں چلا گیا۔ اس پارٹی میں سب پاکستانی اور ہندوستانی تھے لیکن تمام لوگ اپنے مغربی ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش میں تھے۔ وہ سب کچھ کر رہے تھے جو اپنے آبائی ملک اور لوگوں کے درمیان کھلے عام نہیں کر سکتے تھے۔ میں مسکرا کے ہر کسی کو انکار کرتا رہا اور اپنے تئیں ہوشیار رہا حتّٰی کہ میں نے پانی اور سنگترے کا جوس بھی دیکھ بھال کے پیا اور سیون اپ بھی وہ بوتل استعمال کی جو ابھی بند تھی۔

پارٹی آدھی رات کے بعد تک جاری رہی۔ اس کے بعد میں اپنی پرانی گاڑی میں گھر کی جانب روانہ ہوا۔ رات تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن تھی۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ امریکہ میں بائیں طرف گاڑی چلانا جرم ہے لیکن میں خیالوں میں ایسا کھویا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا اور گاڑی انتہائی بائیں لین میں آگئی۔

میں اس وقت چونکا جب پولیس کی ایک گاڑی ہوٹر بجاتی میرا پیچھا کر رہی تھی لیکن اس وقت تک مجھے دیر ہو چکی تھی۔ پولیس والے نے مجھے ایک طرف رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گاڑی ایک جانب روک لی۔ وہ اپنی کار سے اتر کے میرے پاس آیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا

''ایک پارٹی سے واپس آرہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا

اس نے چونک کر مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میری غلط سائیڈ پہ گاڑی چلانے کی وجہ سمجھ آگئی ہو۔

''کیا تم پیتے رہے؟'' اس نے پراسرار انداز میں مجھ سے پوچھا

''جی ہاں۔''میں نے سادگی سے اعتراف کیا۔

اس نے مجھے گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد سڑک پہ چاک سے ایک لکیر کھینچی اور مجھے اس پر چلنے کو کہا۔ اگرچہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن پھر بھی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ سکون سے لکیر پہ چلتا ہوا اس کے اختتام تک پہنچا۔ پولیس والے کے ماتھے پہ چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ اسے شاید امید نہ تھی کہ میں یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے کرلوں گا۔

''تم نے کتنی پی.....؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جی میں نے بغیر حساب کتاب کے پی۔'' میں نے کہا۔

مجھے جتنی اس کی بات کی سمجھ آئی میں نے اتنا ہی جواب دیا۔

اس نے دوبارہ سڑک پہ ایک لکیر کھینچی جو پہلے سے زیادہ لمبی اور آڑھی ترچھی تھی اور مجھے اس پہ چلنے کو کہا۔ میں اس پہ چلتا ہوا اس کے دوسرے سرے تک پہنچا۔ پولیس والے کی حالت دیکھنے والی تھی۔

مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ جب کہ پولیس والے کو بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں ایسا کیسے کر رہا ہوں؟ حقیقت میں ہم دونوں ہی پریشان تھے۔

''ٹھہرو! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا پیا تھا'' اس نے تنگ آکر کہا

''جی! میں نے پانی پیا تھا..... لیمن اسکوائش پیا..... اور ہاں..... سیون اپ بھی پی تھی.....عام تھی اس لئے بہت پی.....۔

پولیس والے نے ایک گہری سانس لی۔

''تم غلط سائیڈ پہ گاڑی کیوں چلا رہے تھے'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ دراصل میں کچھ عرصہ پہلے ہی پاکستان سے آیا ہوں جہاں پہ ٹریفک بائیں جانب چلتی ہے۔ آج ڈرائیونگ کرتے ہوئے مجھے پتہ ہی نہ چلا اور گاڑی بے خیالی میں بائیں طرف آگئی۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے میری جاں بخشی کر دی کہ وہ میرا چالان نہیں کرے گا لیکن میں آئندہ خیال رکھوں۔

ڈگری کا حصول

میں نے اگرچہ پاکستان میں گریجوایشن کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ پاکستان سے حاصل کردہ ڈگری یہاں پہ تب تک کارآمد تصوّر نہیں کی جائے گی جب تک چند مزید یونٹ نہ لے لوں۔ اس لئے مجھے امریکہ سے گریجوایشن کی ڈگری کے لئے امریکی نظامِ تعلیم کے مطابق مزید مضامین کے یونٹ لینے پڑے۔ میں اپنے ساتھ اپنی تعلیمی اسناد وغیرہ لے کر گیا تھا ان کی وجہ سے مجھے اتنی رعایت دے دی گئی کہ میں نے کیلی فورنیا سٹیٹ کالج سے چار سال کے بجائے دو سال میں ہی گریجوایشن کی ڈگری حاصل کر لی۔

میں اپنا چھوٹا موٹا کاروبار اور نوکری تو کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ میں کسی باعزّت وسیلۂ روزگار کی تلاش میں تھا۔ اب میرے پاس امریکہ سے حاصل کردہ گریجوایشن کی ڈگری تھی۔ میں نے اپنے موجودہ کام اور مصروفیات کو جاری رکھتے ہوئے اچھی نوکری تلاش کرنا شروع کر دی۔ میرے پاس جب کچھ فارغ وقت ہوتا تو میں مختلف کمپنیوں میں نوکری کے لئے درخواستیں جمع کراتا پھرتا۔ کئی مرتبہ صبح سے شام تک پورا دن یہی کام کرتا یہاں تک کہ تھکن سے چور ہو جاتا۔

باعزّت نوکری کی تلاش

میں نے متعدد اچھے اداروں اور چھوٹی بڑی کمپنیوں میں نوکری کے لئے درخواست بھجوائی، خود بھی جا کے ملا مگر کہیں سے حوصلہ افزا جواب نہ آیا۔ میری گندمی رنگت آڑے آ رہی تھی۔ سفید فام لوگ تیسری دنیا کے رہنے والے، گہری رنگت کے حامل فرد کو اچھی پوسٹ دینے سے گریزاں تھے۔ یہ وہ عمومی تعصّب ہے جو ساری دنیا میں انسان، انسان کے خلاف اپنے دل میں رکھتا ہے۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ ان تمام مسائل کے باوجود میں نے کوشش جاری رکھی۔ ایسی رکاوٹیں تو ظاہر ہے آنی ہی تھیں۔

"زندگی پھولوں کی سیج بہر حال نہیں" میں نے سوچا۔

میں نے معمول کے مطابق مشہور امریکن فرم "براڈوے" (Broad Way) میں رابطہ کیا۔ میں اس فرم کے ہیومن ریسورس میں پہلے جا چکا تھا جہاں کی انچارج ایک خاتون تھی جس نے مجھے گھاس تک نہ ڈالی تھی۔ خوش قسمتی سے میری کال مسٹر ایرن (Mr. Ahern) نے ریسیو کی جو اس فرم کے علاقائی سربراہ تھے۔ میں نے جو کہنا تھا وہ ایک کاغذ پہ لکھ رکھا تھا اور اس کو اتنی دفعہ پڑھ کے سنا چکا تھا کہ اب زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میں ان کی طرف سے ہیلو سنتے ہی شروع ہو گیا۔

"ہیلو سر! میرا نام صغیر اسلم ہے۔ میں نے سیکرامینٹو سٹیٹ کالج (California Sacramento State College) سے گریجوایشن کی ہے۔ میں تجربہ حاصل کرنے کی خاطر آپ کی فرم میں کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ واپس جا کے اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ میں آپ سے کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں لوں گا بلکہ میں اس کے لئے فیس تک ادا کرنے کو تیار ہوں..... میں نے ایک ہی سانس میں سارا کچھ کہہ دیا۔

مسٹر ایرن نے میری بات کو دلچسپی سے سنا اور اگلے دن "براڈوے" آنے کو کہا۔

براڈوے میں انٹرویو

میں اگلے دن مسٹر ایرن کے پاس براڈوے پہنچ گیا۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں پہ آچکا تھا اور تب ایچ۔ آر مینیجر نے بڑے روکھے لہجے میں مطلع کیا تھا کہ ان کے پاس کوئی خالی آسامی موجود نہیں۔

میں مسٹر ایرن کے پاس پہنچا تو انھوں نے بڑے اچھے انداز میں خوش آمدید کہا۔ میں نے اپنی ساری رام کہانی مسٹر ایرن کو سنائی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں پہلے بھی یہاں آیا تھا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی تھی۔ مسٹر ایرن نے خاتون ایچ۔ آر مینیجر کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ اس خاتون نے مجھے پہچان لیا اور میری وہاں موجودگی پہ ناک بھوں چڑھائی۔ مسٹر ایرن اس خاتون سے مخاطب ہوئے۔

"یہ مسٹر صغیر اسلم ہے اور کیلی فورنیا سٹیٹ کالج سے گریجوایٹ ہے۔ اچھی انگلش بول لیتا ہے۔ کیوں نہ ہم اسے سیلز مین رکھ لیں؟"

خاتون نے ناگواری سے انکار میں سر ہلایا۔

"نہیں! اس کی انگلش اچھی نہیں ہم اسے سیلز مین نہیں رکھ سکتے۔"

مسٹر ایرن نے میری طرف دیکھا۔

"یہ لڑکا بولنے کے فن سے واقف ہے ہم اسے ایک چانس دے سکتے ہیں۔"

ہیومن ریسورس انچارج نے پھر انکار کیا۔ مسٹر ایرن ایک ذہین اور معاملہ فہم انسان تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ خاتون نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے لہٰذا انھوں نے مجھے سیلز مین کے بجائے چپڑاسی (Stock Boy) رکھنے کی تجویز پیش کی جو خاتون نے تھوڑی ردّو قدح کے بعد مان لی۔

ناقابل یقین دعویٰ

براڈوے ایک بہت بڑی فرم تھی جو میرے لئے کامیابی کا ایک زینہ بن سکتی تھی۔ مجھے اللہ تعالیٰ پہ پورا بھروسہ تھا۔ اس کے ساتھ میں اپنی صلاحیتوں کے بارے پر یقین تھا لہٰذا میں نے اس کم تر درجے کی نوکری کو بھی قبول کرنے کا ذہن بنا لیا اور ان لوگوں کے سامنے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ خاتون کے رویّے سے مجھے اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی لیکن میں برداشت کرنے پہ مجبور تھا۔

میں جب مسٹر ایرن کے دفتر سے باہر نکلا تو چند قدم دور جا کے واپس پلٹا۔ میں نے مسٹر ایرن کے دفتر کے دروازے پر دستک دی، اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ مسٹر ایرن مجھے دوبارہ اپنے آفس میں دیکھ کر تھوڑے حیران ہوئے۔ میں خود بھی حیران تھا نجانے کون سی قوّت مجھ سے یہ سارا کچھ کروا رہی تھی؟ مسٹر ایرن نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا

"اب کیا چاہیے؟"

"مسٹر ایرن" ! میری آواز تھوڑی بلند ہو گئی.....

"آپ کا شکریہ، آپ نے مجھے موقع دیا مگر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ "میں آپ کا اگلا منیجر ہوں گا۔"

میں یہ کہہ کر باہر آ گیا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مسٹر ایرن نے میرے باہر نکلتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس لطیفے میں دوسروں کو بھی شریک کیا ہو کہ ایک بیوقوف لڑکا جسے بڑی مشکل سے چپڑاسی کی نوکری ملی ہے..... اتنا بڑا دعویٰ کر کے ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔

مجھے لگتا ہے یہ میرے اندر کا ایمان اور یقین تھا جس نے یہ بات کہنے پہ مجبور کیا ورنہ میں کوئی بڑا بول بولنے والا نہ تھا۔ مجھے اپنے ربّ کی عطا کردہ صلاحیتوں پہ پورا

بھروسہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب خدا مجھے سرخرو فرمائے گا۔ سٹاک بوائے یا چپڑاسی تو میرے لئے پہلا زینہ تھا۔ کوئی بھی کام بذات خود چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ انسان اگر محنت کرے اور صحیح وقت پہ درست سمت میں قدم بڑھائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی بشرطیکہ نیّت صاف ہو۔ دنیا کے ذہین ترین انسان اور اللہ کے آخری پیغمبر، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اعمال کا دارومدار نیّتوں پر ہے۔"

اگر غوروفکر اور تدبّر سے کام لیا جائے تو یہی ایک قول انسان کی زندگی سنوارنے کو کافی ہے۔ باقی جو چاہے اللہ.....۔

براڈوے

اگلے دن سے میں نے براڈوے جوائن کر لیا۔ میری ذمہ داری میں صفائی، سٹور کی دیکھ بھال اور سٹور میں موجود چاندی کے برتنوں (ٹی سیٹ، ٹرے، پھولدان) وغیرہ کو پالش کرنا شامل تھا۔ امریکی لیبر قوانین کے مطابق ڈیوٹی کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہفتے میں پانچ دن کام ہوتا تھا اور دو دن چھٹی تھی۔ ڈیوٹی کا وقت آٹھ گھنٹے مقرر تھا۔ کام کے دوران ہر دو گھنٹے کے بعد دس منٹ کا وقفہ ہوتا۔ دوپہر کو ایک گھنٹے کا وقفہ کھانے کے لئے دیا جاتا۔

مسٹر ایرن کی خفگی

میرا طریقہ کار یہ تھا کہ میں صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پہ پہنچ جاتا حالانکہ ڈیوٹی دس بجے شروع ہوتی اور شام کو چھ بجے چھٹی کرنے کے بجائے رات کو نو بجے تک کام کرتا رہتا یہاں تک کہ سٹور بند کرنے کا وقت ہو جاتا۔ اس کے علاوہ نہ تو دس منٹ کا وقفہ لیتا اور نہ ہی کھانے کے لئے ایک گھنٹے کا، بلکہ ایک سینڈوچ گھر سے بنا کے لے جاتا اور کام کے دوران وہ کھا لیتا یہی میرا دوپہر کا کھانا تھا۔ یہ معمول کچھ عرصہ جاری رہا۔

ایچ۔ آر منیجر کی مجھ پہ کڑی نظر تھی۔ وہ میرے خلاف کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے میرے معمول کی شکایت مسٹر ایرن کو کر دی۔ مسٹر ایرن نے مجھے بلا بھیجا۔ میں جب ان کے دفتر میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ خاتون منیجر وہاں موجود تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اسی نے کچھ کہا ہو گا۔

"یہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے..... ۔" میں نے خفگی سے سوچا۔

مسٹر ایرن نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور شفقت سے بولے: "بیٹا! کیا تم جانتے ہو.....؟ امریکی لیبر قوانین کے مطابق ہفتے میں پانچ دن کام اور دو دن چھٹی ہوتی ہے۔ ڈیوٹی کے دوران لنچ کے لئے ایک گھنٹہ اور دو گھنٹے بعد دس منٹ کا وقفہ لینا یا دینا ضروری ہے۔ ان اوقات کار کی پابندی ادارے اور ملازم دونوں کے لئے قانونی طور پر لازم ہے، سمجھ گئے؟

(مسٹر ایرن نے شروع دن سے ہی مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے بعد ہمیشہ بیٹا ہی کہا) ۔

میں نے ان کی بات سن کر سر ہلایا اور کہا کہ جی سمجھ گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ میرے اس طرز عمل سے براڈوے کیلئے قانونی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے امید ہے کہ میں آئندہ ایسے نہیں کروں گا۔

انھوں نے کافی دیر سمجھانے کے بعد پوچھا "سمجھ گئے..... ؟" تو میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "جی ہاں سمجھ گیا۔"

دوسرے دن میں اپنے معمول کے مطابق صبح آٹھ بجے ہی "براڈوے" پہنچ گیا اور کام شروع کر دیا۔ کسی دیکھنے والے کو میرے معمول میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی تھی..... گویا نہیں "سمجھا" تھا اور مسٹر ایرن کی بات ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دی تھی۔

مسٹر ایرن کو اپنے دفتر تک پہنچنے کے لئے میرے پاس سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب وہ اپنے دفتر جانے کے لئے میرے پاس سے گزرے تو ان کی نظر مجھ پہ پڑی پھر فوراً انھوں نے گھڑی پہ نظر ڈالی۔ مجھے ان کے چہرے پہ غصّہ اور ناگواری نظر آئی۔ وہ فوراً وہاں سے ٹائم آفس پہنچے اور میری آمدورفت کے اوقات کار معلوم کئے۔ وہاں پہ میں نے اپنی آمد کا وقت دس بجے لکھا تھا۔ ان کا غصہ فوراً دور ہو گیا۔ جب وہ دفتر جانے کے لئے میرے پاس سے گزرے تو میں نے ان کے چہرے پہ اطمینان اور بشّاشت دیکھی۔

دراصل جب مسٹر ایرن نے مجھے اپنے آفس بلا کے بات کی تھی تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تحفّظات کا شکار ہیں کہ میں اتنا زیادہ کام کر رہا ہوں تو یہ دفتری ریکارڈ کا حصّہ بن رہا ہے۔ ملازم سے اتنا زیادہ کام قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ مزید یہ کہ اگر میں چاہتا تو بعد میں قانونی طریقے سے اوور ٹائم کے پیسے لے سکتا تھا۔

میں اس قانون سے نابلد نہیں تھا۔ میں ان کے اٹھائے گئے نکتے کو سمجھ گیا تھا۔ اس لئے صرف آمدورفت کے اوقات کے اندراج میں تبدیلی کی اور بات سلجھالی۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جاتا یا محنت کرنا بند کر دیتا۔ مجھے جلد از جلد کام سیکھ کر آگے بڑھنا تھا۔ مجھے مہارت حاصل کرنے کے لئے زیادہ کام کرنے کی ضرورت تھی تا کہ ترقی کر سکوں۔ جو دعویٰ میں نے مسٹر ایرن کے سامنے کیا تھا کہ ”میں براڈوے کا منیجر بنوں گا“ ابھی وہ سچ ثابت ہونا تھا۔

پتہ نہیں میرے اندر کیسے طوفان پوشیدہ ہیں جو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ میں اپنے مقرّرہ اوقات سے کہیں زیادہ کام کر رہا تھا تا کہ میں کام میں جلد از جلد مہارت حاصل کر سکوں ایسا کرنا میرے لئے ایک آسان بات تھی۔ اگرچہ معاوضہ مجھے مقرر کردہ اوقات کا ہی مل رہا تھا۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ اگر آج محنت کروں گا تو کل پھل ملے گا۔ محنت ہی مجھے اس مقام تک پہنچا سکتی ہے جہاں پہ میرے والدین مجھے دیکھنے کے تمنّائی ہیں۔

کامیابی کا سفر

میں براڈوے کے جس شعبے میں کام کر رہا تھا اس کا نام ہاؤس ویئر(House ware) تھا۔ براڈوے کی انتظامیہ نے میری محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے جلد ہی مجھے سیلز کلرک ٹرینی بنا کے کھلونوں کے شعبے میں بھجوا دیا۔

کھلونوں کا شعبہ کرسمس کے زمانے میں بہت مصروف ہوتا ہے۔ اس کی نومبر دسمبر میں ہونے والی سیل باقی دس مہینوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے جب اس شعبے میں بھیجا گیا تو اس وقت کرسمس کی سیل شروع ہو چکی تھی۔ ان دنوں میں رش کا ہونا ایک عام بات ہے اس موقع پر ہر کوئی جلدی میں ہوتا ہے اور صبر کی کمی ہوتی ہے۔ سیلز مین کے لئے محض اتنا کافی نہیں کہ وہ گاہک کو اس کی مطلوبہ چیز تھما دے بلکہ گاہک کو مطمئن کر کے واپس بھیجنا اصل کامیابی ہوتی ہے۔

میں نے ہر شعبہ میں کام کیا مثلاً گاہک کو خوش آمدید کہنا، خریداری میں اس کی معاونت کرنا اور اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرنا کہ وہ کبھی نہ بھولے۔ وہاں پہ میں نے دو ماہ کام کیا اور بطور سیلز مین ترقی حاصل کی۔ کرسمس گزرتے ہی کھلونوں کے شعبے میں سناٹا چھا گیا۔ خریدار خال خال نظر آتے۔

دوسری طرف ہوم فرنشنگ (Home Furnishing) میں خریداروں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ اس شعبے میں ہر سال جنوری میں سیل لگا کرتی تھی جس کا نام جنوری وائٹ سیل (January White Sale) تھا۔ اس ماہ میں ہونے والی سیل عام دنوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوتی تھی۔ اس سیل میں لگنے والی چیزیں بے شمار تھیں۔ ان چیزوں کو سیل میں لگانا ہی ایک بڑا کام تھا اور اس میں کافی وقت لگتا تھا۔ جنوری سر پہ آ پہنچا تھا۔

انتظامیہ نے خیال کیا کہ صغیر اسلم نے چونکہ کھلونوں کے شعبے میں سیل کے

دوران اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے لہٰذا اس دباؤ کے موقع پر اسے ہوم فرنشنگ میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مجھے کھلونوں سے ہوم فرنشنگ میں بھیج دیا گیا۔ میں نے کام کرنا تھا چاہے جس شعبے میں کیا جائے لہٰذا میں نے اس تبدیلی کو خوش دلی سے قبول کیا۔

ہوم فرنشنگ میں میٹریس، چادریں، تکیے، بستر کی چادریں، بیوٹی ریسٹ میٹریس (Beauty Rest Mattress) اور تولیے وغیرہ فروخت کئے جاتے تھے۔ اس میں بیوٹی ریسٹ میٹریس ایک ایسا گدا تھا جس کا ثانی اس وقت تک مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ اس بیوٹی ریسٹ میٹریس میں ایک ہزار سے زائد سپرنگ لگے تھے۔ ہر سپرنگ انفرادی حیثیت میں کام کرتا تھا جس سے جسم کے مختلف حصوں کو ناقابل بیان راحت اور سکون محسوس ہوتا۔

میں نے اس سیل کے دوران بیوٹی ریسٹ میٹریس کی کمپنی کی جانب سے سب سے زیادہ سیل کرنے پر انعام حاصل کیا۔ براڈوے سٹور کی طرف سے بھی اچھی سیل کرنے پر مجھے انعام دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ہاؤس وئیر کے شعبے میں واپس بھیج دیا گیا۔

بطور بلیو پنسل ترقی

ہاؤس وئیر ڈیپارٹمنٹ میں چینی کے برتن (China Serving Dishes)، کچن میں استعمال ہونے والے برتن (Kitchen pots & pans) اور کچن کے استعمال کی دیگر اشیاء شامل تھیں۔ مجھے بطور سیلز کلرک ہاؤس وئیر کے شعبے میں بھیجا گیا۔ وہاں جانے کے بعد سیل اتنی بڑھ گئی کہ کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے بلیو پنسل (Blue Pencil) بنا دیا گیا۔ بلیو پنسل سیلز کے تمام لوگوں کا انچارج ہوتا ہے۔ اب میں سیلز کے لوگوں کی نگرانی کرتا اور ہجوم کے اوقات میں ان کی مدد کرتا۔ اگر گاہکوں کو مدد کی ضرورت ہوتی تو ان کی مدد کرتا۔

براڈوے میں پہلے دن سے میرا معمول تھا کہ میں چھٹی نہیں کرتا تھا۔ ہفتے کے

ساتوں دن کام کرتا۔ کام کے دوران کھانے اور چائے کا وقفہ کرتا نہ دس منٹ کی بریک لیتا۔ صبح آٹھ بجے سے رات نو بجے تک مسلسل کام کرتا یہاں تک کہ سٹور بند کرنے کا وقت ہو جاتا۔ چوکیدار مجھے آواز دے کر کہتا کہ وہ اب گیٹ بند کرنے لگا ہے میں باہر آ جاؤں۔ کبھی کبھار مجھے کہتا کہ یار آپ خود باہر آ جایا کرو ایسا نہ ہو کہ میں غلطی سے آپ کو اندر بند کر کے چلا جاؤں۔

تاریخی ذمّہ داری کا ملنا

براڈوے کی انتظامیہ میرے کام سے بہت مطمئن تھی۔ ان کو اندازہ ہو چلا تھا کہ میں اپنے اندر ایک بے چین روح رکھتا ہوں اور کام کرنے سے مجھے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ انھوں نے مجھے ترقی دینے کا فیصلہ کیا۔ اب کی بار جو عہدہ چنا گیا وہ اسسٹنٹ مینجر کا تھا۔

براڈوے انتظامیہ نے مضافاتی علاقے ایڈن فیئر (Arden fare) میں ایک نیا سٹور کھولا۔ ہمارا پہلا سٹور ڈاؤن ٹاؤن (Down Town) میں تھا۔ نیا کھلنے والا سٹور ڈاؤن ٹاؤن سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ نئے سٹور کو کچھ عرصے بعد میری نگرانی میں دے دیا گیا۔ یہ ایک اعزاز تھا کہ میں بیک وقت دو سٹور اپنی عملداری میں چلا رہا تھا۔ براڈوے کی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک آدمی کو دو سٹوروں کی ذمہ داری دی جائے۔ مجھے دن میں کئی مرتبہ ان دونوں سٹوروں کے درمیان چکر لگانا پڑتا۔

پیٹ کے بجائے عزّت کی فکر

میرے سپر وائزر کا نام اینڈی کاپک (Andy Copec) تھا۔ وہی میری ذمہ داریوں کا تعیّن کرتا اور میری کارکردگی پہ نظر رکھتا۔ اینڈی کاپک اس بات کا فیصلہ کرتا کہ کون سے سٹور پہ میری ضرورت ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن میں یا ایڈن فیئر میں۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ایڈن فیئر میں تھا جبکہ اینڈی کاپک ڈاؤن ٹاؤن میں موجود تھا۔ دونوں جگہوں پہ سیل کا دن تھا۔

ایڈن فیئر میں واقع سٹور پہ سیل لگانا میری ذمہ داری تھی۔ اس لئے میں صبح سویرے سٹور پہ پہنچ گیا اور کام شروع کر دیا۔ سٹور روم تہہ خانے میں تھا۔ سامان لانے کے لئے کئی دفعہ مجھے نیچے کا چکر لگانا پڑا۔ شاید اس دوران اینڈی کاپک نے مجھے فون کیا لیکن ظاہر ہے کہ میں فون کے پاس موجود نہ تھا اس لئے کال وصول نہ کر سکا۔ میں نے جب سیل لگالی تو میں نے اینڈی کاپک کو فون کیا تا کہ اسے خوش خبری سناؤں کہ میں وقت سے پہلے ہی سیل سیٹ کر چکا ہوں لیکن اس سے بات نہ ہو سکی کیوں کہ اس کا نمبر مصروف جا رہا تھا۔ ایسا چند مرتبہ ہوا کہ میں نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ ہو سکی۔ کافی دیر کے بعد جب ہمارا رابطہ ہوا تو وہ مجھ پہ گرم ہو گیا۔

"کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ آج تم نے سیل سیٹ کرنی ہے میں تمہیں کب سے فون کر رہا ہوں لیکن تم سٹور میں موجود ہی نہ تھے۔ اگر ہوتے تو فون اٹھاتے۔"

میں نے کہا "جناب میں کام میں مصروف تھا اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں سیل سیٹ کر چکا ہوں۔"

اس نے یک دم کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو اگر تم سٹور میں ہوتے تو کم از کم فون کی گھنٹی تو سنائی دیتی۔"

میں نے کہا "جناب! ہو سکتا ہے جس وقت آپ نے فون کیا ہو اس وقت میں نیچے سٹور میں ہوں۔"

اس نے پھر وہی ہرزہ سرائی کی "تم جھوٹ بول رہے ہو تم سٹور میں موجود نہ تھے۔"

اس کی بلاوجہ الزام تراشی سن کر میرا پارہ چڑھ گیا کیوں کہ میں اپنا کام کر چکا تھا لیکن وہ

میری بات پہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا اور مسلسل اپنا ہی راگ الاپے جاتا تھا۔ میں نے تنگ آکر کہا

"بس مسٹر کاپک! بہت ہوگئی میں ابھی جا کے مسٹر ایرن سے بات کرتا ہوں کہ آپ نے میری توہین کی ہے۔ میں استعفیٰ دینے جارہا ہوں اب میں آپ کے ماتحت کام نہیں کروں گا۔"

جب میں ایڈن فیئر سے ڈاون ٹاؤن مسٹر ایرن کے دفتر پہنچا تو اینڈی کاپک کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ براڈوے کے لئے اینڈی کاپک ایک اچھا اور قابل منیجر تھا۔ اگرچہ یہ نوکری میرے لئے بہت ضروری تھی مگر!

جوہر زندگی ہے عشق
جوہر عشق ہے خودی

(علاّمہ اقبالؒ)

میں اپنی خودی بیچ کے اپنے پیٹ کا ایندھن نہیں بھر سکتا تھا۔ میری روزی جس کے ہاتھ تھی اسے میری خودی کا خوب خیال رہتا تھا اور ہے۔ مسٹر ایرن نے مجھ سے پوچھا "کیا بات ہے"؟ میں نے بتایا "دیکھیں سر میرے سپر وائیزر اینڈی کاپک کا روّیہ میرے ساتھ بہت توہین آمیز ہے جو میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میں ان کے ساتھ آئندہ کام نہیں کرسکتا۔ انھوں نے نہ صرف میری بے عزّتی کی ہے بلکہ میرے خاندان، میرے ملک اور میرے مذہب کی بھی توہین کی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا مسٹر ایرن! کہ انھوں نے براڈوے کی بے عزّتی کی ہے۔" میں جذبات کے عالم میں کہے گیا

"جناب والا! یہ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں برتنوں کے بھاری کارٹن سر پہ اٹھا کے نیچے لایا کروں اور لفٹ کا انتظار نہ کیا کروں کیونکہ ان کے خیال میں لفٹ کا انتظار کرنے سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بھاری کارٹن اٹھا کے چار منزل نیچے

لانا کوئی آسان کام نہیں۔"

مسٹر ایرن یہ سن کر بھونچکا رہ گئے "کیا واقعی؟ لیکن وہ کارٹن تو بہت بھاری ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی سر! یہ کام میں کئی مہینوں سے کر رہا ہوں اور کبھی اف تک نہیں کی کیونکہ اس نوکری کی مجھے سخت ضرورت ہے لیکن سب سے قابل اعتراض بات یہ ہے کہ یہ مجھے جھوٹا کہتے ہیں حالانکہ میں سچ کہہ رہا ہوتا ہوں۔ یہ مسلسل میری عزت نفس کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا اس لئے آپ مجھے کسی اور جگہ بھجوا دیں۔"

مسٹر ایرن نے میرے مؤقّف کو درست جانا تو انھوں نے مجھے ہاؤس ویئر سے ہوم ڈیکوریٹنگ (Home Decorating) میں بھیج دیا۔

گھریلو اشیاء کی سجاوٹ کے شعبے میں میرے سپروائزر کا نام جارج گڈ مین (Georg Good Man) تھا۔ جارج گڈ مین واقعی ایک "اچھا آدمی" تھا۔ وہ میری بات سنتا اور سمجھتا تھا۔ اس نے بہت جلد مجھ پہ اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو ذمّہ داری مجھے دے گا اس کو میں اچھے طریقے سے نبھاؤں گا۔ اس نے مجھے فروخت کے علاوہ دوسری ذمہ داریاں بھی دینا شروع کر دیں جو میں خوشدلی سے قبول کرتا۔ میری کوشش ہوتی کہ میں جارج گڈ مین کی توقع سے بڑھ کر نتائج دوں۔

خطرہ مول لینا

میں اس وقت ڈیپارٹمنٹ منیجر اور اسسٹنٹ بائیر کے طور پر اپنی ذمّہ داری ادا کر رہا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنے کام کے طریقۂ کار میں جدّت لائی جائے۔ میں نے اس کے لئے غیر روایتی اور کسی حد تک خطرناک راستے پر بھی چلنے سے گریز نہ کیا۔

ایک مرتبہ ہم نے ڈریپری ڈیپارٹمنٹ (Drapery Department) میں

سیل لگائی تھی۔ عام طور پر جب سیل لگائی جاتی ہے تو قیمتوں کے پرانے ٹیگ اتار کر نئی خوبصورت قسم کی چیٹیں لگا دی جاتی ہیں۔ جو سامان فروخت کرنا مقصود ہو اس کے چند نمونے نمایاں طور پر سامنے رکھ دیئے جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے عملے کے لوگوں سے مل کر اپنے تمام سٹاک کو باہر ایک جگہ ڈھیر کر دیا۔ جلد ہی ہمارا ڈیپارٹمنٹ خوبصورت نظر آنے کے بجائے ایک بھدّے وئیر ہاؤس کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہ براڈوے، متعلقہ ڈیپارٹمنٹ بلکہ اس پیشے کے اصولوں کی کھلی خلاف ورزی تھی۔

جلد ہی سٹور منیجر مسٹر جیکسن(Mr Jackson) کی سیکرٹری غصّے میں بھری میرے پاس پہنچی اور مطلع کیا کہ مسٹر جیکسن بلا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کو بتا دیں میں آتا ہوں۔ میں یہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ میرے پاس پہنچی اور کہنے لگی ”مسٹر جیکسن بہت غصّے میں ہیں۔ میں نے انھیں اتنا غصّے میں کبھی نہیں دیکھا۔ مسٹر اسلم! آج آپ کی خیر نہیں وہ آپ کو دفتر بلا رہے ہیں۔“

میں اندر سے قدرے فکر مند ہوا۔ گویا معاملہ کافی گھمبیر تھا۔ اگر میرا یہ منصوبہ ناکام رہتا اور ہماری سیل اچھی نہ ہوتی تو میں براڈوے سے فارغ تھا۔ اس بات کا مجھے اچھی طرح ادراک ہو گیا۔

میں نے معتدل مزاجی سے جواب دیا کہ تھوڑا سا کام باقی ہے، مکمّل کر کے آتا ہوں۔

اسی اثناء میں ایک فوٹو گرافر وہاں آن پہنچا اور دھڑا دھڑ تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ میں سمجھ گیا میرے خلاف ثبوت اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا کوئی بات نہیں، جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے مسٹر جیکسن کو آتے دیکھا۔ ان کی حالت دیکھ کے ہی

اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ غصّے سے پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ میں تھوڑا پریشان ہو گیا۔ میں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ ان کو کیا جواب دوں گا کہ اسی لمحے بہت سے گاہک اندر داخل ہوئے۔ میں جب ان کی طرف متوجہ ہوا تو مسٹر جیکسن دوسری طرف چلے گئے۔ جلد ہی ہمارے شعبے میں گاہکوں کا تانتا بندھ گیا۔ کسی ملازم کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ اتنے گاہک آئے کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ سامان کے بڑے بڑے ڈھیر ختم ہونا شروع ہو گئے۔ شام ہوئی تو بہت کم سامان بچا تھا باقی سارا فروخت ہو گیا۔ اس دن اتنی مصروفیت رہی کہ مسٹر جیکسن سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔

مسٹر جیکسن کی سپیشل میٹنگ

دوسرے دن مسٹر جیکسن نے پورے سٹور کے ملازمین کی میٹنگ بلائی۔ اس میں سٹور کے تمام عہدے داران اور ملازمین شامل تھے۔ اس کا نام سپیشل میٹنگ رکھا گیا۔ اس کے نوٹس میں لکھا تھا کہ یہ بہت خاص میٹنگ ہے، تمام لوگ وقت پر پہنچیں۔

براڈوے یا اس جیسے سٹور تقریباً ڈیڑھ سے تین لاکھ مربع فٹ پر محیط ایک بہت بڑی عمارت پر مشتمل ہوتے ہیں اور یورپی ممالک میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ میں نے ابھی تک میٹرو کیش اینڈ کیری جتنا بڑا اسٹور ہی پاکستان میں دیکھا ہے اس پورے سٹور جتنا ہمارا ایک شعبہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد سینکڑوں میں ہوتی ہے۔ سب لوگ تجسّس کی حالت میں اس غیر معمولی میٹنگ میں پہنچے کیوں کہ اس سے قبل ایسی میٹنگ کبھی نہیں بلائی گئی تھی۔ جب سب لوگ آ چکے تو مسٹر جیکسن نے اٹھ کر کہا!

”آپ سب لوگوں کے آنے کا بہت بہت شکریہ! آپ کو یہاں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگوں کو چند دلچسپ اور تاریخی حقائق بتائے جائیں جو ہمارے سٹور سے متعلق ہیں۔ لیکن پہلے میں اس کے پس منظر پہ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پاکستان سے امریکہ

ایک شخص آیا جو یہاں کی زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اس کو اپنی تعلیمی و دیگر ضروریات کے لئے براڈوے میں معمولی کام کرنے پڑے یہاں تک کہ چپڑاسی جیسا کام بھی۔ جی ہاں! میں ذکر کر رہا ہوں صغیر احمد اسلم کا، جن کا تعلّق پاکستان سے ہے اور جن کو سٹاک بوائے بنا کر ہاؤس وئیر ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا گیا۔ وہاں پہ انھوں نے اپنے کام کے ساتھ ساتھ گاہکوں کو نمٹانا بھی شروع کر دیا حالانکہ یہ ان کی نوکری کا حصّہ نہیں تھا۔ یہ خدمت صغیر اسلم رضاکارانہ طور پر سرانجام دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ ایک دم سے سیل کئی گنا بڑھ گئی۔ یہ گاہکوں کے ساتھ بہت عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کا براہ راست اثر سیل پہ پڑتا ہے اس لئے انھوں نے بہت جلد ترقی حاصل کی۔ ایسا براڈوے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ کوئی شخص اتنی سرعت سے ترقی کر سکا۔ ابھی یہ ہمارے پاس ڈیپارٹمنٹ منیجر اور اسسٹنٹ بائیر کے طور پہ کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ ایک شخص چپڑاسی سے محض دو سال میں اس عہدے تک پہنچ جائے۔

اس سے بھی حیرت انگیز واقعہ کل رونما ہوا جب انھوں نے ڈیپارٹمنٹ کے تمام اصولوں کی خلاف ورزی کی ہم نے ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کئے اور انھیں نوکری سے نکالنے پہ تل گئے مگر کل اتنی زیادہ سیل ہوئی کہ ہم نے انھیں ایک ہزار ڈالر انعام اور انعامی سرٹیفکیٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

دادو تحسین کا غلغلہ (Voices of Appreciation) بلند ہوا۔ تمام لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کیں۔ وہ خالص امریکی انداز میں مجھے شاباش دے رہے تھے، میری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ میں نے عاجزی سے خالق کائنات کا تصوّر باندھا اور آس پاس سے بے نیاز ہو گیا۔ میرے جسم کے ایک ایک ذرّے نے مالک کی حمد و ثنا کی، اس کا شکر ادا کیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب میرے پاس اپنے چشمے کی مرمت کے پیسے بھی نہ تھے۔ کوئی ایسا ہمدرد اور رفیق نہ تھا جس سے مدد کی امید رکھتا اور اسے اپنا دکھ بتاتا۔ میری تو ساری امیدوں کا مرکز میرا رب تھا جو تمام تعریف کا اصل مستحق ہے۔

اگر وہ لوگ میری اس وقت تعریف کر رہے تھے تو یہ تعریف حقیقت میں اس کی ہو رہی تھی جس نے مجھے ایسا بنایا۔ جس نے مجھے اور تمام انسانوں اور زندگی کو تخلیق کیا۔ تمام کی تمام تعریف محض اس ہی کو سجتی ہے جو خوبی کا حقیقی وارث ہے اور وہ "خدا" ہے۔

میں چپکے چپکے روتا رہا۔ یہ اپنے ربّ کے حضور شکر گزاری کے لئے پیش کئے جانے والے آنسو تھے۔

ع کتھے مہر علی..... کتھے تیری ثناء

بہترین سودا

ایک مرتبہ جارج گڈمین نے مجھے "کشن" کی خریداری کی اہم ذمّہ داری سونپی۔ مجھے کہا کہ کسی کمپنی سے ایسا سودا طے کرو کہ وہ ہمیں ایک ڈالر تک کشن دے دیں تاکہ ہم ایک اعشاریہ ننانوے ڈالر ($1.99) میں بیچ سکیں۔ میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی کمپنیوں سے بات چیت شروع کر دی۔ میں نہیں جانتا کہ جارج نے یہ کام مجھے کیا سوچ کے دیا لیکن میں نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق خود کو اس کام کے لئے وقف کر دیا۔

مجھے بعد میں پتہ چلا جارج نے یہ سوچا تھا کہ اگر یہ سودا ایک ڈالر کے بجائے ڈیڑھ ڈالر تک بھی ہو جائے تو بھی ٹھیک ہے مگر جب میں نے اسے بتایا کہ میں یہ سودا پچاس سینٹ میں طے کر رہا ہوں تو وہ بوکھلا گیا۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نیویارک میں واقع ایک کمپنی برینٹ ووڈ (Brent Wood) کے ساتھ ایک ڈالر کے بجائے پچاس سینٹ میں کشن کا سودا طے کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کشن کا معیار بھی نہایت عمدہ تھا۔ یہ درحقیقت ایک ابھرتے ہوئے نوجوان منیجر کے لئے ایک اہم پیشہ ورانہ کامیابی تھی۔

میرے سپر وائزر جارج کو جب تفصیلات کا پتہ چلا تو وہ نہایت خوش ہوا۔ اس نے فون کر کے مسٹر ایرن کو اس سودے کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد یہ بات تمام براڈوے میں مشہور ہو گئی۔

اس کے بعد مجھے بائر منیجر کے عہدے تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ جو لوگ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حجم اور طریقۂ کار کے بارے میں جانتے ہیں ان کو بخوبی علم ہے کہ اس عہدے تک پہنچنا کتنی بڑی کامیابی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ممکن ہوا تھا کہ میں دو سال کے عرصے میں چپڑ اسی سے بائر منیجر کے عہدے تک پہنچا۔

کامیابی کا اہم ترین اصول

یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ میں جہاں بھی جاتا تھا تو ہر طرف سے انعام، ترقی، تعریف، حوصلہ افزائی.....؟ کیا میں اپنے قارئین کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش کر رہا ہوں.....؟..... نہیں..... یہ میری زندگی کی سچی کہانی ہے..... اس کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے..... دراصل سچ یہ ہے کہ میں کامیابی کے نسخے کو پا چکا تھا.....۔

میں کوشش کرتا تھا کہ میرا ہر کام دنیا کے سب سے بڑے لیڈر، کامیاب تاجر اور ذہین ترین انسان حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہو۔ ایک حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے تاجر کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی چیز فروخت کرتے وقت گاہک کو اس کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقائص بھی بیان کرے (مفہوم)۔ میں اسی حدیث اور اصول کے تحت اپنے گاہک سے معاملہ کرتا تھا اور اللہ پاک کا شکر ہے گاہک میرے اس رویّے کی وجہ سے مجھ پر بہت اعتماد کرتے۔ اگر میں کسی دوسرے گاہک کے ساتھ مصروف ہوتا تو وہ میرا انتظار کرتے یہاں تک کہ میں فارغ ہو جاتا۔ ان کا کہنا تھا "صغیر اسلم نہ صرف چیز کی خوبیاں بتاتا ہے بلکہ خامیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔" اور حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات اور تعلیمات ہمارے اپنے ہی

فائدے کے لئے ہیں لیکن ہم مسلمان عمل کرنا تو دور کی بات ہے غور وفکر تک نہیں کرتے۔ اسی لئے ادھر ادھر گرتے پڑتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے امریکہ جیسے ملک میں یہ توفیق بخشی کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرسکوں۔ میں آج جس مقام پہ ہوں اسی وجہ سے ہوں ورنہ میری کوئی اوقات اور حقیقت نہیں۔ اس راستے پر قدم مضبوطی سے جمانے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیشہ میرے شامل حال رہی۔ میں نے اسی کی بدولت ناقابل یقین سرعت سے کامیابی کے زینے طے کیے۔

بائر منیجر تعیناتی

شروع میں مجھے آرٹ نیڈل ورک (Art Needle Work) کا بائر منیجر بنایا گیا۔ جب وہاں کمپنی نے محسوس کیا کہ اسے فائدہ ہو رہا ہے تو انھوں نے مجھے فیبرکس کی ذمّہ داری بھی سونپ دی۔ رفتہ رفتہ مجھے نمونہ (Pattren)، ٹرمنگ (Trimming)، نوشنز (Notions) اور ایسیسریز (Accessories) کا بائر بھی بنا دیا گیا۔ بائر منیجر نہ صرف خریداری کرنے کا ذمّہ دار ہوتا ہے بلکہ اپنے پورے شعبے کا نظم ونسق اور انتظام بھی سنبھالتا ہے۔ میری نہ صرف ذمہ داریاں بڑھا دی گئیں بلکہ میری تنخواہ، کمیشن اور دیگر مراعات میں اضافہ کر دیا گیا۔

دباؤ میں درست فیصلہ

میں نیا نیا بائر منیجر بنا تھا۔ مسٹر گلیزر (Mr Glazor) کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ میرے سپروائزر تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے کوہاما فیبرکس (Cohama Fabrics) نامی کمپنی سے کچھ کپڑا خریدنا تھا۔ اس قسم کے کام عموماً سیلزمین کرتے ہیں لیکن ان کی طرف سے سیلز منیجر مسٹر بائرن کلارک (Byron Clarck) کو بھیجا گیا تھا جو

کہ خلاف معمول بات تھی۔ پھر اس کے بجائے کہ وہ ہمیں کپڑوں کے نمونے دکھانے دفتر میں آتے انھوں نے ہم سے درخواست کی کہ ہم ایک ہوٹل میں آ جائیں جہاں پہ کوئی شوروغل نہ ہو گا اور وہاں اطمینان سے بات ہو سکے گی۔ براڈوے کی طرف سے میں اور مسٹر گلیزر ہوٹل جا پہنچے۔

ہوٹل میں کپڑوں کے نمونے قدرے مختلف انداز میں دکھائے گئے۔ کپڑا دکھانے کے بجائے وہ خوبصورت لڑکیاں دکھائی گئیں جنھوں نے اس کپڑے سے بنالباس زیب تن کر رکھا تھا۔ یوں وہ کپڑا زیادہ دیدہ زیب نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں پہ کھانا اور شراب بھی وافر مقدار میں موجود تھی۔ کچھ ہی دیر میں مسٹر گلیزر مخمور ہو گئے یوں مجھے معمول سے زیادہ چوکنّا ہونا پڑا۔ میں نے اپنے اطراف میں گہری نظر رکھّی تھی اور سارے معاملے کو خوب سمجھ رہا تھا۔ جب آرڈر نوٹ کرانے کا وقت آیا تو مسٹر گلیزر نے آرڈر نوٹ کروایا جس کی مالیت لاکھوں ڈالر بنتی تھی اس کے بعد انھوں نے مجھے اس پر دستخط کرنے کو کہا۔ میں اس آرڈر پہ دستخط کر دیتا تو آخری مہر ثبت ہو جاتی مگر میں نے کہا ”جناب! میں ابھی دستخط نہیں کر سکتا میں صبح کپڑا دیکھنے کے بعد دستخط کروں گا۔“

مسٹر گلیزر نے اصرار کیا لیکن چونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں اس لئے میں نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ بائرن کلارک اور اس کے ساتھ لوگوں نے مجھے آرڈر پہ دستخط کرنے کے لئے بھرپور زور لگایا مگر میں نے انھیں کہا کہ آپ لوگ براہ مہربانی کل صبح کپڑوں کے نمونے لے کر براڈوے کے دفتر تشریف لے آئیں۔ باقی کام وہیں پہ ہو گا۔ میرے دستخط نہ کرنے کی وجہ سے آرڈر پاس نہ ہو سکا۔

دوسرے دن جب وہ کپڑے کے نمونے لے کر براڈوے آفس پہنچے تو ہم نے نمونے تسلّی سے جانچے۔ اس وقت یہ عقدہ کھلا کہ کپڑا اعلیٰ معیار کا نہ تھا۔ مسٹر گلیزر نے مجھے کہا: ”مسٹر اسلم! آپ نے بہت اچھا کیا اس وقت آرڈر پہ دستخط نہیں کئے ورنہ ہم

پھنس جاتے۔ لڑکیوں نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ تو بہت اچھے لگ رہے تھے مگر درحقیقت کپڑا اتنا اچھا نہیں۔"

اس واقعے نے میری ساکھ کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک سال کے دوران میں نے تین اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کئے۔ دیگر ملنے والے انعامات اس کے علاوہ تھے جو میری عمدہ کارکردگی اور ریکارڈ سیل کرنے پہ دیئے گئے۔ یہ براڈوے کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ فرد واحد یہ تمام اعزازات ایک ساتھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

یہ سب میرے پروردگار کا کرم تھا ورنہ میں کوئی خوبیوں کا مجموعہ نہ تھا۔ بڑی کمپنیوں میں ملازمین اپنی کارکردگی پہ معاوضہ اور ترقی حاصل کرتے ہیں۔ میرا کمیشن، تنخواہ سے کئی گنا بڑھ گیا کیونکہ معاہدے کے مطابق میری تنخواہ تو مقرر تھی مگر اس کے ساتھ سیل کرنے کا کمیشن ملتا تھا۔ جوں جوں میری سیل بڑھتی گئی، اسی حساب سے کمیشن بڑھتا گیا۔

براڈوے انتظامیہ نے ریاست (Navada) کے رینو (Reno) نامی شہر میں نیا سٹور کھولا۔ یہ سٹور بناتے وقت ہم نے اپنے تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس میں نئے خیال عملی طور پر متعارف کرائے۔ یہ ایک مثالی سٹور کے طور پہ سامنے آیا۔

مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر (Adward W Carter)

لاس اینجلس سے براڈوے کے چیف ایگزیکٹو آفیسر مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر کو اس نئے سٹور کا افتتاح کرنے کی غرض سے بلایا گیا۔ انھیں وہاں مثالی نظم و نسق کے علاوہ اعلیٰ درجے کی صفائی و خوبصورتی نظر آئی تو وہ بے حد متاثر ہوئے۔ انھیں بتایا گیا کہ اس سٹور کی تزئین و آرائش میں صغیر اسلم کا بڑا ہاتھ ہے۔ مسٹر کارٹر نے جب میری تعریف کی تو میں نے بتایا کہ یہ میرا کمال نہیں، بلکہ یہ کارنامہ میرے عملے کے تمام لوگوں کا ہے جنہوں نے

اتنی محنت سے کام کیا ہے۔ مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر نے مجھے پیشکش کی میں لاس اینجلس میں ان کے ساتھ کام کروں۔ انھوں نے کہا کہ وہ مجھے یہاں سے بڑا عہدہ دیں گے اور میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اچھے انداز میں انکار کر دیا۔ انھیں شاید میرا انکار کرنا عجیب لگا۔ انھوں نے حیرانگی سے مجھے دیکھا۔ ظاہر ہے براڈوے کا اتنا بڑا عہدیدار پیشکش کرے اور ردعمل مثبت نہ ہو تو عجیب ہی لگے گا۔

کہنے لگے! ''کیا میں انکار کی وجہ جان سکتا ہوں.....؟''

میں نے کہا ''جناب! میں یہاں اپنی موجودہ حالت سے بہت خوش ہوں۔ میرے باس مسٹر گلیزر بہت اچھّے انسان ہیں اور میری بہت عزّت کرتے ہیں۔ یہاں پہ میرے بہت سے دوست ہیں۔ میرا گھر دریا کے بالکل کنارے پر واقع ہے جس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت پارک ہے جہاں پہ میں صبح واک کرتا ہوں اس لئے میں یہاں سے نہیں جانا چاہتا۔''

وہ میری طرف تعجّب سے دیکھتے رہے شاید ان کے نزدیک ایک بھی وجہ ایسی نہیں تھی جس کے لئے اتنی اچھی پیشکش چھوڑ دی جائے۔ میں سیکرامنٹو چھوڑ کے نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے میں نے بات کا رخ پھیر دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اس بارے میں ہمارے درمیان مذاکرات بعد میں بھی چلتے رہے۔

خاص عنایت

میں ایک عام انسان ہوں۔ ہر انسان کی طرح مجھ سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ براڈوے میں رہتے ہوئے میں نے بے شمار غلطیاں کیں ہیں بلکہ کئی مرتبہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طفیل میں اپنی ملازمت سے برخاست ہوتے ہوتے بچا۔ مستنصر حسین تارڑ کے بقول ''یہ دنیا ایک عجیب کھیل تماشا ہے۔ ایسے کھیل تماشوں میں اہلیت اور قابلیت کا چنداں دخل نہیں ہوتا کہ وہ تو ہزاروں افراد میں آپ سے کہیں بڑھ کر ہوتی

ہے۔اس میں صرف نصیب کا اور ایک خاص عنایت کا دخل ہوتا ہے۔"

درحقیقت اس خاص عنایت کو میں نے متّعدد بار اپنے دل کے انتہائی قریب محسوس کیا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کوئی غلطی کی لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس کے بد اثرات نمایاں تو کجا ظاہر تک نہ ہوئے۔ اگر اب بھی آپ نہیں سمجھے تو کوئی بات نہیں۔ امید ہے درج ذیل واقعے کے بعد آپ بخوبی سمجھ پائیں گے۔

میں نے ایک مرتبہ اپنے نائب میلون (Melvin) کو کہا کہ وہ سویٹر بنانے کے لئے استعمال ہونے والی اون (Wool) کا آرڈر کرے۔ میں نے اسے اپنی عادت کے مطابق بڑی تفصیل سے سمجھایا کہ کس رنگ کے کتنے گولے منگوانے ہیں۔ مثلاً سرخ رنگ کے اڑتالیس (48) گولے، نیلے رنگ کے تیس (30) گولے وغیرہ۔ میں نے آخر پہ کہا سمجھ گئے.....؟ تو اس نے سر ہلایا اور کہا کہ جی سمجھ گیا۔ اس نے جا کر وہ آرڈر بک کروا دیا۔

دوسرے دن دو ٹرک سامان لے کے براڈوے پہنچ گئے۔ وئیر ہاؤس کے منیجر نے مجھے فون کیا اور کہنے لگا "مسٹر اسلم! مجھے علم ہے آپ دوسرں سے منفرد ہیں اور کئی دفعہ وہ کچھ کیا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا، لیکن اس بار جو آپ کرنے لگے ہو مجھے اس پہ شک ہے۔"

میں اس کی تمہید سے ہراساں ہو کے بولا "آخر ہوا کیا ہے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔"

ویئر ہاؤس کے منیجر نے کہا "آپ نے جو آرڈر منگوایا ہے وہ بہت ہی بڑا ہے۔ ہمارے ویئر ہاؤس میں اتنی جگہ موجود نہیں۔ یہاں پہ دوسرے شعبوں کا سامان بھی رکھا جاتا ہے۔ یہ ویئر ہاؤس صرف آپ کے لئے تو نہیں بنایا گیا۔"

میں نے کہا "آپ ذرا مجھے سامان کی تفصیل بتائیں۔"

جب اس نے سامان کی تفصیل بتائی تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

دراصل میں نے جب اپنے اسسٹنٹ کو ایک رنگ کے گولے بتائے تو وہ کارٹن سمجھا۔ اس بھلے مانس نے اتنے گولے منگانے کے بجائے اتنے کارٹن ہی منگوا لئے۔ اس طرح سارا آرڈر چوبیس (24) گنا زیادہ منگوا لیا۔ اپنے نائب میلون کو جب میں نے کہا تھا کہ آپ سمجھ گئے تو اس نے کہا تھا کہ سمجھ گیا حالاں کہ نہیں سمجھا تھا۔ اب ویئر ہاؤس مینیجر مجھ سے پوچھے جاتا تھا کہ اتنے زیادہ سامان کی جگہ نہیں..... کیا کروں.....؟ اور میں سوچتا تھا..... کیا کروں.....؟

ہم میں سے اکثر لوگ یہ دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ ہمیں سب پتہ ہے۔ اس کے لئے وہ دلائل کا انبار رکھتے ہیں مگر در حقیقت یہ دعویٰ ہی لاعلمی یا کم علمی کی دلیل ہے۔ ایک عام انسان اگر پوری زندگی محض علم ہی حاصل کرتا رہے اور دنیا کا کوئی اور کام نہ کرے، اس کے باوجود یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی ایک علم کی گہرائی یا حقیقت پا سکے۔ کیونکہ انسانیت کے پاس موجود تمام کا تمام علم (الہامی کتابوں کے علاوہ یا اس میں سے حاصل ہونے والے علوم) محض مفروضوں پر مبنی ہے۔ سائنسی علوم میں بھی مفروضوں کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے کبھی تو وہ مفروضہ درست ثابت ہوتا ہے اور کبھی غلط؛ جو درست ہو اس کو اپنا لیا جاتا ہے اور غلط کو رد کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار تو صدیوں تک ایک غلط مفروضے کے اوپر علم اور تحقیق کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ صدیوں بعد نئی تحقیق اس مفروضے کو غلط ثابت کر کے اس کی بنیادیں تک کھود ڈالتی ہے۔

بحیثیت ایک انسان ہمارا رویّہ اور سوچ ایک طالب علم جیسی ہونی چاہئے جو زندگی کے ہر معاملے کو تجسّس کی نظر سے دیکھے، غور و فکر کرے۔ عملی طور پر آنے والا ہر دن پچھلے سے اچھا ہو۔ کوئی بات ہو اس وقت تک یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ”میں سمجھ گیا“ جب تک واقعی سمجھ نہ آ جائے ورنہ بعد میں بڑی مشکل پیش آئے گی۔

میں مشکل میں تھا۔ ویئر ہاؤس کا مینیجر مجھ سے مسلسل پوچھ رہا تھا کہ میں اس

سامان کا کیا کروں؟ کیوں کہ اس کے پاس اتنی جگہ موجود نہیں کہ وہ یہ سامان رکھ سکے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ابھی اس سامان کو اپنی تحویل میں لے لے میں کچھ کرتا ہوں۔

اگرچہ غلطی میرے نائب کی تھی مگر ذمّہ داری تو مجھ پر ہی آنی تھی کیوں کہ منیجر بائر میں تھا اور سٹور کے بڑوں نے مجھ سے پوچھنا تھا اس لئے میں فوراً ہی متحرک ہو گیا۔ میں نے اس کمپنی سے رابطہ کیا جہاں سے ہم نے گولے منگوائے تھے ان کے ساتھ میرے اچھّے تعلّقات تھے۔ میں نے وہاں کے سیلز منیجر مسٹر لونسکی (Mr Lwinsky) سے رابطہ کیا اور کہا کہ اتنا بڑا آرڈر ایک غیر معمولی بات ہے آپ لوگوں کو یہ غلطی نوٹ کر لینی چاہیے تھی۔ میں نے مزید کہا کہ اب جبکہ آرڈر ہمارے پاس پہنچ چکا ہے اور اسکی نقل و حمل کے اخراجات ادا کر دیئے گئے ہیں تو میں اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہوں کہ اس میں سے جتنا سامان فروخت ہو گیا تو ٹھیک ہے باقی ہم آپ کو واپس کر دیں گے۔

مسٹر لونسکی نے معذرت کی اور یقین دلایا کہ جیسے بھی ہو وہ اسے ٹھیک کر لیں گے، میں بالکل فکر نہ کروں۔ مجھے لگا کہ آدھا مسئلہ حل ہو گیا ہے اب باقی کا آدھا مسئلہ حل کرنا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیرؔ مجھ کو
جب ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا

میں ابھی اس معاملے کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اونی سویٹر بنانے کے لئے مکمّل پیکج کٹ کی سیل کے لئے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ جس میں ہم نے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اونی سویٹر کی عام قیمت دس ڈالر ($10) ہے جب کہ سیل میں ہم اسے محض چار ڈالر ننانوے سینٹ ($4.99) میں گویا آدھی قیمت پہ دے رہے ہیں تو یہ عوام کے لئے سنہری موقع ہے کہ وہ فائدہ اٹھائیں۔

اس کے بجائے جو اشتہار چھپا اس کا متّن کچھ یوں تھا۔

”ریگولر قیمت پانچ ڈالر ($5) جبکہ سیل میں چار ڈالر ننانوے سینٹ ($4.99) گویا ایک سینٹ کی رعایت..... اسی طرح اون کے گولے کی قیمتوں میں بھی اتنا ہی فرق تھا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ جب میرے باس مسٹر گلیزر نے اخبار کھولا اور اس میں وہ اشتہار دیکھا تو بھونچکے رہ گئے۔ انھوں نے مجھے فون کر کے گھر بلایا ان کا کہنا تھا کہ ایک ضروری بات کرنی ہے۔

میں جب مسٹر گلیزر کے گھر پہنچا تو وہ بے حد سنجیدہ بیٹھے تھے اور اخبار ان کے سامنے میز پہ دھرا تھا۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خیریت دریافت کی۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد انھوں نے اخبار اٹھا کے مجھے پیش کیا اور کہا کہ یہ پڑھو۔ میں نے جب اخبار کھولا تو سنّاٹے میں آ گیا۔ میں نے خود سے کہا پہلی غلطی سے نپٹے نہیں اور دوسری گلے پڑ گئی۔

مسٹر گلیزر نے کہا ”مسٹر اسلم! اون کے گولوں کی خطا کیا کم تھی کہ یہ اشتہار کا پنگا بھی لے بیٹھے۔ آپ کو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا۔ کل آپ تیار ہو کے آنا۔ ہو سکتا ہے کل ”براڈوے“ میں آپ کا آخری دن ہو۔“

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اس لئے میں نے کہا ”سوری سر، ویری سوری“ اور اٹھ کے آ گیا۔

میں زیادہ پریشان تو نہ تھا مگر فکر مند ضرور تھا۔ میں نے وہی کیا جو میں ایسے مواقع پہ عموماً کرتا ہوں جو میں نے اپنے والدین سے سیکھا.....۔

میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنی شروع کر دی.....۔

پانی سر سے گزر جائے تو ایک انسان اتنا ہی کر سکتا ہے۔

عنایت ربی

اگلے دن سوموار تھا۔ میں اپنے معمول کے مطابق جلد سٹور پہنچ گیا۔ سٹور ابھی بند پڑا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو میں نے وہاں ایک خوش کن منظر دیکھا۔ سٹور کے باہر لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی اور وہ سٹور کھلنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

جوں ہی سٹور کا دروازہ کھلا تو لوگوں نے گویا دھاوا بول دیا۔ وہ سیدھے میرے شعبے کی جانب آئے اور دھڑا دھڑ خریداری شروع کر دی۔ جیسے جیسے لوگ آ رہے تھے تو میں اپنے اندر ٹھنڈک اترتی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے لوگوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بیگ دیکھے جو وہ خرید کر لے جا رہے تھے۔ خریداروں کا اتنا بڑا ہجوم میرے لئے ایک دلفریب منظر تھا۔ شام تک ہمارا زیادہ تر سامان فروخت ہو گیا اور بہت کم باقی بچا۔

مجھے یوں لگا لوگ میری دونوں غلطیاں بھی ساتھ ہی خرید کر لے گئے کیوں کہ اس کے بعد مجھ سے ان غلطیوں کے بارے میں کسی نے کچھ پوچھا نہ ہی ذکر ہوا۔ جب اس دن کا سورج غروب ہوا تو بجائے اس کے کہ مجھے کوئی سزا ملتی، مجھے کنگ آف بائرز (King of Buyers) کا خطاب دیا اور انعام سے نوازا گیا۔ ہر طرف اس غیر معمولی سیل کا ذکر تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ براڈوے میں میری ملازمت کا وقت تمام ہوا۔ یہ پیارے خدا کی خاص مہربانی اور عنائت تھی کہ اس نے مجھے مشکل ترین صورت حال سے باہر نکالا۔

اصول پسندی

میں نے سیئکس فیبر کس (Sacks Fabricks) نامی کمپنی سے کپڑا خریدا جس کا بھاؤ ساڑھے باون (52.50) سینٹ فی گز طے پایا۔ یہ کمپنی نیویارک میں تھی۔ انھوں نے جب کپڑا بھیجا تو اس میں آدھا کپڑا ایسا تھا جو ہمارے طے شدہ سودے کے مطابق نہ تھا

اگرچہ معیار کے اعتبار سے مناسب تھا۔ میں نے کمپنی کے سیلز منیجر سے فون پہ رابطہ کیا اور غلطی کے بارے میں بتایا۔ اس کا نام آرتھر فاب (Arthur Folb) تھا۔ وہ کہنے لگا

"مسٹر اسلم! جو کپڑا ہم نے بھیجا ہے اس کا معیار کسی بھی طرح آپ کے منتخب کردہ کپڑے سے کم نہیں۔"

میں نے کہا

"جناب! یہ کپڑا ہمیں نہیں چاہیے۔ آپ وہی بھجوائیں جس کپڑے کا آرڈر نوٹ کروایا تھا۔"

"اب نیویارک سے کپڑا آپ کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس کو بھجوانے پہ خرچ آیا ہے۔ اگر اس کپڑے کو واپس منگوایا جائے تو ہمیں نقصان کا سامنا ہوگا۔ میں اس کپڑے کی قیمت ساڑھے باون (52.50) سینٹ فی گز سے کم کر کے تیس (30) سینٹ فی گز کر دیتا ہوں یہ آپ کے لئے نفع کا سودا ہے۔" اس کا لہجہ تیکھا اور ناصحانہ تھا.....۔

"مسٹر آرتھر! میں شرمندہ ہوں مگر ہمیں وہی کپڑا چاہیے۔ جس کا سودا پہلے طے پا چکا ہے۔" میں نے عرض کیا

"ہم آپ لوگوں سے تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لئے میں اس کپڑے کی قیمت مزید کم کر کے آپ کو پچیس (25) سینٹ فی گز کر دیتا ہوں۔" اس نے کہا

مگر میں نہ مانا۔ وہ رفتہ رفتہ قیمت کم کرتا گیا مگر میرا موٴقف وہی رہا کہ ہمیں یہ کپڑا نہیں چاہیے۔ وہ اچانک غصّے میں آ گیا۔ کہنے لگا

"تم ابھی بچّے ہو۔ ایسے معاملات کی تمھیں کوئی سمجھ نہیں۔ میں تمہارے باس مسٹر گلیزر سے بات کرتا ہوں۔" اس نے غصے سے فون بند کر دیا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مسٹر گلیزر کا بہت اچھا دوست ہے اب وہ لازماً انھیں فون کرے گا۔ میں تیزی سے مسٹر گلیزر کے دفتر کی جانب بھاگا۔ لفٹ کا انتظار کئے بغیر سیڑھیوں سے چوتھی منزل پر واقع ان کے دفتر پہنچا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ان

کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے بکھری سانسوں کے درمیان کہا ”سر! فون اٹھانے سے پہلے میری بات سن لیں۔“

انھوں نے اپنی سیکرٹری سے کہا کہ وہ یہ فون ابھی ہولڈ پہ رکھے اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے سانس درست کرتے ہوئے کہا ”سر! غالباً یہ فون آرتھر فاب کا ہے۔ ہم نے انھیں جس کپڑے کا آرڈر دیا تھا انھوں نے آدھا کپڑا وہی بھیجا ہے اور آدھا کپڑا اپنی مرضی کا بھیج دیا ہے۔ اب وہ اصرار کر رہے ہیں کہ ہم سارا کپڑا رکھ لیں۔ میں وہ کپڑا رکھ کر دوسروں کے لئے بری مثال قائم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ اس پیشے کے اصولوں کے منافی ہے۔ اگر آپ نے اس کی بات مانی تو میرے لئے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔“

مسٹر گلیزر اپنے کام کے ماہر اور معاملے کی نزاکت سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے آرتھر فاب کو خوب صورتی سے ٹال دیا اگرچہ بظاہر یہ منافع کا سودا تھا تاہم پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف تھا جو مستقبل میں براڈوے کے لئے نقصان کا باعث بن سکتا تھا۔ میں نے عارضی فائدے کے بجائے براڈوے کی اچھی ساکھ کو متاثّر ہونے سے بچالیا۔

سیکرٹری کی کایاپلٹ

مجھے براڈوے کی طرف سے دفتر کے دیگر عملے کے علاوہ ایک پرسنل سیکرٹری بھی مہیّا کی گئی تھی جس کا نام (فرض کریں) ”جوڈی“(Judy) تھا۔ اگرچہ وہ کیلیفورنیا ڈسٹرکٹ کے ایک اہم سرکاری عہدے دار کی بیوی تھی تاہم سلیقہ اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ وہ انتہائی غیر ذمہ دار اور لاپروا تھی۔ اس کی میز ہمیشہ گندی اور بے ترتیب ہوتی۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ اس کی اپنے میاں سے ان بن چل رہی ہے اور شاید طلاق تک نوبت پہنچ جائے۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ جوڈی کی خراب عادات تھیں۔

جوڈی دفتر میں کام غلط انداز میں کرتی تو میں اسے ڈانٹنے سے پرہیز کرتا۔ میری

کوشش ہوتی کہ اسے سکھا سکوں۔ میں اسے اپنا طریقۂ کار سمجھاتا۔ چیزوں کو صحیح طریقے سے اپنی اپنی جگہ رکھنے کا انداز بتاتا۔ میں بتاتا رہتا کہ وہ کیسے ترتیب و صفائی سے کام لے کر اپنی زندگی بہتر بنا سکتی ہے؟ مجھے علم نہ تھا کہ وہ کس حد تک میری باتوں کو سمجھتی اور ان پہ عمل کرتی ہے۔ میں اپنی طرف سے صبر و تحمل کے ساتھ اسے سکھاتا رہا۔ یہ سلسلہ چند ماہ تک یوں ہی چلتا رہا۔

ایک دن ایک شخص تحائف لئے میرے دفتر آیا اور پوچھنے لگا! "صغیر احمد اسلم آپ ہی ہیں؟" میں نے کہا "جی! میں ہی ہوں۔" وہ تھوڑا آگے بڑھا اور ہاتھ ملایا "مسٹر اسلم! میں جوڈی کا خاوند ہوں جو آپ کی سیکرٹری ہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔"

میں تھوڑا حیران ہوا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے لیکن میں ابھی تک کچھ سمجھا نہیں۔"

وہ کہنے لگا

"دیکھیں جناب! میں ایک نفاست پسند انسان ہوں۔ اپنی بیوی کی اس عادت سے بہت بیزار تھا کہ وہ صفائی کا خیال نہیں رکھتی۔ ہمارا گھر بغیر عورت کے گھر (Bachelor's house) کا منظر پیش کرتا تھا جس میں کوئی چیز اپنی جگہ پہ نہیں ملتی تھی۔ ہر چیز گندی اور بے ترتیب ہوتی تھی۔ میں اتنی ذہنی کوفت کا شکار تھا کہ جوڈی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن آپ نے کمال کر دیا ہے۔ آپ نے اسے جو کچھ سکھایا ہے اس نے ہماری زندگی سنوار دی ہے۔ جوڈی کو آپ نے جس طریقے سے بری عادتیں چھوڑنے پہ مجبور کیا وہ واقعی لاجواب ہے۔ اب تو وہ گھر کو اتنا صاف ستھرا اور ترتیب سے سجا کے رکھتی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ اگر میں کوئی چیز استعمال کروں اور واپس جگہ پہ نہ رکھوں تو وہ میرے پیچھے پڑ جاتی ہے، مجھے نصیحت کرتی نظر آتی ہے کہ میں صفائی کا خیال

رکھوں۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر کہنے لگا

"اسے میں ایک معجزہ ہی قرار دوں گا۔ اب کوئی ہمارے گھر آئے تو اسے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی گھر ہے۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ واپس لے چکا ہوں۔"

لاس اینجلس کو ہجرت

اس دوران میرے مذاکرات مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر کے ساتھ چلتے رہے۔ وہ مجھے لاس اینجلس میں کام کرنے کی آفر کر رہے تھے جہاں پہ براڈوے کے دس سٹور کام کر رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ اپنی شرائط پہ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں اس معاملے کو تھوڑا موٴخّر کرتا آرہا تھا۔ اس دوران میں ضروری معلومات اکٹھی کرتا رہا۔

میں مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر سے ملنے لاس اینجلس پہنچا۔ یہ ایک طرح کا انٹرویو تھا۔ میں نے انھیں کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں لاس اینجلس میں آپ کے ساتھ کام کروں تو ان حالات میں کام کرنا مشکل ہے۔

انھوں نے پوچھا "کیا مطلب؟"

میں نے اپنے بریف کیس سے تمام سٹوروں کے سامان کی تفصیل برآمد کی اور ان کے حوالے کی۔ میں نے یہ فہرست بنانے میں بہت محنت کی تھی۔ کیلی فورنیا سے لاس اینجلس آیا تھا۔ براڈوے کے تمام سٹوروں پہ گیا اور وہاں موجود سامان کی تفصیلات تیار کیں (ہر سٹور میں اگرچہ میں گھنٹوں چکر لگاتا رہا اور نوٹس لیتا رہا مگر کسی نے مجھ سے یوں گھومنے پھرنے کی وضاحت نہ مانگی۔ وہ امریکی قانون کے پابند تھے۔ اس قانون کے تحت آپ کسی کو کسی عوامی جگہ سے نہیں نکال سکتے جب تک دوسروں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو)۔

فہرست دیکھ کر وہ چونکے اور پوچھا "یہ کب کی بات ہے اور کیا آپ براڈوے کی طرف سے معمول کے دورے پہ تھے؟"

میں مسکرایا.....وہ ایک خالص کاروباری آدمی تھے۔

”نہیں جناب! یہ خالصتاً نجی دورہ تھا اس کے تمام اخراجات میں نے اپنی جیب سے ادا کئے ہیں۔“

”آپ کے ہوائی ٹکٹ کے پیسے کس نے ادا کئے۔“

”میری جیب نے۔“

”سامان کی لسٹ تیار کرنے میں آپ کی مدد کس نے کی؟“

”میں نے خود اپنی مدد کی ہے۔“

”یہ کام آپ نے کب کیا۔“

”دفتر سے چھٹیوں کے دوران۔“

فہرست میں موجود سامان کی تفصیل پہلے سے ان کے علم میں تھی۔ اسی لئے تو مجھے انھوں نے پیشکش کی کہ میں ان کے ساتھ کام کروں۔ یقیناً پہلے منیجر کی کارکردگی متاثّر کن نہ تھی۔ تمام سامان جدید فیشن کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔

میں نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ کام کروں تو مجھے اجازت دینی ہوگی کہ میں تمام سامان فروخت کر کے نیا سامان لا سکوں۔ یہ پرانے فیشن کا سامان ہے۔ اگر آپ ایک ڈالر کی چیز بیچنا چاہیں گے تو گاہک بمشکل پچیس (25) سینٹ میں لینے پہ تیار ہو گا۔ ہم اگر نیا سامان لاتے ہیں تو ہم ایک ڈالر کی چیز کئی ڈالر میں بیچ سکتے ہیں۔ گاہک ہمیں خوشی سے دے کر جائیں گے۔

انھوں نے پوچھا ”لیکن اس کے لئے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ نیا سامان لانے کے لئے بہت سے ڈالر درکار ہوں گے۔“

میں نے کہا ”جی بالکل! اتنے بڑے پیمانے پر تبدیلی کثیر سرمایہ مانگتی ہے۔ میں تمام پرانے سامان کو فروخت کردوں گا اور وہ سرمایہ استعمال کروں گا۔ باقی رقم آپ مجھے

مہیا کریں گے۔"

میں نے پورا منصوبہ بیان کیا اور اپنی ترجیحات بتائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ جو کمیشن میں سیکرامنٹو میں لے رہا تھا اس میں کمی نہیں کی جائے گی۔ دوسری یہ تھی کہ اگر میں خریداری کی غرض سے مشرق بعید، یورپ یا امریکہ کی کسی ریاست کا دورہ کرنا چاہوں گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہو گا اور تیسری یہ کہ میرے معاملات میں کوئی خواہ مخواہ دخل اندازی نہیں کرے گا۔

انھوں نے کہا کہ وہ اس معاملے پہ غور کریں گے۔ میں وہاں سے اٹھ کے واپس آگیا۔ چند ماہ بعد مجھے مطلع کیا گیا کہ آپ کی تمام شرائط مان لی گئی ہیں۔ جلد ہی میں سیکرامنٹو سے لاس اینجلس ہجرت کر گیا۔

لاس اینجلس میں خدمات

لاس اینجلس میں براڈوے کے دس سٹور تھے۔ اس کے علاوہ اریزونا (Arizona)، نواڈا (Nevada) کیلیفورنیا (California)، یوٹا (Uttah) اور دوسری ریاستوں میں بھی تھے۔ مجھے ان تمام سٹوروں کے خام مال کی خریداری اور ترسیل کا کام سونپا گیا۔ اس کے ساتھ نئے سٹوروں کا قیام اور منصوبہ بندی بھی میری ذمّہ داری تھی۔

عام طور پر براڈوے کے بائر منیجر بہت مصروف ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں ان کی زیر نگرانی کئی سٹور چل رہے ہوتے ہیں۔ ایک سے دوسرے سٹور کا فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی بائر منیجر بمشکل سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی کسی سٹور کا دورہ کر پاتا ہے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر کامیاب ہونا ہے تو مجھے اپنے سٹورز پر مسلسل اور مختصر وقفوں کے بعد جانا ہو گا تا کہ مؤثّر طور پر نگرانی کی جا سکے۔

میں نے اپنے پاس ایک فہرست تیار کر لی جس میں درج تھا کہ کون سے سٹور کو

میری راہنمائی کی زیادہ ضرورت ہے پھر اس کے بعد کس کی باری ہے؟اسی طرح ترتیب وار سب سٹوروں کے بارے میں معلومات شامل تھیں۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ کسی سٹور پہ مہینے میں دو مرتبہ اور کسی پہ ایک مرتبہ جانا ہے۔

میں نے اخبار میں ایک پورے صفحے کا اشتہار دیا جس کا مفہوم تھا کہ نیا منیجر پورا سٹور خالی کرنا چاہتا ہے تو دعوت خاص وعام ہے کہ "لوٹ سیل" سے فائدہ اٹھائیں۔ یاد رہے یہ پیارے پاکستان جیسی "لوٹ سیل" نہ تھی جہاں خالص کے بجائے جعلی چیز تھما دی جاتی ہے۔ ہم وطنوں کو عیّار لوگ قدم قدم پہ دھوکہ دیتے ہیں۔

میں نے براڈوے کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ میں چھ ماہ میں پرانا سامان فروخت کر کے نیا سامان لے آؤں گا مگر اللہ پاک کی رحمت سے صرف تین ماہ کے عرصے میں ہی ہمارا زیادہ تر سامان فروخت ہو گیا۔ میں یورپ، ایشیا، جاپان اور ہانگ کانگ گیا وہاں سے نیا سامان خریدا اور سٹوروں میں لگانا شروع کر دیا۔ ان کی تزئین و آرائش پہ خصوصی توجّہ دی۔ یہ سامان جدید ترین فیشن کے عین مطابق تھا۔ میں اپنی فہرست کے مطابق کبھی ایک سٹور پہ ہوتا تو کبھی دوسرے پہ۔ مجھے اس کام کا عملی تجربہ تھا۔ نیا سامان سٹور میں لگاتے ہی ہماری آمدنی میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ اللہ کے فضل سے خریداروں کی تعداد میں ہر آنے والے دن میں اضافہ ہوتا رہا۔ میرے سننے میں آیا کہ براڈوے کے تمام سٹوروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ نوجوان کون ہے جس نے اتنے مختصر عرصے میں نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے۔

جب میں نے تین ماہ کے بعد مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر کو اپنی رپورٹ پیش کی تو انھوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور کہا کہ تم نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ یقین نہیں آتا۔ تم حقیقت میں حیرت انگیز بزنس مین ہو۔ میری توقعات سے کہیں بڑھ کر.....۔

میرا دفتر براڈوے کے صدر دفتر میں تھا جہاں پہ صرف دفاتر تھے۔ سٹور دیگر

شہروں اور ریاستوں میں تھے۔ میرا کام کرنے کا انداز وہی تھا۔ میں صبح مقررہ وقت سے پہلے دفتر پہنچتا اور رات دیر تک اپنے آفس میں کام کرتا رہتا۔ یہ معمول بلاناغہ جاری و ساری رہتا اور آج تک ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ کام کرنے کا جنون میری گھٹی میں پڑا ہوا ہے کیونکہ میں ایک لمحہ بھی فارغ نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں بھی میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ میرے دادا جی اور میری والدہ محترمہ میری اس عادت سے بہت پریشان رہتے تھے۔

دادا جی اکثر کہتے ”میں نے تمہیں رسّی سے باندھ دینا ہے تاکہ تم بھی آرام کرو اور ہمیں بھی سکون ہو۔“ ان کی یہ محبت بھری دھمکیاں بھی مجھے ایک جگہ ٹکنے پہ مجبور نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ کام کرتے رہنا میری فطرت کا لازمی جزو ہے۔

سیکرٹری کی حیرت

لاس اینجلس میں دفتر سنبھالنے کے بعد ایک دن میری سیکرٹری آئی اور کہنے لگی ”مسٹر اسلم! مسٹر فرگوسن کا فون ہے تو کیا آپ دفتر میں ہیں.....؟ میں نے کہا ”نینسی.....! یہ کس قسم کا سوال ہے؟“ وہ کہنے لگی ”اگر آپ بات نہیں کرنا چاہتے تو میں کہہ دیتی ہوں کہ آپ دفتر میں نہیں۔“ میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ”دیکھو نینسی! میں اپنے ایک سو پینتیس (135) پاؤنڈ وزن سمیت یہاں موجود ہوں۔ اگر کبھی مصروف ہوا تو کہہ دوں گا کہ بعد میں فون کریں۔“

میری سیکرٹری نے اطمینان کی گہری سانس لی اور بولی ”اس کا مطلب ہے آئندہ مجھے جھوٹ نہیں بولنا پڑے گا۔“ (پہلے مینجر کا روّیہ ایسا تھا، دفتر میں ہوتے ہوئے بھی کہہ دیتا کہ بتادیں میں دفتر میں نہیں)۔

نئے باس کی آمد

میری اپنے باس مسٹر کرو(Mr Crow) کے ساتھ بہت اچھی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ کام کے بارے میری بات سنتا اور سمجھتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ ایک دن اچانک ہی ہمیں پتہ چلا کہ مسٹر کرو کی جگہ ایک اور شخص تعینات کر دیا گیا ہے جس کا نام جیب سٹیورٹ میگروڈر(Jeb Stuart Magruder) ہے(یہ وہی شخص تھا جو امریکی صدر نکسن(Richard Nixon) کے واٹر گیٹ سکینڈل(Water Gate Scandal) کی وجہ سے بہت بدنام ہوا تھا) اس نئے آنے والے باس کو کام کے بارے کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ بس ایک ہی خوبی تھی کہ وہ چیف ایگزیکٹو کا بھتیجا تھا۔ بات بات پہ ٹوکنا عادت ثانیہ تھی۔ میں کچھ ہی عرصے میں اس سے تنگ آ گیا۔

عزّت نفس پہ سمجھوتہ نہ کرنا

میں نے ایک فرم کے ساتھ دہری بنائی(Double Knit) کپڑے کا سودا کیا۔ یہ ہزاروں گز کپڑے کا آرڈر تھا جس کی قیمت تین ڈالر($3) فی گز مقرر ہوئی۔ کپڑے کی مانگ اتنی زیادہ تھی کہ کمپنی نے ہمیں وہ آرڈر تین ماہ بعد دینے کا معاہدہ کیا۔ اسی دوران خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کپڑے کی مانگ میں اچانک ہی زبردست کمی واقع ہو گئی۔ لوگوں نے اس کپڑے کو پسند کرنا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے اس کا اثر کپڑے کی قیمت پہ بھی پڑنا تھا اس لئے کپڑے کی قیمت گر کر ایک ڈالر($1) فی گز پہ آ گئی۔

میرا کمپنی کے ساتھ چونکہ تین ڈالر فی گز کا معاہدہ پہلے سے طے پا چکا تھا اس لئے میں نے خریداری کے مزید کچھ آرڈرز کے ساتھ یہ آرڈر بھی دستخط کے لئے مسٹر میگروڈر کے پاس بھجوا دیا۔ جب اس نے یہ آرڈر دیکھا تو مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور مجھ سے اس آرڈر کے بارے میں وضاحت طلب کی۔ میں یہ بات پہلے ہی اس کے علم میں لا چکا تھا کہ

مارکیٹ میں اس کپڑے کی قیمت گر چکی ہے۔ ہمارے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا۔

مسٹر میگروڈر: "کیا تم نے اس آرڈر کی کاپی اس کمپنی کو بھیجی ہے؟"

میں: "جی نہیں۔"

مسٹر میگروڈر "تم نے یہ آرڈر اس کمپنی کو اپنے لیٹر ہیڈ پہ لکھ کے تو نہیں دیا۔"

میں: "جی نہیں۔"

مسٹر میگروڈر:۔ "کیا تم نے یہ آرڈر اس کمپنی کو سادہ کاغذ پہ لکھ کے دیا ہے؟"

میں: "جی نہیں۔"

مسٹر میگروڈر: "جب تم نے اس کمپنی کے نمائندے سے بات کی تو وہاں پہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا؟"

میں: "جی نہیں! وہاں پہ کوئی اور موجود نہ تھا۔"

مسٹر میگروڈر: "پھر تم نے یہ آرڈر کیسے فائنل سمجھا؟"۔

میں: "جناب! میں نے یہ سودا زبانی طے کیا ہے اور میرے نزدیک اس کی وہی اہمیت ہے جو کہ لکھے ہوئے آرڈر کی ہوتی ہے۔"

جیسے ہی میری بات ختم ہوئی تو مسٹر میگروڈر نے وہ آرڈر پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے تاثرّات قابو میں کئے۔

وہ کہنے لگا "دیکھو مسٹر اسلم! میں نے براڈوے کو بہت بڑے نقصان سے بچا لیا۔ تقریباً کوارٹر ملین ڈالر ($250,000) کے نقصان سے..... تمہارا زبانی معاہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ مجھے اپنی کمپنی کا مفاد دیکھنا ہے۔"

مجھے اس سے ایسے طرزِ عمل کی توقع نہ تھی۔ اگرچہ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں لیکن میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اپنے دفتر پہنچ کر میں نے اپنی سیکرٹری کو طلب کیا اور بتایا کہ میں گھر جا رہا ہوں اگر کوئی کام ہو تو دیکھ لے اور باقی عملہ اگر

پوچھے تو بتا دے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ قدرے حیران ہوئی کیونکہ یہ غیر معمولی بات تھی۔ میں آج تک اپنے کام سے کبھی اس طرح گھر نہیں گیا تھا۔

میں ذہنی طور پر بے حد پریشان تھا۔ میں نے گھر آکے نفل ادا کئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مجھے صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے بعد میں نے خوب غوروخوص کیا اور بالآخر استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے آباؤاجداد سے حاصل کردہ تربیت کے پیشِ نظر اپنی خودداری اور عزت نفس پہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں مسٹر میگروڈر کے مسلسل سخت رویّے سے تنگ آ چکا تھا آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مسٹر میگروڈر کی یہ حرکت اونٹ کی کمر پہ آخری تنکا ثابت ہوئی تھی۔

اگلے روز میں مسٹر میگروڈر کے دفتر میں گیا اور کہا کہ میں نے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ وہ کہنے لگا "ہاں بولو۔"

میں نے کہا "آپ پہلے دروازہ بند کر لیں تو بہتر ہے۔ آپ شاید یہ پسند نہ کریں کہ میں جو کچھ آپ سے کہنے لگا ہوں وہ آپ کی سیکرٹری بھی سنے۔"

میں آرام سے کرسی پر بیٹھا اور اس کی طرف جھک کر بولا "سنو! آپ کو نہ تو میرے کام کے بارے میں علم ہے اور نہ ہی آپ میرے کام کی نوعیت کے بارے میں جانتے ہو۔ پھر بھی آپ یہ سمجھتے ہو کہ آپ کو سارا پتہ ہے۔ اس کے علاوہ جو سوال آپ کرتے ہو وہ نہ صرف انتہائی فضول ہوتے ہیں بلکہ احمقانہ بھی۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگا..... جبکہ میں اس کی حالت سے بے نیاز کہتا رہا۔

"آپ نے کل جو کچھ مجھے کہا اس سے نہ صرف میرے مذہب، ملک اور خاندان بلکہ براڈوے کی بھی توہین ہوئی ہے۔ آپ کے الفاظ کو میں اپنی عزّت نفس پر حملہ تصوّر کرتا ہوں۔ آپ کو خود پہ شرم آنی چاہیے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ جیسے گھٹیا اور کم ظرف

انسان کو اتنی اہم جگہ پہ کیسے تعّینات کر دیا گیا۔"

اسے بھی شاید مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ میں جب خاموش ہوا تو وہ جیسے سکتے سے باہر آیا۔ کہنے لگا

"میں اس بات پہ حیران و پریشان ہوں کہ آپ کو یہ سب کچھ کہنے کی جرّأت کیسے ہوئی؟ آج تک تو کوئی مجھ سے اس طرح مخاطب نہ ہوا۔ سب جانتے ہیں کہ میں چیف ایگزیکٹو کا بھتیجا ہوں اور اس تک براہ راست رسائی رکھتا ہوں۔ آپ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ آپ کو نوکری سے نکالا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "مسٹر میگروڈر! میرا روزی رساں "اللہ تعالیٰ" ہے۔ اللہ ہی میری کفالت کا ذمّہ دار ہے اور میں اسی پہ بھروسہ رکھتا ہوں اس لئے مجھے اپنی نوکری کی فکر نہیں۔ میں اپنی خود داری اور عزّت نفس کو چند ڈالروں کے عوض فروخت نہیں کر سکتا۔"

اتنا کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کہا "میرے ساتھ اپنے چچا کے دفتر چلو تاکہ میں تمہارے سامنے ان کو اپنا استعفیٰ پیش کر سکوں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ ساری امریکی ریٹیل انڈسٹری یہی کہے گی کہ صغیر اسلم کو نکالا گیا ہے لیکن مجھے کم از کم سچائی کا علم ہو گا کہ میں نے خود استعفیٰ دیا ہے اور یہ اطمینان بھی کہ میں تمہارے جیسے گھٹیا بندے کے لئے کام نہیں کرتا۔"

میرے کڑے تیور دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بیٹھنے کے لئے کہا لیکن میں تیار نہ ہوا۔ اس نے بصد اصرار مجھے کرسی پہ بٹھایا اور کہا "میں بہت شرمندہ ہوں جو کچھ میں نے کہا اور کیا۔ اگر آپ کو اس آرڈر کا غصہ ہے تو وہ میں نے غلطی سے پھاڑا تھا۔ آپ دوبارہ تیار کر لو میں دستخط کر دوں گا۔ مجھے اپنی کمپنی کے نقصان کی بالکل پروا نہیں کیونکہ مجھے علم ہے کہ آپ تھوڑے ہی عرصے میں ہمیں اس

سے زیادہ کما کر دو گے۔"

میں نے کہا "جناب! میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے استعفیٰ دینا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس سے اچھی نوکری مجھے پورے امریکہ میں نہیں مل سکتی مگر مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے ذہنی سکون کی ضرورت تھی جو مجھے اب مل چکا ہے۔"

وہ کہنے لگا "مجھے معلوم ہے آپ کا شمار اس ملک کے بہترین بائر مینیجرز میں ہوتا ہے اور آپ پانچ بہترین بائر مینیجرز میں سے دوسرے یا تیسرے نمبر پہ ہو۔ آپ کو کافی ساری کمپنیوں سے نوکری کی آفرز بھی موجود ہیں۔ آپ کا یہاں رہنا ہماری کمپنی کے مفاد میں ہے. آپ آج سے اپنے فیصلے کرنے میں سو فیصد خود مختار ہوں گے اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ آپ سے کوئی غلط بات نہیں پوچھوں گا۔"

مسٹر میگروڈر نے میرا غصّہ کم کرنے کے لئے صلح صفائی کی باتیں شروع کر دیں۔ اس نے مجھ سے درخواست کی میں نوکری چھوڑ کر نہ جاؤں۔ لاس اینجلس آنے سے قبل میں نے مسٹر کارٹر کے سامنے شرط رکھی تھی کہ کام کے سلسلے میں کوئی بلاوجہ روک ٹوک نہیں کرے گا۔ اس لئے میں مطمئن تھا کہ میں حق پر ہوں۔

جب اس بات کا علم مسٹر کارٹر اور مسٹر کرو وغیرہ کو ہوا تو انھوں نے میرا ساتھ دیا اور کہا کہ میں نوکری چھوڑ کر نہ جاؤں۔ باقی عملے کے لوگوں نے بھی مجھے میرے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اتنے سارے لوگوں کے اصرار پر مجھے استعفیٰ کا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

عزت و احترام میں اضافہ

خدا پر پختہ ایمان اور جرأتمندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری عزت و احترام میں اضافہ ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد براڈوے کے تمام ملازمین بشمول چیف ایگزیکٹو آفیسر مسٹر کارٹر حد درجہ عزّت کرنے لگے۔ انھوں نے ایک پارٹی منعقد کی اور اس میں

کمپنی کے سارے عہدیداروں کو بلایا۔ وہاں پہ ہر شخص نے فرداً فرداً میری حوصلہ افزائی کی، میری جرأت اور ایمانداری کی تعریف کی اور کہا کہ آپ کا استعفیٰ واپس لینے کا فیصلہ بہت اچھّا ہے۔ آپ ہماری کمپنی کا بہترین اثاثہ ہیں۔ انھوں نے مجھے تحفے تحائف اور انعامات سے نوازا۔ میں جانتا تھا یہ میری دل جوئی کا ایک انداز تھا۔

اس واقعے کے بعد براڈوے کے تمام عہدے دار مجھے اپنی ذاتی تقاریب میں بھی بلانے لگے۔ انھوں نے مجھے اپنے خاندان اور دوستوں سے متعارف کرایا۔ میں کسی دعوت سے معذرت کرتا تو وہ بصد اصرار شامل ہونے کی دعوت دیتے بعض اوقات خود لینے پہنچ جاتے۔

رفتہ رفتہ میں اعلیٰ کاروباری طبقات میں متعارف ہوتا چلا گیا۔ کانگریس کے ممبران اور دیگر حکومتی عہدے داروں کے ساتھ روابط قائم ہوئے۔ ان کے ہاں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں شرکت کرنا میرا معمول بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر جگہ مجھے عزّت ملتی۔ جب میں نے لاس اینجلس میں براڈوے کو جوائن کیا تو اس وقت اس ریاست میں دس سٹور چل رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے آنے والے چند سالوں میں مزید پچیس نئے سٹور کھولنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ یوں سٹورز کی کل تعداد پینتیس ہوگئی۔

امریکی حکومت میں عہدے کی پیشکش

رچرڈ نکسن جب امریکہ کے صدر بنے تو انھوں نے جیب سٹیورٹ میگروڈر کو اپنا مشیر نامزد کیا۔ مسٹر میگروڈر کو وائٹ ہاؤس پہنچے ابھی چند ماہ ہوئے تھے کہ اس نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگا

”مسٹر اسلم! میں آپ کو ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں آپ فوراً واشنگٹن ڈی سی (Washington DC) آ جائیں ائرپورٹ سے ڈرائیور آپ کو لے

لے گا۔ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں سرکاری طور پر آپ کا قیام ہو گا۔ اگلے دن ہم آپ سے ملیں گے اور آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ نکسن انتظامیہ کا حصہ بنیں۔ ہم آپ کو معقول معاوضہ کے علاوہ دیگر مراعات دیں گے جس میں آپ کے سفری اخراجات بھی شامل ہیں۔ حتیٰ کہ ہم آپ کے گھر کا سارا سامان اپنے خرچے پہ کیلی فورنیا سے واشنگٹن۔ ڈی۔ سی منتقل کرائیں گے۔ آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو گا۔"

وہ بولتا چلا گیا اس نے میری رائے یا مرضی جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ وہ شاید مجھے بکاؤ مال سمجھا تھا یا پھر اسے یقین تھا کہ ایسی پیشکش سن کر ہر کوئی چھلانگیں لگائے گا کہ اتنی اچھی پیشکش ہوئی۔ اسے زبردست دھچکا اس وقت پہنچا جب میں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

"آپ اتنی اچھی پیشکش کیوں ٹھکرا رہے ہو"؟ اس نے مرے مرے لہجے میں پوچھا

میں نے کہا "میں اس لئے یہ قبول نہیں کر رہا کیوں کہ آپ کی اور میری ترجیحات میں واضح فرق ہے۔"

وہ کہنے لگا "تو کیا مجھے خود چل کے آپ کے پاس آنا پڑے گا؟"

میں نے نرمی سے کہا کہ آپ یہ زحمت نہ کریں۔ ہماری بات چیت یہیں پہ ختم ہو گئی۔

چند دن بعد مسٹر میگروڈر واشنگٹن سے میرے پاس لاس اینجلس پہنچا اور اپنی پیشکش قبول کرنے پر اصرار کیا۔ "میں اتنی دور سے چل کے آپ کے پاس آیا ہوں امید ہے آپ انکار نہیں کرو گے۔"

میں نے جواب دیا "آپ کا بہت بہت شکریہ! میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑی پیشکش ہے اور میرے لئے عزت کی بات ہے کہ آپ واشنگٹن سے خاص طور پر میرے

لئے آئے ہیں۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں لیکن میں یہ قبول نہیں کر سکتا۔ اگر میں آپ کو نہ جانتا تو شاید قبول کر لیتا۔"

میرا لہجہ قطعی تھا۔ اس پہ واضح ہو گیا کہ میں اس کی بات نہیں مانوں گا لہٰذا وہ مایوس ہو کے واپس لوٹ گیا اور بعد میں جب واٹر گیٹ سکینڈل سامنے آیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرا فیصلہ درست تھا۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

(علامہ اقبال)

امریکہ میں نکٹائی کا پہلا نمونہ

براڈوے میں کام کرنے کے دوران میں نے نکٹائی کا ایک نمونہ تیار کیا اس سے قبل ہوم سیونگ انڈسٹری امریکہ (Home Sewing Industry) میں اس وقت تک نکٹائی کا کوئی نمونہ تیار نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ وہ نمونہ تیار کرنے پہ میں نے بہت محنت کی تھی تاہم اس کو اپنے نام سے رجسٹر کروانے کے بجائے ان تمام کمپنیوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت دے دی جو نمونے تیار کرتی تھیں۔

ان کمپنیوں کو نمونہ دینے سے پہلے ہم نے براڈوے میں ایک تعارفی سکیم شروع کروائی۔ اس کے لئے ہر سٹور میں ایک بہت بڑا بینر بنایا گیا جس پر تحریر تھا

"(Sow for the man in your life)"

اس کے علاوہ ہم نے مختلف قسم کے اشتہار چھپوائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سکیم بہت کامیاب اور منافع بخش رہی کیونکہ ایسا نمونہ جب ہم کسی کمپنی سے لے کر فروخت کرتے ہیں تو اس میں ہماری قیمت خرید تین سے چار ڈالر ہوتی، جب کہ اپنا نمونہ بنا کر اسے پرنٹ کرانے پہ ہماری قیمت محض پندرہ سینٹ آتی تھی۔ ہمارے منافع کی شرح

نمونہ بنانے سے کئی فیصد بڑھ گئی۔ ہماری فروخت کی شرح میں بھی یکدم کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ یہ ایک اعزاز تھا جو خدا نے میرے نصیب میں لکھ رکھا تھا۔

فیشن تخلیقی ماہرین

میں نے مسٹر کرو کو تجویز پیش کی کہ فیشن انڈسٹری کے تمام نامور ماہرین کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے۔ مسٹر کرو نے کہا کہ تمام لوگوں کے بجائے ہم کسی ایک ماہر کو بلا لیتے ہیں۔ اس وقت تک رواج یہ تھا کہ کوئی کمپنی کسی ایک ماہر کو اپنے ہاں مدعو کرتی۔ وہاں پہ لوگ اکٹھے ہوتے اور اس ماہر سے استفادہ کرتے مگر میں اس خیال سے متفق نہ تھا۔ اس سے وہ مقصد حاصل نہ ہوتا جو میں چاہتا تھا۔ میں ان تمام لوگوں کو ایک جگہ بلانا چاہتا تھا جو امریکہ اور یورپ کا فیشن تخلیق کرتے تھے اور جن کا پورے امریکہ میں چرچا تھا۔ بہرحال میں جلد ہی اپنے منیجر کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ کسی ایک کو بلانے کے بجائے تمام لوگوں کو بلایا جائے۔

یہ تمام لوگ اپنے اپنے شعبوں کے ماہر تھے۔ ان میں امریکہ کے چوٹی کے فیشن ڈیزائنر، فیشن کنسلٹنٹ، سٹائلسٹ اور ڈریس ڈیزائنر شامل تھے۔ یہ ورک شاپ منعقد کرنے کے لئے پورے ایک سال تک تیاری کی گئی۔ ہم نے اس کی بڑے پیمانے پہ تشہیر کی جب لوگوں کو پتہ چلا کہ سب ماہرین ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہو رہے ہیں تو وہ گویا برادوے پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں ہوم سیونگ، ڈیکوریشن اور فیشن کے متعلق نئی معلومات ہر شعبے کے ماہر کی زبانی دستیاب ہونے جا رہی تھیں۔ یہ ماہر وہ لوگ تھے جو پورے امریکہ کی فیشن انڈسٹری کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان لوگوں میں مسز رابرٹا بش (Ms. Roberta Bush)، مس شیرل ٹرینٹ (Ms. Sherrill Trent) مس پیگ والش (Ms. Peg Walsh) اور مس وینڈی ریمزے (Ms Wendy Ramsey) جیسی نامور شخصیات شامل تھیں۔ ان لوگوں کی تصویر گیلری میں شامل کی گئی ہے۔

ہمارے لاس اینجلس ہالی ووڈ میں واقع سٹور پہ عوام کا اتنا ہجوم اکٹھا ہو گیا کہ علاقے کا فائر مارشل ہمارے سٹور منیجر کے پاس آیا اور درخواست کی کہ آپ اپنے سٹور پر موجود لوگوں کے ہجوم کو کم کریں، کیوں کہ اگر خدانخواستہ آگ لگی تو اس سے بہت بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہماری یہ تقریب اتنی کامیاب رہی کہ اس کے بعد ہمیں ہر سال منعقد کرانا پڑی۔ فیشن انڈسٹری سے وابستہ تمام بڑے بڑے ناموں اور مشہور لوگوں کو ایک جگہ پہ اکٹھا کرنا بھی میرا کارنامہ شمار ہوا۔ اس سے براڈوے کے کاروبار کو چار چاند لگے۔

براڈوے میں کلیدی حیثیت

میں اب براڈوے میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اپنے سٹورز کے خام مال کی خریداری کے سلسلے میں دنیا کے مختلف حصّوں کا سفر کرنا پڑتا۔ میں سال میں تین مرتبہ پوری دنیا کا چکر لگاتا۔ جہاں بھی جانا ہوتا بہترین ایئرلائن کی فرسٹ کلاس میں سیٹ بک کروائی جاتی۔ ایئرپورٹ پر کار، شوفر اور علاقائی نمائندہ موجود ہوتے۔ پوری دنیا میں نت نیا فیشن یورپ سے جنم لیتا ہے۔ اس لئے میں یورپ مثلاً انگلینڈ، اٹلی، جرمنی، فرانس، سپین، ہالینڈ وغیرہ کا سفر کرتا۔ وہاں سے نت نئے ڈیزائن خریدتا پھر وہ نمونے لے کے جاپان اور ہانگ کانگ جاتا اور وہاں جا کر ان نمونوں کے مطابق اپنا آرڈر تیار کرواتا کیونکہ ان ممالک میں یورپ کی نسبت کہیں زیادہ سستا آرڈر تیار ہو جاتا تھا۔ (اب ان ممالک کی جگہ چین نے لے لی ہے)۔

امریکہ میں کھیلوں کے ٹکٹ بہت مہنگے فروخت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہزار ڈالر تک بلیک میں فروخت ہوتے ہیں۔ کھیلوں کے مشہور مقابلوں کے دوران مجھے براڈوے کی طرف سے پہلی قطار میں نشست مہیا کی جاتی۔ دیگر کمپنیاں بھی کھیلوں کے مشہور مقابلوں میں مجھے اگلی نشستوں میں جگہ کا انتظام کر کے دیتی تھیں۔

محمد علی کلے اور فریزر کی تاریخی فائٹ

محمد علی کلے(Muhammad Ali Klay) اور فریزر(Frazier) کے درمیان ہونے والی مشہورزمانہ لڑائی نے پوری دنیا خاص کر امریکی عوام کو پاگل کر دیا تھا۔ 1971 میں ہونے والی اس فائٹ کو دی فائٹ آف دی سنچری " The Fight of the Century" کا نام دیا گیا۔ پورے امریکہ میں لوگ سارے کام کاج چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ گئے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور تجارتی اداروں نے عوامی مقامات پر دیو ہیکل سکرینیں نصب کر کے مقابلے کو براہ راست دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔ اس دوران مجھے خصوصی طور پر پہلی قطار میں نشست مہیا کی گئی۔ حالاں کہ لوگ اس مقابلے کا ٹکٹ لینے کے لئے مارے مارے پھر رہے تھے اور انھیں ٹکٹ نہیں مل رہا تھا۔ ویسے، ایسی ہی ایک فائٹ فلائیڈ مے ویدر جونئیر(Floyd Mayweather, Jr.) اور مینی پیکیو (Manny Pacquiao) کے درمیان 2 مئی 2015 کو لاس ویگاس میں منعقد ہوئی۔ اسے بھی فائٹ آف دی سنچری کا نام دیا گیا۔ اس کا ایک ایک ٹکٹ ہزاروں ڈالر میں فروخت ہوا۔

ومبلڈن ٹینس مقابلے

انگلینڈ میں ہونے والے سالانہ ومبلڈن ٹینس مقابلوں میں مجھے شرکت کی خصوصی دعوت دی جاتی۔ یہ دعوت مختلف کاروباری کمپنیوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ جمی کانرز(Jimmy Conners) اور کرس ایورٹ(Christ Everit) کے مقابلے کو میں نے براہ راست دیکھا۔ کرس ایورٹ(Christ Everit) کو ان کے پرستار محبت سے امریکی سویٹ ہارٹ(America's Sweetheart) کہہ کر بلاتے تھے۔

سالانہ رپورٹ

جب براڈوے کی سالانہ نفع و نقصان کارکردگی رپورٹ شائع ہوتی تو مجھے پورے امریکہ سے ملازمت کی پیشکشیں موصول ہوتیں مثلاً مارشل فیلڈ شکاگو(Marshal Field in Chicago) ، رچزانٹلانٹا (Riches in Antlanta) اور نیویارک سے میسی(Macy in New York) نامی سٹور نے مجھے موجودہ سے کافی زیادہ معاوضے کی پیشکش کی جو میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کی۔

ایک ایسی ہی پیشکش مجھے وانا میکر (Wana Maker) نے فلاڈلفیا سے بھیجی جو ہم سے تقریباً تین ہزار میل دور ایک ریاست ہے۔ اس نے ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھی بھیجا اور لکھا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے.....؟ لیکن جتنی بھی ہے ہم اس سے آپ کو دگنی تنخواہ دیں گے دیگر مراعات اس کے ساتھ شامل ہوں گی اگر آپ ہمارے پاس تشریف لے آئیں تو ہم اس بارے میں مزید بات چیت بھی کرسکتے ہیں۔ میں نے اس پیشکش پر شکریہ کے ساتھ معذرت کی۔

ہماری کمپنی کے جنرل منیجر مسٹر ویکسلر(Wexler) براڈوے کو چھوڑ کر ایک نہایت اچھی کمپنی جے ڈبلیو رابنسن (J.W.Robinson) میں چلے گئے۔ یہ معیار میں براڈوے سے ایک درجہ اوپر تھی انھوں نے مجھے وہاں سے فون کیا۔ کہنے لگے ”مسٹر اسلم! مجھے علم ہے کہ آپ براڈوے میں کتنی تنخواہ لے رہے ہیں۔ میں ایک فرسٹ کلاس ائیر لائن کا ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ آپ براہ مہربانی ہمارے پاس تشریف لاکر بات کریں۔ ہم آپ کو براڈوے سے بہت زیادہ تنخواہ دیں گے۔ آپ اور میں اب دوست ہیں کیوں کہ میں براڈوے کو چھوڑ چکا ہوں۔“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری فلاسفی میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں۔ میں اپنی موجودہ نوکری سے بہت خوش ہوں۔

دیگر کاروبار (رئیل اسٹیٹ، سٹاک مارکیٹ)

براڈوے میں ملازمت کے ساتھ ساتھ میں اپنا کاروبار بھی کرتا رہا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے گھروں کی مرمت اور دیکھ بھال کا جو کام شروع کیا تھا وہ ایک مینیجر کے حوالے کر رکھا تھا۔ ہم نے اس میں مزید جدّت پیدا کی اور پرانے گھر خرید کر اور مرمت کر کے بیچنا شروع کر دیئے۔

اس کاروبار کے ساتھ ساتھ میں نے سٹاک ایکسچینج میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ میں نے پہلی سرمایہ کاری 1960 میں کی تھی۔ میں پاکستان بھی باقاعدگی سے رقم بھیجتا تھا جہاں پہ میرے چھوٹے بھائی مختار احمد نے وہ رقم جائیداد خریدنے اور کاروبار کرنے میں لگا رکھی تھی (پاکستان میں گھر کے حالات کا مفصّل ذکر آگے آئے گا) یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ اس نے کامیابیاں عطا فرمائیں۔ میں ابھی تک یاد رکھتا ہوں کہ میں نے ایک مزدور کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تھا اور ایک وقت تھا کہ مجھے دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے حتّٰی کہ نظر کا چشمہ خریدنے کے پیسے بھی نہ تھے۔

سود سے نجات

ایک وقت تھا کہ میں امریکی معاشرے کا حصہ ہونے کی وجہ سے سود کو زیادہ برا نہیں سمجھتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مجھے احساس ہوا کہ کس سختی سے اسلام نے سود کی مخالفت کی ہے۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنے پیسے کو سود سے آزاد کرنا شروع کیا۔ اللہ پاک کا کروڑوں مرتبہ شکر ہے کہ اب پاکستان یا پاکستان سے باہر ہمارا تمام روپیہ سود سے آزاد (Interest Free) ہے۔

شراب و جواء

میں جب نیا نیا براڈوے کا بائر بنا تو سب لوگ یہی کہہ رہے تھے کہ یہ بھی باقی منیجرز کی طرح جلد ہی شراب اور جوئے کی دنیا میں گم ہو جائے گا۔ امریکہ کی ٹیکسٹائل انڈسٹری میں شراب کی بہتات ہوتی ہے۔ اس قدر زیادہ شراب پی جاتی ہے کہ وہ لوگ صبح ناشتہ بھی شراب کا کرتے ہیں۔ میں جب بائر منیجر بنا تو سب لوگوں نے کہا کہ یہ بھی باقی لوگوں کی طرح عیاّشی میں ڈوب جائے گا۔ حتّیٰ کہ کچھ لوگوں نے شرط لگا لی کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ بعد یہ بندہ ہم سے بھی بڑا شرابی ہو گا۔ میں سب کچھ سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

محض چھ ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ وہی لوگ دوسروں کو بتا رہے تھے کہ یہ شخص نہ شراب پیتا ہے نہ جواء کھیلتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو میرا کردار خراب ہونے کی پیشین گوئیاں کر رہے تھے۔ اب ان کے تبصروں کے انداز تبدیل ہو چکے تھے۔ اب وہ دوسرے لوگوں کو میرے بارے میں گواہی دے رہے ہوتے کہ صغیر اسلم جواء کھیلتا ہے نہ ہی شراب پیتا ہے۔ اگر وہ مجھے کبھی اپنی نجی محفلوں میں دعوت دیتے تو شراب پینے پر اصرار نہ کرتے بلکہ میری تعریف کرتے کہ یہ کیسی ہی عمدہ بات ہے کہ آپ شراب نہیں پیتے۔ کاش ہم بھی ایسا کر سکتے۔

شادی

اسی دوران گھر والوں نے مجھ پہ شادی کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس عمر کو پہنچ چکا ہوں کہ اب مجھے ضرور شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے ان کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرے چند دوستوں کا خیال تھا کہ شادی کی ذمہ داری گھر والوں کے بجائے لڑکے کو خود سر انجام دینی چاہیے۔ گھر والوں کے بجائے لڑکا خود اپنے لئے بہتر لڑکی کا انتخاب کر سکتا ہے۔ کچھ دوست کہتے تھے "اگر ہمیں لڑکی

کا انتخاب کرنا پڑے تو ہم پاکستان جا کے لڑکی سے ملیں گے۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے تا کہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اس کے بعد ہی اتنا بڑا فیصلہ کر سکیں گے کہ شادی کرنی چاہیے یا نہیں کیوں کہ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔

پانچ رشتے

میں نے وہی کیا جو پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے ذمّہ داری گھر والوں پہ چھوڑ دی کہ وہ لڑکی کا انتخاب کریں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو ایک طویل خط لکھا اور اپنی شرائط بیان کر دیں کہ لڑکی کیسی ہونی چاہیے۔ میں نے انھیں بتایا کہ مجھے ایسی شریک حیات چاہیے جو باعمل مسلمان ہو، میک اپ کا شوق زیادہ نہ رکھتی ہو اور ہاں سینما کی زیادہ شوقین نہ ہو (اس زمانے میں پاکستانی اشرافیہ میں سینما بہت مقبول تھا)۔

کچھ عرصے بعد پاکستان سے ایک لمبا چوڑا خط موصول ہوا۔ میرے والدین نے لکھا کہ انھوں نے ایک بہت اچھا رشتہ تلاش کیا ہے۔ لڑکی ڈاکٹر ہے اور سندھ کے ایک بہت بڑے جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ محترمہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ اس زمانہ میں پاکستان میں کسی کے پاس گاڑی شاذونادر ہی ہوا کرتی تھی جبکہ ان کے ہاں کئی گاڑیاں تھیں۔

میں نے جواب میں گھر والوں کو لکھا کہ آپ نے اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ وہ لڑکی اسلامی شعائر کی پابندی کرتی ہے یا نہیں؟ مجھے لڑکی کی دولت اور روپے پیسے سے غرض نہیں، نہ ہی میں کسی جاگیر دار سے متاثر ہوتا ہوں۔ آپ براہ مہربانی ایسی لڑکی دیکھیں جو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے والی ہو۔

میرے والدین نے مزید رشتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی میرے مقررہ معیار کے مطابق نہ تھی۔ چند ماہ بعد، گھر سے ایک اور خط موصول ہوا جس میں درج تھا کہ انھوں نے ایک اور اچھی لڑکی دیکھی ہے۔ وہ لڑکی ایسے خاندان

سے تعلق رکھتی ہے جن کی اپنی ایک بہت بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ عوام میں بے حد مقبول اس کمپنی کی بسیں پورے پاکستان میں چلتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اچھے لوگ ہیں اور لڑکی بھی بہت خوبصورت ہے۔

میں نے اپنے والدین کو جواب لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرا رشتہ تلاش کرنے میں کافی دقّت کا سامنا ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے یہ تو لکھا ہے کہ دنیاوی مرتبے کے لحاظ سے وہ لوگ بہت بڑے ہیں اور پاکستان میں ان کا نام ہے۔ لیکن مجھے اس میں زیادہ دلچسپی ہے کہ وہ لڑکی میرے مطلوبہ اسلامی معیار کے مطابق ہے یا نہیں.....؟ آپ نے لڑکی کی سیرت و کردار کے بارے میں کچھ نہیں لکّھا۔ مجھے ان کے روپے پیسے سے غرض نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے عقل اور ہاتھ پاؤں کی صورت میں ایسا سرمایہ دیا ہوا ہے کہ انھیں استعمال کر کے میں کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ میرا معیار صرف یہ ہے کہ میری شریک حیات عملی مسلمان ہو نہ کہ زبانی کلامی مسلمان.....۔

میرے والدین نے مجھے اس وقت کے اٹارنی جنرل آف پاکستان کی بیٹی کا بتایا لیکن میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ عرصے تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر مجھے والدین کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ اس مرتبہ انھوں نے لکھا تھا کہ ایک حافظ قرآن لڑکی ہے۔ وہ لوگ اتنے امیر کبیر تو نہیں مگر بہت اچھے ہیں۔ خاص کر لڑکی آپ کے مقررہ معیار پہ پورا اترتی ہے۔ میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے اس خط کا فوراً جواب لکھا۔ میں نے گھر والوں سے درخواست کی کہ وہ یہ رشتہ فوراً طے کر دیں۔ میں نے اسی وقت یعنی رات کو جا کے وہ خط لیٹر بکس میں ڈال دیا تا کہ جلد از جلد والدین تک پہنچے۔ جب اس خط کا جواب آیا تو مجھے دھچکا لگا۔ لڑکی والوں نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ لوگ اپنی بیٹی کو ملک سے باہر نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ مجھے توقّع نہ تھی کہ وہ انکار کریں گے بظاہر مجھ میں کوئی کمی نہ تھی۔

اکثر ہم اپنا فیصلہ نافذ نہیں کر پاتے۔ خواہ حالات کیسے ہی ساز گار کیوں نہ ہوں۔ کوئی ہماری مرضی بے اثر کرتا اور اپنی نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنی الگ کائنات تخلیق نہیں کر سکتا۔ اسے اسی دنیا میں رہنا اور اس کے قوانین پہ عمل کرنا ہوتا ہے۔ خود کو حالات کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ میں اس لڑکی سے شادی کرنے کا شدید خواہش مند تھا، امریکی شہریت رکھتا تھا اور پیسے کی کمی نہ تھی۔ میرے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی کوئی لڑکی آرزو کر سکتی ہے مگر مجھے انکار کر دیا گیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ایسا کیوں تھا.....؟ کیوں میری مرضی پوری نہ ہوئی.....؟ کیوں کہ "کوئی" ہے۔ کوئی ایک ہماری مرضی بے اثر کرتا اور اپنی نافذ کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کا فرمان "میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا" انسانی ذہن پر ہمیشہ دستک دیتا رہے گا۔

عقل کو پرندوں کی مانند اس کائنات میں کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنی منزل خود پا لے گی۔ فطرت اس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔ زندگی محض اتنی سادہ نہیں کہ انسان حیوانوں کی مانند گزار کے دنیا سے گزر جائے۔ مرنے کے بعد اگر کسی نے پوچھ لیا کہ زندگی کیسے گزاری؟ تو اس سوال کا جواب دینے کے لئے آپ کے پاس مضبوط دلائل ہونا ضروری ہیں۔ آپ کو واپس دنیا میں آنے اور پھر سے نئی زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں اور سوچیں۔ آپ کی آنکھیں کھلی ہیں یا بند.....

میرے پاس مضبوط دلیل تھی کہ دنیا کے پیچیدہ ترین نظام کو چلانے والی ہستی کو یہ منظور نہیں کہ میری یہاں پر شادی ہو سکے۔ میں نے خدا کی رضا کو اپنی رضا قرار دیتے صبر کرنے کا فیصلہ کیا۔

مثالی شریک حیات

میں معمول کے مطابق پاکستان آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ ہمارے احباب میں ایک اچھی لڑکی کا رشتہ ہے۔ آپ چاہیں تو آپ کی بات کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا اگر آپ

لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ لڑکی میری اچھی رفیق حیات ثابت ہو سکتی ہے تو ٹھیک ہے۔

میرے والدین نے بات کی تو ان لوگوں نے بھی دل چسپی ظاہر کی۔ جب بات چیت تھوڑی آگے بڑھی تو میں نے لڑکی کے خاندان سے لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اجازت دی تو میں نے جا کے دور سے دیکھا اور پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا۔

یہ بشریٰ سلطانہ تھیں جو اس وقت کم عمر اور معصوم تھیں۔ ایک چھوٹی سی گڑیا کی مانند لگتی تھیں۔ ان کا وزن اس وقت محض 89 پاؤنڈز تھا۔ وہ ایک معزّز اور پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بات طے ہوئی اور شادی کی تیاری شروع کر دی گئی۔

میں نے گھر والوں کو بتایا کہ میں شادی میں مروّجہ ہندوانہ رسوم و رواج کے بجائے اسلامی طریقے سے شادی کروں گا۔ ہر مسلمان اس طریقے سے اچھی طرح واقف ہے۔ میں نے گھر والوں کو بتایا کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو گی۔ مہندی اور دوسری رسومات بالکل شامل نہ ہوں گی۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں لڑکی والوں سے کوئی جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔ ہمیں صرف دلہن چاہیے۔

جہیز

پاکستان اور ہندوستان میں لڑکی کی شادی ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے۔ جہیز کی لعنت سب کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ لڑکے والے بطور خاص جہیز کی فرمائش کرتے اور اپنی پسند کی چیزیں لکھواتے ہیں۔ فرمائشی جہیز نہ دینے کی صورت میں شادی سے انکار عام ہے یا لڑکی کو باقی ماندہ زندگی سسرال اور دیگر لوگوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ یوں ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر جہیز دے۔ بدقسمتی سے شادی نمود و نمائش اور جہیز کی وجہ سے انتہائی مشکل بنا دی گئی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ شادی کے موقع پر جہیز کی باقاعدہ نمائش کی جاتی ہے۔ کیا یہ اسلامی طور طریقہ ہے.....؟ طویل

عرصہ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ کریہہ رواج مسلمانوں میں در آئے ہیں۔ ایسے رواج خود ہندوؤں کے لئے بھی عذاب بن چکے ہیں۔

بھارت میں لڑکیوں کو پیدائش سے پہلے ہی مارنے کا رجحان زوروں پر ہے۔ پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں لڑکی کی پیدائش پر والد سے افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ لڑکی کی پیدائش سے لے کر شادی تک اخراجات ہی اخراجات ہوتے ہیں۔ حالانکہ بیٹی ایسی رحمت ہوتی ہے کہ بیٹا اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ہر وقت ماں باپ کی خدمت اور محبّت.....

اگر آپ اسلام کی دنیا میں جھانکیں تو آپ کو حضور پاک ﷺ کی زندگی میں شاندار مثالیں ملیں گی۔ انھوں نے عورتوں کے ساتھ ایسے بہترین سلوک کی ابتداء کی جو اس سے پہلے کبھی سنا نہ دیکھا گیا۔ ایک مرتبہ حضور پاک ﷺ منبر پہ کھڑے اپنے صحابہ کرامؓ کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے کہ اسی دوران ایک بوڑھی عورت نے حضور پاک ﷺ کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میری بات سنیں۔ کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ !اس عورت کا دماغی توازن درست نہیں اس لئے آپ اس کی بات نہ سنیں مگر حضور پاک ﷺ نے اپنا خطبہ وہیں چھوڑا۔ اس بوڑھی عورت کے پاس گئے اس کی بات سنی اور اسے مطمئن کرنے کے بعد واپس تشریف لائے اور باقی خطبہ ارشاد فرمایا (مفہوم)۔ ایسے اعلیٰ اوصاف اور عمدہ اخلاق..... سبحان اللہ..... سبحان اللہ.....

آپ ﷺ نے عورت کے احترام کا حکم دیا۔ ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ہمارے آقا ﷺ نے ہمیں عورت کے عزت واحترام کی اتنی تاکید فرمائی اور ہم اسی عورت کے پیدا ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے آقا ﷺ اپنی دختر کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اپنی چادر مبارک بچھاتے تا کہ وہ اس پر تشریف رکھیں۔ ہمارے ہاں دختر پیدا ہو تو کئی دن لوگ افسوس کرنے آتے ہیں۔ بجا کہ غربت انسان کو کفر تک لے جاتی

ہے مگر ایمان اور یقین کیا چیز ہے؟ ہمارے آقا ﷺ دنیا کے سب انسانوں کے سردار ہیں۔ ان جیسا کوئی آیا نہ آئے گا۔ ان میں دنیا کی ہر خوبی عروج پہ تھی۔ خامی نام کو نہ تھی۔ ان کو چھوڑ کے ہم کس کی مانیں گے؟

اسلام کا منشاء ہے کہ تمام انسان اپنی زندگی سہولت سے ہنسی خوشی بسر کریں۔ اس لئے اسلام نے زندگی گزارنے کے اصول مہیّا کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی انسان ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے تو وہ نہ صرف اس دنیا میں اچھی اور کامیاب زندگی گزارے گا بلکہ مرنے کے بعد بھی بہترین زندگی اس کی منتظر ہو گی۔ ہم مسلمان زندگی کے ہر معاملے میں خدا کے بجائے اپنی مرضی کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ ذلّت اور رسوائی کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ذلّت ورسوائی جب دنیا کے سامنے ظاہر ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مسلمان ذلیل ہوئے۔ ان کو یہ علم ہی نہیں کہ اگر واقعی "مسلمان" ہوتے اور اللہ اور اس کے رسول حضور پاک ﷺ کا حکم مانتے تو یوں ذلیل ورسوا نہ ہوتے۔ پوری دنیا ہمارے قدموں تلے ہوتی۔ ہم بے عمل مسلمان اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں۔

میری بارات روانہ ہوئی تو اس میں مجھ سمیت صرف پانچ لوگ تھے۔ جن میں میرے والد صاحب، تایا جی اور میرے بھائی شامل تھے۔ کوئی لمبا چوڑا جہیز نہ لیا گیا۔ نکاح انتہائی سادگی سے ہوا۔ ولیمہ بھی بہت سادہ سا تھا۔ بشریٰ سلطانہ میری رفیق حیات بن کر میری زندگی میں کیا آئیں گویا بہار آئی۔

دراصل خدا ہم سے بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لئے کیا اچھا ہے.....؟

میں کیسے کامیاب ہوا؟

میں نے امریکہ جیسے ملک میں رہ کر بھی یہی کوشش کی کہ اپنی زندگی اللہ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق گزاروں۔ خاص طور پر لوگوں کے

ساتھ معاملات ان اصول و ضوابط کی راہنمائی میں طے کروں جو اسلام نے ہمارے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس دنیا کے معاملات بلاشبہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ بعض اوقات ہمیں صحیح راستے پر چلتے ہوئے نقصان بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے مگر جس طرح دنیاوی قانون کی وجہ سے کچھ لوگ فائدہ اٹھاتے جبکہ مدمقابل کو نقصان ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر اللہ کے قانون اور حکم کی تعمیل میں بظاہر نقصان نظر آتا ہو تو اس سے گریز کی کوئی صورت حال پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ وہ در حقیقت نفع کا سودا ہو گا.....۔

امریکہ جیسے ترقی یافتہ، مادہ پرست، جدید روایات اور انتہائی تیز رفتار طرز زندگی کے حامل ملک میں یہ کوئی آسان کام نہ تھا مگر میری نیت صاف اور سچی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ میں اللہ کے پیغام کو دیگر اقوام تک پہنچا سکوں اور اس کا کوئی بھی موقع میں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اگر کوئی میرے روّیے یا میری کسی خوبی کی تعریف کرتا تو میں اسے بتاتا کہ یہ تو اللہ کے آخری پیغمبر جناب محمد بن عبد اللہ ﷺ نے ایسا کیا اور ہمیں کرنے کو کہا۔ میرا اس میں ذاتی کمال نہیں۔

میں اپنی دھن کا پکا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد میرے شامل حال تھی۔ اس نے اپنے دستِ قدرت سے کامیابی کے دروازے وا کئے۔ مجھے اپنے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی جس سے مجھے امریکہ میں عزت، شہرت، دولت اور بے مثال ترقی ملی ورنہ پوری دنیا سے قابل اور ہنر مند افراد مسلسل امریکہ نقل مکانی کرتے ہیں۔ وہاں ذہین اور ہنر مند افراد کی کمی نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ کامیابی قابلیت کے بل پہ نہیں بلکہ محض اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی کرم نوازی سے مجھے حاصل ہوئی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(علامّہ اقبالؒ)

پرانا وعدہ

یہ 1972ء کا زمانہ تھا۔ میری عمر اس وقت چھتیس(36) سال تھی۔ اپنی سرزمین سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ میں چھتیس سال کی عمر میں اپنے وطن واپس لوٹوں گا۔ اپنے دیس، اپنے لوگوں اور اپنی مٹّی کی جانب..... تاکہ میں غریب اور بے آسرا لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ اب جبکہ میری عمر چھتیس(36) سال تھی تو وقت ہو چلا تھا کہ میں خود سے کیا گیا عہد پورا کروں۔ امریکہ میں میرے قیام کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور میں اتنا کچھ کما چکا تھا کہ اپنے فلاحی منصوبوں پر عمل کر سکوں۔

میں نے براڈوے میں 1961ء سے لے کر 1972ء تک کام کیا۔ ان گیارہ سالوں کے دوران میں نے بڑی محنت اور ایمانداری سے پیسہ کمایا۔ اس ملازمت کے ساتھ ساتھ میں اپنا ذاتی کاروبار بھی کرتا رہا۔

براڈوے سے استعفیٰ

جب میں نے اپنا استعفیٰ مسٹر کارٹر کو پیش کیا تو بالکل پرسکون تھا اور مجھے کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ مسٹر کارٹر نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ اس کے بعد دوبارہ کاغذ پہ نگاہ ڈالی انھیں شاید سمجھ نہ آئی کہ یہ سب کیا ہے.....؟

میں اس وقت اپنے کیرئیر کے عروج پہ تھا اور بلا مبالغہ امریکہ کی فیبرک انڈسٹری میں ہر طرف میرا نام تھا۔ مسٹر کارٹر نے مجھے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میری تنخواہ اور مراعات بڑھانے کی پیشکش کی۔ انھوں نے ہر طریقہ استعمال کیا تاکہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں۔ لیکن وہ جانتے نہیں تھے کہ اصل معاملہ کیا ہے.....؟

مجھے اپنے وطن کی مٹی اور اس کی خوشبو اپنی طرف کھینچے جاتی تھی۔ جس میں

ایسی کشش تھی کہ میں سحر زدّہ تھا۔ میرا دیس مجھے اپنا وعدہ یاد دلاتا اور تصور میں اپنی جھلک دکھلاتا۔ بس اتنا ہی مجھے بے خود کرنے کو کافی تھا۔ میں اپنی تمام زنجیریں ایک ایک کر کے توڑتا جاتا تھا جنھوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا کیونکہ معاملہ اتنا سادہ نہ تھا۔ معاملہ دل کا تھا۔ معاملہ وطن کا اور اس کی مٹّی کا تھا۔ لہٰذا مسٹر ایڈورڈ ڈبلیو کارٹر تو کیا میں کسی کے روکنے پہ بھی رکا نہ ہی مجھے رکنا تھا۔

مسٹر ایڈورڈ نے آخر پہ کہا مسٹر اسلم! آپ جس رفتار سے ترقی کر رہے ہیں وہ ایک جینیئس ہی کر سکتا ہے اور میں اپنی جگہ پہ آپ کو دیکھتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد آپ چیف ایگزیکٹو آفیسر کی سیٹ سنبھالو گے۔ میں ہنسا..... اور کہا گڈ بائے مسٹر ایڈورڈ.....۔

میں نے امریکہ میں موجود اپنے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔ اپنے تمام کاروبار بیچ ڈالے۔ اپنا گھر بھی فروخت کر دیا۔ بنکوں میں موجود تمام رقم نکلوا لی۔ میں نے گھر کا تمام سامان پاکستان منتقل کرنے کا سوچا۔ اس کے لئے میں نے ایک کمپنی بیکن موونگ اینڈ سٹوریج (Bekins Moving & Storage) سے رابطہ کیا۔ انھوں نے میرے گھر کا تمام سامان حتیٰ کہ ایک سوئی تک کو بھی بڑی مہارت سے پیک کیا۔ میں نے اپنا تمام سامان بحری جہاز کے ذریعے پاکستان روانہ کر دیا۔ اب میں آزاد تھا۔ اے پاکستان! تجھ پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں.....۔

امریکہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنا ایک بے حد مشکل فیصلہ تھا۔ میں نے ہر قسم کا عیش و آرام اور بہترین زندگی ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہ تھا مجھے معلوم تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں؟ میں نے شروع دن سے طے کر رکھا تھا کہ میں پاکستان کے ضرورت مند اور بے آسرا لوگوں کی خدمت کرنے واپس لوٹوں گا.....۔

پاکستان آمد

میں اپنے پیارے دیس پاکستان پہنچ گیا۔ میں یہاں آخری سانس تک رہنے کے لئے آیا تھا۔ پاکستان پہنچتے ہی اپنا سارا سامان کمالیہ (فیصل آباد) منتقل کیا۔ میں اپنا پورا گھر ہی اٹھا کے لے آیا تھا۔ اس میں ضروریات زندگی کا وہ سب سامان شامل تھا جو اس وقت کے مادّی طور پر جدید ترین معاشرے (امریکہ) میں لوگوں کے زیر استعمال تھا۔ اس میں کچن کا سامان مثلاً ایک چھوٹے سے ٹوسٹر سے لے کر ریفریجریٹر اور فریزر تک سب کچھ شامل تھا۔ جدید الیکٹرونکس کا سامان، ٹی وی، فوٹو کاپی مشین، ٹائپ رائٹر، کراکری، صوفے، بیڈ، کرسیاں، ٹیبل، ہزاروں گز فیبرکس کا کپڑا، بیڈ شیٹس، کمبل، تکیوں کے علاوہ واٹر بیڈ جیسی نئی ایجادات بھی شامل تھیں۔ باغیچے کا سارا سامان جیسے واٹر ہوسز (Water hoses)، پاور بلور (Power Blower)، لان موور (Lawn Muwer)، پاور ایجر (Power Edger) وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ پینسٹھ ہزار ڈالر ($65,000.00) نقد میرے پاس موجود تھے جو میں ضرورت مند افراد کی فلاح و بہبود پہ خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے لئے میرے پاس کافی قابل عمل منصوبے موجود تھے۔

دادا جی کی نصیحت پر عمل

میں نے کمالیہ کے بہترین محلِ وقوع پر آٹھ ایکڑ زمین خرید رکھی تھی۔ اس کی خریداری کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے جو آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو سناتا ہوں۔

مختار احمد نے مجھے امریکہ خط لکھا کہ ایک پاکستانی نژاد برطانوی ہمارے علاقے میں زمین خریدنے کا خواہشمند ہے۔ کمالیہ میں ریلوے پھاٹک اور نہر کے درمیان سڑک کے دونوں اطراف آٹھ ایکڑ زمین برائے فروخت تھی۔ مختار احمد نے مجھ سے استفسار کیا

تھا کہ آیا ہم اس شخص کے ساتھ مل کر زمین خرید سکتے ہیں؟ میں نے جب اس زمین کے محل وقوع کے بارے میں سنا تو فوراً ہاں کر دی کیونکہ اس زمین کو تجارتی بنیادوں پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس زمین کا سودا زبانی حد تک طے پا گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے ایک تشویش ناک خط موصول ہوا جو مختار احمد نے میری طرف لکھا تھا۔ مختار نے مجھے افسردگی سے مطلع کیا کہ ہمارے شراکت دار کے مطابق زمین بہت مہنگی ہے اور ہمارے ساتھ دھوکہ ہونے جا رہا ہے۔ لہٰذا وہ اس سودے سے اب علیحدہ ہو گئے ہیں۔ مختار احمد نے خط لکھ کر مجھ سے مشورہ مانگا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟

میں نے جوابی خط لکھا کہ ہم وہی کریں گے جو ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے اور جس کی تربیت انھوں نے ہمیں دی۔ آپ اکیلے ہی اس زمین کا سودا پکّا کرو میں کہیں سے پیسوں کا بندوبست کر کے بھیجتا ہوں کیوں کہ ہم زبان دے چکے ہیں۔

ہمارے والدین خدا کے فضل سے باعمل مسلمان تھے۔ ان کی تربیت نہ صرف اسلام کے آفاقی اصولوں کے عین مطابق تھی بلکہ انسانوں کے دریافت شدہ اور جدید علوم کے اعتبار سے بھی بہترین تھی۔ اسلام ہمیں کہتا ہے کہ وعدہ کرو تو اسے لازماً پورا کرو۔ دنیا کا ہر باشعور اور مہذّب انسان بھی یہی کہے گا۔ میں نے یہ بات مختار احمد کو اچھی طرح سمجھا دی کہ کسی بھی سودے میں ہمیں فائدے اور نقصان کا اندازہ پہلے سے ہی کر لینا چاہیے۔ اب جب کہ یہ سودا طے پا چکا ہے تو ہم اس سودے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے چاہے اس میں ہمیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

اس وقت میری مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب میں ابھی طالب علم تھا۔ میں نے بنک آف امریکہ کے منیجر رولینڈ (Mr. Rowland) سے بات کی اور ان سے درخواست کی کہ مجھے ہر حال میں قرض چاہیے۔ میں نے بڑی مشکل سے قرض لے کر اپنے بھائی مختار کو رقم روانہ کی تاکہ وہ زمین خرید سکے۔

پاکستان میں گھر کے حالات

جیسا کہ پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ ہم نے جب ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تو ہماری معاشی حالت ایک دم ہی تبدیل ہو گئی۔ ہندوستان میں ہم اپنے علاقے کے بااثر اور صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے جب کہ پاکستان پہنچنے کے بعد ہمیں ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ غریبی ہمارے گھر کا ایک فرد بن گئی اور اتنا نمایاں فرد..... جو ہر کسی کو ہر طرف سے نظر آتا تھا۔ گاؤں میں ہمارا گھر کیا تھا، ایک جھگی تھی جس میں ہمارا پورا کنبہ رہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مجھے سکول کی فیس دینا ہوتی جو محض چند روپے تھی تو یہ ایک بہت جاں گسل مرحلہ ہوتا کیوں کہ فیس کے پیسے ہمارے پاس نہ ہوتے اور وہ میں کسی سے مانگ کر ادا کرتا تھا۔

میرے امریکہ پہنچنے کے بعد اگرچہ حالات میں کافی بہتری آئی تھی تاہم ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے آپس میں عہد کیا کہ ہمیں اپنی زندگی کو تبدیل کرنا ہے۔ میں نے مختار احمد کو یقین دلایا کہ میں اسے امریکہ سے پیسے بھجواتا رہوں گا اسے چاہیے کہ وہ ان پیسوں کو بہترین کاروبار میں لگائے۔ مختار احمد نے بلاشبہ بہترین کردار ادا کیا۔

جب ہمارے حالات نے اجازت دی تو ہم نے سب سے پہلے ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ اب ہمارا اگلا کام بڑے بھائی مرید احمد اور میری بہنوں کی شادی تھی۔ یہ کام بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخوبی سر انجام پا گیا۔ اس کے بعد آہستگی سے ہمارے حالات بہتری کی جانب مائل ہوئے۔ میں جب سال میں تین مرتبہ یورپ اور دوسرے ممالک (جاپان، ہانگ کانگ، کوریا، تائیوان وغیرہ) کے دورے پر جاتا تو کم از کم ایک مرتبہ پاکستان ضرور آتا۔ جب میں پاکستان آتا تو ہم دونوں بھائیوں کی خوب محفل جمتی۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت سے بہت لطف اٹھاتے۔ حالات حاضرہ اور کاروباری حالات پر

بھی گفتگو ہوتی۔ مجھے ہر مرتبہ ایک اچھی خبر ملتی۔ مثال کے طور پر میں جب ایک مرتبہ آیا تو مختار احمد نے مجھے بتایا کہ ہمارے ساتھ ہی ایک اچھا مکان فروخت ہو رہا ہے میں نے فوراً کہا کہ خرید لو میں پیسے بھجوا دوں گا۔ میں نے وہ مکان خریدنے کے لئے نہ صرف پیسے بھجوا ئے بلکہ اس مکان کی تزئین و آرائش پہ اٹھنے والے اخراجات بھی ادا کئے۔

آہستہ آہستہ حالات تبدیل ہوتے چلے گئے۔ مختار احمد نے یکے بعد دیگرے فیصل آباد، اسلام آباد، لاہور میں بھی پلاٹ خرید لئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سائزنگ(Sizing) کا کارخانہ لگا لیا(اس میں دھاگے کو کلف لگائی جاتی ہے) ۔ مرغیوں کی خوراک تیار کرنے کا کارخانہ لگایا اور پولٹری فارم بھی کھول لئے۔ پولٹری فارمز کا کاروبار اتنا بڑھ گیا کہ ہماری اپنے علاقے میں اس کاروبار پہ عملاً اجارہ داری قائم ہو گئی۔ مختار احمد کو پولٹری ایسوسی ایشن کا سربراہ منتخب کر لیا گیا۔ ہم نے نہر اور ریلوے پھاٹک کے درمیان والی ساری زمین خرید لی جو کہ بلاشبہ محل وقوع کے اعتبار سے نہایت قیمتی تھی۔ اس کا پہلے بھی اجمالاً تذکرہ ہو چکا ہے۔

میں اپنے بھائی کی کارکردگی سے بہت خوش تھا اور جتنے زیادہ پیسے بھیج سکتا تھا، بھیجتا رہا۔ شاید ہی کوئی ماہ ایسا گزرا ہو جس میں پیسے نہ بھیجے ہوں۔ میں نے خود کو تکلیف دے کر، کفایت شعاری سے، بلکہ بعض لوگوں کی نظر میں کنجوسی کر کے پیسے گھر بھجوائے۔ اس دوران جس طرح میں نے اور میری بیگم نے امریکہ میں گزارا کیا وہ ہمارا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ جب بھی مختار احمد لکھتے کہ ہم نے فلاں جگہ پہ زمین خریدنی ہے اتنے پیسے چاہئیں تو میں اسے ہر حال میں پیسے بھجواتا؛ چاہے مجھے کسی سے پیسے ادھار ہی کیوں نہ لینے پڑتے۔

1972ء میں جب میں پاکستان مستقل قیام کی غرض سے لوٹا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہم اپنے علاقے کے خوشحال ترین زمیندار تھے۔ کئی کاروبار اور

جائیدادیں اللہ پاک نے ہمیں عطا کر دی تھیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل شروع ہو گئی تھی۔ غربت اور ہمارے درمیان اجنبیت کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل تھا جو اس نے ہم پر کیا۔

فلاحی مرکز

سب سے پہلے میں نے اپنے لئے ایک ٹھکانہ بنانے کا سوچا۔ میں نے اسی آٹھ ایکڑ زمین پہ گھر اور فلاحی مرکز بنانے کا ارادہ کیا جس کی خریداری کا ذکر میں نے اوپر کی سطور میں کیا۔ نقشہ میں امریکہ سے بنوا کے لایا تھا۔ آٹھ ایکڑ پہ محیط اس گھر میں عورتوں اور مردوں کے لئے علیحدہ علیحدہ نہانے کا تالاب تھا۔ جاگنگ ٹریک، ورزش کے جدید سامان سے مزّین جم، نیز مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ ٹینس کورٹ بھی شامل تھے۔ ایک بہت بڑے ہال کے علاوہ بچّوں کو حفظ کرانے نیز تفسیر اور حدیث کی تعلیم کے لئے بڑے ہال بھی نقشے میں شامل تھے (پہلا فری میڈیکل کلینک یہاں 1965 سے کام کر رہا تھا)۔ میں نے صدقے کے طور پر ایک بکرا ذبح کروایا اور کام شروع کر دیا۔ عمارت کی بنیادیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں کہ مجھے انتہائی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

مقصد حیات میں رکاوٹ

میں اب پاکستان میں تھا۔ ایک تو میں اپنی باقی زندگی اپنی دھرتی ماں کی آغوش میں بسر کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا میں پاکستان کی موجودہ حالت سے دکھی تھا اور اپنی طرف سے اس کو سنوارنے کا عزم رکھتا تھا۔ شاید اتنا سا جتنا اس چڑیا کی چونچ میں پانی جو عشق پہ آئی افتاد کم کرنے نکلی تھی دراصل ساری بات ہی نیّت کی ہے اگر میں اس چڑیا جتنا کام ہی کر لیتا تو بہت تھا۔

میں چاہتا تھا اور چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے ہمیں پاکستان بنا کے دیا ہے ان کی

زندگی کے مطالعہ اور پاکستان کے بارے میں دی گئی ان کی رہنما ہدایات کے مطابق پاکستان چلانے کی ضرورت ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ ہدایات کیا ہیں.....؟

میرا ارادہ تھا کہ میں پاکستان میں تعلیم، غربت اور صحت کے شعبوں میں کام کروں۔ بے آسرا اور نادار لوگوں کی مدد کروں۔ ناانصافی کے خاتمے اور مذہبی رواداری کے لئے کام کروں۔ مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ کام اتنا تھا کہ زندگی چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ نوجوان نسل کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا پاکستان بنانے کی ترغیب دوں۔ پاکستان کو ان دونوں رہنماؤں کے متعیّن کردہ خطوط پہ استوار کیا جائے۔ نوجوان نسل نیز بچّوں کے کردار کی تربیت ایسے ہو کہ وہ قائداعظم کے نئے پاکستان کی بنیاد رکھیں۔ (صباہومز اسی نظریئے کی بنیاد پہ قائم کیا گیا ہے)۔ اگر علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کو اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ پاکستان کو صراط مستقیم پہ گامزن کرتے، تو کیا ہوا، ہم اپنی سی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ہم سب کو ان کے مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ میں انھی کے مشن کو لے کر آگے چلتا ہوں۔

معلوم و نامعلوم رشتہ داروں کی آمد

غیر متوقّع صورت حال یوں پیدا ہوئی کہ میرے وہ تمام رشتہ دار جن کو میں جانتا تھا اور وہ بھی جن کو میں نہیں جانتا تھا، ایک ایک کر کے میرے پاس پہنچنا شروع ہو گئے۔ محلّے کے لوگ اس کے علاوہ تھے۔ ان کو خبر ملی تھی کہ میں حال ہی میں "ولایت" سے واپس آیا ہوں اور بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ سب نے باری باری آنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک خود کو اچھّا اور دوسروں کو برا ثابت کرنے کے درپے تھا۔ ہر کوئی اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی میرے پاس بیٹھا اپنے فضائل بیان کرتا اور

دوسروں کی غیبت کرتا، خود کو بہترین اور دوسروں کو ہیچ اور گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں چونکہ حضور پاک ﷺ کی اس حدیث سے واقف تھا جس میں آپ ﷺ نے غیبت کو زنا سے بڑا گناہ قرار دیا تو اس صورت حال نے مجھے انتہائی بیزار کیا۔ میں ایک بہت اعلیٰ اور ارفع مقصد لے کر پاکستان آیا تھا اس کی خاطر اپنی پر تعیّش اور کسی حد تک شاہانہ زندگی کو ٹھکرا آیا تھا۔ اب پاکستان کی صورت حال میرے لئے پریشان کن ہونا شروع ہوگئی۔ یہ سلسلہ آئے روز بڑھتا گیا حتّٰی کہ میرا ناک میں دم ہو گیا۔

میں کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ میرے پاس سے اٹھ جاؤ یا میرے پاس نہ آیا کرو۔ ایسا کرنا میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں ان کو اپنی طرف سے یہ بتانے کی کوشش ضرور کرتا کہ مجھے ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں مگر ان کو پروا میری نہیں، اپنی دلچسپی کی ہوتی اور ان کی دلچسپی اسی میں تھی۔

دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے قریبی رشتہ داروں سمیت سب لوگ میرا ارادہ توڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ جسے معلوم ہوتا کہ میں اتنی قیمتی زمین پہ ایک فلاحی مرکز بنا رہا ہوں تو وہ مجھے اس سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وہ عام زمیندار لوگ تھے جو کسی کو اپنی زمین کا ایک مرلہ بھی مفت میں نہ دیتے تھے بلکہ اس کے لئے قتل و غارت گری ہو جاتی۔ چہ جائیکہ میں آٹھ ایکڑ زمین پہ ایک فلاحی مرکز کھڑا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے صبح سے شام تک بھانت بھانت کی بولی سننے کو ملتی۔ میں لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتا۔ مگر وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بالکل نہ تھکتے۔ ایک کی جگہ دوسرا لے لیتا دوسرے کی جگہ تیسرا..... جب کہ میں اکیلا ان سب کی سنتا اور برداشت کرتا تھا.....۔

میں امریکہ میں اپنا سب کچھ بیچ کر پاکستان آیا کہ مجھے یہیں رہنا اور کام کرنا ہے مگر محدود سوچ کے حامل لوگوں نے میری راہ میں روڑے اٹکانا شروع کر دیئے تھے۔ میں حتمی طور پر فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پریشانی کے عالم میں تعمیر

کا کام رکوا دیا۔ میں بے حد افسردہ تھا۔ ذہنی انتشار کا عالم یہ تھا کہ میں کوئی بات سکون سے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ذہنی پریشانی اور دباؤ عروج پر تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ یکدم ہی مجھے ماں اور ان کی گود شدّت سے یاد آئی۔ میں نے اپنے آس پاس دیکھا۔ مجھے ماں نظر نہ آئی۔ اداسی میری رگ رگ میں سما گئی تھی۔ میری بے آواز آہ وفغاں میرے وجود کی گہرائیوں سے اٹھتی اور انھی گہرائیوں میں ڈوب جاتی۔ کوئی تسلی دینے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا جس نے ماں اور ماں کی محبت کو تخلیق کیا۔ میرا خیال تھا ہو سکتا ہے وہاں جا کے مجھے ذہنی اذیّت سے کچھ نجات ملے اور میں درست فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاؤں۔

کہاں جاؤں.....؟

تو اے نسل آدم! میں یہ گوش گزار کرتا چلوں کہ میں درجنوں مرتبہ پوری دنیا گھوم چکا ہوں۔ اہرام مصر (Egyptian Pyramid) ، پیرس کا ایفل ٹاور (Eiffel Tower Paris) ، لندن (London) ، اٹلی (Italy) ، سپین (Beauty of Spain) ، جاپان کی بے مثال میزبانی کا لطف (Fantastic Hospitality of Japan) ، نیاگرا واٹر فالز، کینیڈا (Niagra Water Falls Canada) ، ناقابل یقین ڈزنی لینڈ، امریکہ (Unbelievable Disneyland USA) ، مشہور زمانہ براڈوے شوز نیو یارک (World Famous Shows of Broadway) ، سارڈیز ڈنر نیویارک (Sardi's Dinner, New York) ، لیریز پرائم رب لاس اینجلس (Lawry's Prime Rib, Los Angeles) ، تاج محل، بھارت (Taj Mahal, India) ، پوری دنیا میں فینسی لیموزین (Fancy Shoufered Limousine throughout the World) ، دریائے ہڈسن نیویارک (Hudson River, New York) ، بوٹنگ اور واٹر سکائینگ (Boating & Water Skying) سمیت تمام

عالمی تفریحی مقامات بھی دیکھ لئے لیکن اس وقت یہ سب کچھ بے مقصد لگ رہا تھا۔ میرا دل ان کی طرف مائل نہ تھا حالانکہ پوری دنیا کے سیاح ان جگہوں پر جانے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔

میں بھی بے چین تھا مگر مجھے یہ دنیا بے کیف لگتی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ جس بے چینی کا شکار میں رہا تھا ایسا معاملہ صرف میرے ساتھ درپیش تھا یا ہر کوئی زندگی کی کٹھن راہوں پہ چلتے چلتے یکدم ایسی صورت حال کا شکار ہو جاتا ہے جب اس کے سامنے زندگی کا سب سے بڑا کھیل شروع ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں لوگ مختلف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ردعمل زندگی یا موت، تخت یا تختہ، آر یا پار کا فیصلہ کرتا ہے۔

مقام حیرت

میری زندگی کا مقصد خلق خدا کی خدمت تھا۔ اس میں اتنی بڑی رکاوٹ میرے لئے ناقابل برداشت تھی لیکن اس کا سارا بوجھ میں نے اپنے اوپر لے لیا۔ میں نے ان تمام لوگوں کو ردعمل کے طور پہ صبر دکھایا۔ میں نے سنا تھا کہ ہمارے پیارے حضور پاک ﷺ نے خود تکلیف برداشت کر لی لیکن تکلیف دینے والے کو کبھی کچھ نہ کہا بلکہ اس کے حق میں دعا فرمائی تھی۔

تمام مقامات جن کا اوپر تذکرہ ہوا، انسانی غوروفکر اور کاوش کا نتیجہ ہیں۔ انسان نے ربّ کی دی ہوئی صلاحیتیں استعمال کر کے ایسے ایسے شاہکار تخلیق کئے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ فطری خوبصورتی اور انسانی مسّاعی نے مل کر ایسے انداز اختیار کئے ہیں کہ انسان خود ہی حیران رہ جاتا ہے لیکن میں حیران نہ ہوا تھا۔

میں حیران ہوا تو تب، جب میں سخت پریشانی اور مصیبت کے عالم میں کعبہ شریف پہنچا۔ میری نگاہ جب مقدّس اور جاہ وجلال سے پُر اللہ کے گھر پر پڑی تو مجھے اپنے اندر کچھ پگھلتا محسوس ہوا۔ میں نے اپنا ذہنی دباؤ اور پریشانی تحلیل ہوتے دیکھی۔ لمحوں

میں میرے اندر گہرا سکون در آیا..... تب.....میں بے حد حیران ہوا.....۔

میں نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں جاتے ہی سسکنا شروع کیا جو آہستہ سے بڑھتا گیا۔ یکدم درد میرے اندر سے بے حال ہو کے اٹھا اور میں دھاڑیں مار مار کے رو دیا۔ دھیرے دھیرے سے قرار میرے اندر اترا.....۔

نہ جانے اس میں کیا راز ہے کہ جب بھی آپ کعبہ شریف پہ نگاہ ڈالیں تو ہر مرتبہ ایک نیا لطف محسوس ہوتا اور نئی کیفیت جنم لیتی ہے.....چاہے آپ گھنٹوں بیٹھے دیکھتے رہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی لیکن اس کے لئے آپ کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں پر کائنات کے مالک اور تمام مخلوق کے ربّ کی رحمت ہر دم اترتی رہتی ہے۔

میں ایسے مقام پہ جا پہنچا تھا جہاں ربّ اپنی مخلوق کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیتا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بہترین جگہ ہے۔ میں وہاں پہنچ کر اپنی ساری پریشانیاں اور تفکّرات بھول گیا۔ میں اپنے گھر، گھر والوں، حتّٰی کہ خود کو بھول گیا۔ گہری نیند ایسی کیفیت.....ماں کی گود ایسا سکون..... سبحان اللہ..... سبحان اللہ.....

میں ہر روز خانۂ کعبہ جا کے گریہ وزاری کرتا۔ پورے دن میں بمشکل ایک مرتبہ کھانا کھاتا۔ زیادہ تر آبِ زمزم پیتا رہتا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے کوئی کمزوری لاحق نہ ہوئی۔ مدینہ منورہ پہنچ کر میں روضۂ رسول ﷺ پہ حاضری دیتا اور جالیاں پکڑ کے روتا رہتا۔ میری یہی دعا ہوتی کہ یا اللہ پاک مجھے درست فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما (آمین)۔

ریاض الجنّۃ میں عزّت افزائی

میں اللہ کے گھر جا کے دنیا و مافیھا سے ایسا بے خبر ہوا کہ ایک ماہ گزر گیا اس دوران اپنے گھر فون تک نہ کیا۔ میں عبادت اور محترم مقامات کی زیارت کرتا رہا۔ میں کوئی فیصلہ کر کے ہی پاکستان جانا چاہتا تھا۔ میں اس مقام کی جانب سے جو تمام جہان والوں کے

لئے ازّل سے رشد وہدایت کا مرکز ہے اپنی ہدایت کا منتظر تھا کیونکہ میں بھی اس جہان کی ایک اکائی کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ اس معاملے میں کل کا اطلاق جز پر بھی تو ہونا چاہیے تھا۔ یہاں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔

میں مدینہ شریف میں حضور پاک ﷺ کے روضۂ مبارک کی زیارت کے دوران جب وہاں پہنچا جہاں اصحاب صفّہ کا چبوترہ ہے تو وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ جس نے جہاں جگہ پائی وہ بیٹھ چکا تھا۔ اب وہاں کسی اور کی گنجائش نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں.....؟ اسی اثناء میں ایک شخص تیزی سے میری جانب آیا۔ میں اسے پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے کہا "میں نہ جانے کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اس نے میرے لئے مختص جگہ مجھے دکھائی اور کہا کہ آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ شاید وہ غلط فہمی کا شکار ہے اور یہ کہ میں اس کا مطلوبہ بندہ نہیں مگر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "نہیں جناب! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ یہ آپ کے لئے ہی ہے۔" میں جگہ پا کر خوشی سے پھولے نہ سمایا اور رب کا شکر ادا کیا۔

مدینہ منوّرہ پچھلے تقریباً چودہ سو سال اور خانۂ کعبہ زمانہ قدیم سے اب تک پوری دنیا بالخصوص مسلمانوں کے لئے ہدایت کا مرکز ہیں۔ ہر دور میں مومنین نے ہدایت کے ان مراکز میں موجود علمی وروحانی وسیلوں سے علم حاصل کیا بعد ازاں اسے پوری دنیا میں پھیلایا۔ وہاں جا کے آپ کو آپ کے سوالوں کے جواب ملتے ہیں۔ گتھیاں سلجھتی ہیں۔ خوابوں کی تعبیر ملتی ہے۔ وہاں سب کچھ ملتا ہے بلکہ سب کچھ وہیں سے ملتا ہے۔

حج کی فرضیت اور اس کی روحانی لذت بلاشبہ قابل ذکر ہیں اس کا اندازہ وہاں جا کے ہی ہوتا ہے۔ کیسی ہی الفاظ کی الٹ پھیر کر لی جائے اس لذت حقیقی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خانۂ کعبہ میں پوری دنیا کے مسلمان ایک جگہ پہ اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے سے

متعارف ہوتے ہیں۔ اس سے سماجی رابطے کا بہت بڑا وسیلہ وجود میں آتا ہے۔ حج ایک راز ہے جسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان تیس دنوں کے اندر زندگی نئے نئے مفہوم کے ساتھ مجھ پر منکشف ہوئی۔ اللہ کا گھر ایک ایسا مقدّس مقام ہے جہاں جا کے کوئی بھی خالی ہاتھ واپس نہیں آتا۔ میں سرشاری کے عالم میں پاکستان لوٹا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے.....؟

امریکہ واپسی

پاکستان آ کر میں نے والدین سے گزارش کی کہ وہ مجھے امریکہ واپس جانے کی اجازت دیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں باقاعدگی سے پاکستان آتا رہوں گا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ان سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ان کی اجازت ملنے پر میں نے امریکہ واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ میں اپنی تمام جمع پونجی امریکہ سے پاکستان منتقل کر چکا تھا اور پاکستانی قوانین کے مطابق اب ان پیسوں کو واپس نہیں لے جا سکتا تھا۔ الاّیہ کہ چور دروازے (Black Market) سے..... مگر میں یہ راستہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنا سب کچھ امریکہ سے پاکستان لے آیا تھا اور اب پریشان تھا کہ اس سامان کا کیا کیا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ میں نے وہ سامان مختار بھائی اور ان کی بیگم کے پاس امانتاً رکھوا دیا اور کہا کہ میں جب واپس آؤں گا تو آپ سے لے لوں گا۔

براڈوے میں واپسی کی دعوت

یوں میں ایک مرتبہ پھر خالی ہاتھ امریکہ پہنچا لیکن اس مرتبہ کچھ تھوڑا سا مختلف تھا۔ اب میرے پاس علم اور تجربہ کے علاوہ وسیع تعلّقات تھے جنھیں پانے کے لئے

میں کڑی مشقت سے گزرا تھا۔ جلد ہی میرے تمام جاننے والوں کو پتہ چل گیا کہ میں واپس آچکا ہوں۔ میرے سابق باس مسٹر مارٹن گلیزر(Mr. Marton Glazor) نے مجھے اپنے گھر کھانے پہ بلایا وہ چونکہ میرے بڑے اچھے دوست بھی تھے اس لئے میں نے ان کی دعوت فوراً قبول کرلی۔ انھوں نے میری تواضع انتہائی لذیذ کھانوں سے کی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے اصل موضوع پر آگئے، کہنے لگے ”مسٹر ایڈورڈ کارٹر نے مجھے کہا ہے کہ کسی بھی طریقے سے صغیر اسلم کو واپس لایا جائے کیونکہ ان کے جانے سے ہمیں گزشتہ سال تین ملین ڈالرز($30,00,000) کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مسٹر اسلم! ہم آپ کو ایک لاکھ ڈالر($100,000) سالانہ تنخواہ دینے کو تیار ہیں۔“(یاد رہے کہ اس وقت عموماً بائر مینیجر کی تنخواہ سترہ سے تیس ہزار امریکی ڈالر سالانہ تک ہوتی تھی)۔

میں نے کہا”مسٹر گلیزر! آپ کا بہت بہت شکریہ! لیکن بات یہ ہے کہ شیر پنجرے سے باہر آ کر ایک مرتبہ آزادی کا مزہ چکھ لے تو وہ دوبارہ پنجرے میں بند نہیں ہونا چاہتا۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں اب آزاد رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں اور نوکری کے بجائے اپنا کاروبار کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔“

میں نے ان کی پیشکش نرمی کے ساتھ مسترد کردی۔

ذاتی کاروبار کا آغاز

میرے پاس کوئی سرمایہ وغیرہ تو تھا نہیں لہٰذا میں نے بنک سے پچاس ہزار ڈالر کا قرض لیا۔ اس رقم سے میں نے کوسٹا میسا(South Coast Plaza, Costa Messa. California) میں ایک سٹور خریدا۔ یہ کپڑے اور گھریلو اشیاء کی سجاوٹ کا سٹور تھا۔ یہ سٹور پہلے سے ہی چل رہا تھا اور بہترین لوکیشن پر واقع تھا۔ اس کا پرانا مالک اسے کسی وجہ سے بیچنا چاہ رہا تھا۔ مجھے اس میدان میں وسیع تجربہ حاصل تھا اس لئے میں نے اسے بہترین موقع تصور کیا۔ اس سٹور کا نام تھا”گولڈن نیڈل“(Golden Needle)۔ یہ

1972ء کا زمانہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ غریب طبقے کے بجائے ہم درمیانی یا بالائی طبقے کے لئے کام کریں گے۔ میں نے اس وقت کے مشہور ڈیزائنرز سے رابطہ کیا جو ریڈی ٹو وئیر (Ready to Wear) ڈریس تیار کرتے تھے۔ یہ ڈیزائنر اعلیٰ درجے کا کپڑا استعمال کرتے جو بہت مہنگا ہوتا۔ یہ قسم قسم کے ڈیزائن تیار کرتے اور اس کے اوپر اپنا لیبل لگا کر مختلف سٹوروں کو فروخت کرتے۔ جہاں نت نئے فیشن کے شوقین لوگ اس لباس کو بھاری قیمت پر خریدتے تھے۔

میں نے مختلف ڈیزائنرز مثلاً اینٹ(Eint) ، سینٹ(Saint) ، لارینٹ (Laurant) ،جیفری بین(Jeferey Bean) اور کیلون کلائن(Kelvin Kline) سے رابطہ کیا اور ان کے ساتھ معاہدہ کیا کہ ڈیزائن کی تیاری کے بعد جو بھی کپڑا بچے وہ مجھے فروخت کر دیں۔ اس معاہدے کی رو سے ان لوگوں کے پاس سے جو کپڑا بچتا وہ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ ان دنوں عام سٹور پر کپڑے کی نوعیت کے لحاظ سے قیمت پچاس سینٹ سے لے کر دس ڈالر($10) تک ہوتی جبکہ ہمارے سٹور پر کپڑے کی قیمت دو ڈالر($2) سے لے کر ستّر ڈالر($70) فی گز تک ہوتی تھی۔ یہ معمول کی قیمت تھی ورنہ ہم نے آٹھ سو پچاس ڈالر(850) فی گز تک بھی کپڑا فروخت کیا(وہ کپڑا پیرس میں موجود دنیا کے بہترین ڈیزائنرز سے منگوایا گیا تھا)۔ ہمارا مقابلہ عام سٹوروں سے نہیں بلکہ مشہور ڈیزائنرز کا لباس فروخت کرنے والوں سے تھا۔ یہ لباس جن نامور سٹوروں پہ ملتے ان میں نیمن مارکس(Neiman Marks) ، سیکس(Sacks) اور برگ بوف گڈ مین (Bergboff Good man) جیسے بے مثال سٹور شامل تھے۔

ہمارے دام اگرچہ سستے نہ تھے مگر اعلیٰ معیار اور بہترین سروس کی وجہ سے لوگ ہمیں ترجیح دیتے۔ اللہ پاک کی کرم نوازی سے ہمارا کام چل نکلا اور روز بروز ترقی

کرنے لگا۔ ہم نے ایسی اچھی شہرت پائی کہ لوگ لمبا فاصلہ طے کر کے ہمارے پاس آنے لگے حالانکہ راستے میں ہم سے کئی اچھے سٹور آتے تھے۔ میں نے اپنے کاروباری اصول و ضوابط ایسے رکھے کہ ہماری خدمات دور دور تک معروف ہو گئیں۔ میں اپنے کاروباری معیار کے سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

معیاری اصول

"گولڈن نیڈل" میں ایک مرتبہ ایک عورت آئی۔ اس نے بتایا کہ چند ہفتے بعد اس کی بیٹی کی شادی ہے اور وہ اپنے گھر کی سجاوٹ کے لئے اپنی پسند کے سامان کا آرڈر دینا چاہتی ہے۔ یہ آرڈر تقریباً پنتالیس ہزار ڈالر ($45000) کا تھا اور یقیناً ایک بڑا آرڈر تھا۔ جب اس نے مجھے آرڈر نوٹ کروایا تو میں بہت خوش ہوا۔ اس نے پوچھا کہ میں اسے یہ آرڈر کب تک تیار کر کے دے سکتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ ہمارا کاروباری اصول ہے کہ ہم انفرادی پسند کا آرڈر ایک ماہ میں تیار کرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ پریشان ہو گئی۔ کہنے لگی کہ اس کی بیٹی کی شادی سر پہ ہے اور اسے یہ آرڈر ایک ہفتے میں چاہیے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ براہ مہربانی آپ یہ آرڈر مجھے ایک ہفتے میں تیار کر کے دے دیں۔

میں اس کا اصرار دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے پتہ تھا یہ بہت بڑا آرڈر ہے اس لئے مجھے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے کچھ دیر غور کیا اس کے بعد کہا: "محترمہ دراصل بات یہ ہے کہ ہم آرڈر ایک ماہ سے پہلے تیار کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور اپنی طرف سے پورا زور لگائیں گے لیکن میں آپ سے یہ آرڈر ایک ہفتے میں تیار کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ ہمارے سٹور کی پالیسی کے خلاف ہے۔"

اس نے کہا "میں نے سنا ہے کہ آپ جو زبان دیں اسے ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔ میری بیٹی کی شادی کی تاریخ تیزی سے نزدیک آ رہی ہے اس لئے براہ مہربانی مجھے یہ آرڈر ایک ہفتے میں تیار کر کے دے دیں۔"

میں نے کہا ''مادام! وعدہ کرنے میں بہت سی قباحتیں در پیش ہیں۔ ہمیں آپ کی پسند کا کپڑا وقت پہ نہ ملے یا اگر ہمارا کوئی کاریگر بیمار ہو جائے تو یہ آرڈر وقت پر تیار نہیں ہو پائے گا۔ اس لئے وعدہ ایک ماہ کا ہی ہو گا۔ ہاں! میں یہ آرڈر ایک ہفتے میں پورا کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔''

اس نے کہا کہ تب وہ یہ آرڈر کسی اور کو دے گی جو اسے جلد تیار کر دے۔

میں نے کہا ''جیسے آپ کی مرضی۔''

چند دن بعد وہ خاتون دوبارہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی ''میں نے ایک اور جگہ بات کی تھی۔ انھیں آرڈر دیا اور کچھ رقم پیشگی بھی ادا کر دی مگر وہ دھوکے باز لوگ ہیں۔ مجھے ہر روز طرح طرح کے بہانے بنا کر ٹالتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک کام ہی شروع نہیں کیا۔''

میں نے کہا ''میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

اس نے کہا ''آپ مہربانی فرما کر میرا آرڈر ایک ہفتے میں تیار کر کے دے دیں۔ میں نے آپ کے سٹور کی بہت تعریف سنی ہے مجھے بہت جلدی ہے۔''

میں نے پھر اپنی ایک ماہ والی بات دہرائی۔ جب خاتون نے دیکھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تو اس نے کہا ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔ اس نے مجھے آرڈر نوٹ کروایا، کچھ پیشگی رقم جمع کروائی اور چلی گئی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے ہدایت کی کہ میں ایک ماہ میں یہ آرڈر تیار کر دوں۔ جوں ہی وہ رخصت ہوئی میں نے اپنے منیجر کو بلایا اسے آرڈر کی فہرست تھمائی اور کہا ''میری بات غور سے سنو! اس آرڈر کے لئے کپڑا ابھی سے منگوا لو اور کوشش کرو کہ آج ہی آجائے۔ اگر یہ کپڑا لوکل مارکیٹ سے نہ ملے اور ہمیں مشرقی ساحل (East Coast) سے منگوانا پڑے تو آپ ہوائی جہاز کے ذریعے منگوا لو۔ ہمیں یہ آرڈر ایک ہفتے میں تیار کرنا ہے۔''

خوش قسمتی سے مطلوبہ کپڑا اگلے روز ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اپنے منیجر سے کہا کہ یہ کپڑا لے کر کارخانے میں جاؤ اور کارخانے کے منیجر سے کہو کہ اپنے تمام کاریگر یہ آرڈر پورا کرنے پر لگا دے۔ باقی سارے کام چھوڑ دے۔ ہم نے یہ آرڈر ایک ہفتے میں تیار کرنا ہے۔ تمام لوگوں کی محنت اور توّجہ سے وہ آرڈر ایک ہفتے سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔

میرے منیجر نے جب فون کر کے خاتون کو اپنا آرڈر وصول کرنے کو کہا تو اسے یقین ہی نہ آیا اسے لگا شاید ہم مذاق کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اس نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اس کی خوشی قابل دید تھی۔ وہ بار بار ہمارا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اسے جو خوشی اور اطمینان حاصل ہوا وہ ہمارے لئے باعث افتخار تھا اور یہی وجہ تھی جس نے ہمارے کاروبار کو چار چاند لگائے۔

دراصل مجھے علم تھا کہ یہ آرڈر ایک ہفتے میں تیّار ہو جائے گا لیکن میں کسی بھی غیر متوقّع صورت حال کے پیش نظر وعدہ کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی وعدہ خلافی سرزد ہو جو ہماری ساکھ متاثر کرے۔ میں نے محض اسلام کے اصولوں کی پاسداری کی اور اتنے بڑے آرڈر کو بھی ہاتھ سے جانے کا خطرہ مول لیا۔ اسلام ہمیں اپنا وعدہ ہر حال میں پورا کرنے کا حکم دیتا ہے اگر کسی بات کے بارے میں شک ہو کہ آپ پورا نہیں کر سکیں گے تو آپ وعدہ ہی نہ کریں۔

سروس کا ایسا معیار ہماری شہرت کی بڑی وجہ بنا۔ میں اس بات پہ یقین رکھتا تھا کہ گاہک کو جو زبان دی جائے اس کو ہر حال میں پورا کیا جائے۔ ''گولڈن نیڈل'' کو ایک اور وجہ سے بھی شہرت نصیب ہوئی۔ آپ اسے اتفاقیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں تو اسے اوپر والے کی خصوصی کرم نوازی سمجھتا ہوں۔

فوری لباس(Insta Dress)

ایک مرتبہ ایک خاتون ہمارے سٹور پر آئی۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی دن سے مختلف سٹوروں کے چکر لگا رہی ہے لیکن اس کی پسند کا لباس نہیں مل رہا حتّٰی کہ آج پارٹی کا دن آ پہنچا ہے جس میں اس کی شرکت انتہائی ضروری ہے مگر اس کے پاس پارٹی میں پہننے کو مناسب لباس نہیں اس لئے ہر لمحہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دوسروں سے مختلف نظر آنا چاہتی تھی اس لئے اسے ایک خاص قسم کے لباس کی تلاش تھی۔

میں اسے اپنے ساتھ اس حصے میں لے گیا جہاں ہمارے پاس مختلف ڈیزائن (پرنٹ ڈیزائن، سالڈ ڈیزائن، اور ایمبوسڈ ڈیزائن) کے کپڑوں کے رول پڑے تھے۔ میں نے اسے وہ کپڑا دکھایا اور کہا ”آپ کوئی ایک ڈیزائن پسند کر لو آپ کے سامنے سو سے زیادہ ڈیزائن پڑے ہیں میں آپ کو محض دس منٹ میں آپ کی پسند کا لباس تیار کر کے دوں گا۔“

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی!

”مسٹر اسلم! میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں فضول میں ضائع کر سکوں۔ آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ کتنا وقت لگے گا۔“

میں نے کہا: ”میڈم! گھوڑا بھی حاضر ہے اور میدان بھی۔ آپ اپنی پسند کا لباس تو منتخب کرو۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا یقین آپ کو جلد ہی آ جائے گا۔“

آخر کار اس نے ہچکچاتے ہوئے ایک لباس پہ ہاتھ رکھ دیا کہ یہ اسے پسند ہے۔ میں نے اپنی کاریگر خاتون کو بلایا جس نے اس عورت کا ناپ لیا۔ میں نے اپنی ملازم خاتون کو ہدایت کی کہ وہ لباس تیار کر کے جلد از جلد لے آئے۔

یہ پہلے سے تیار شدہ لباس(Ready made Dress) تھا۔ جس میں صرف جسم کے اوپری حصے کا ناپ لے کر اس کے مطابق محض ایک سلائی لگنی تھی اور اس پر

زیادہ سے زیادہ چند منٹ صرف ہوتے تھے۔ ابھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ لباس تیار ہو کے آ گیا۔ میں نے وہ لباس خاتون کے حوالے کیا اور کہا کہ وہ کمرے میں جا کے لباس کو پہن کے جانچ لے۔

جب وہ لباس پہن کے باہر آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے یقیناً خود کو آئینے میں دیکھ لیا تھا اور بہت زیادہ خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ لباس اسے پسند آیا تھا۔

اس نے چہکتے ہوئے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ" یہ حیرت انگیز ہے لیکن اب مجھے پارٹی کی طرف بھاگنا ہو گا۔"

وہ جلدی میں رخصت ہو گئی۔

گولڈن نیڈل کی شہرت

چند دن بعد وہ عورت دوبارہ ہمارے سٹور پر آئی اور رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد پوچھا "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟"

میں نے کہا "میں آپ کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ آپ نے ہم سے ایک لباس خریدا تھا۔"

وہ کہنے لگی "میں ایک صحافی ہوں اور "اورنج کاؤنٹی رجسٹر" (Orange County Register) نامی اخبار میں کام کرتی ہوں۔ آپ کا فوری لباس کا کام اتنا اچھا اور لوگوں کے لئے فائدہ مند ہے کہ میں چاہتی ہوں سب لوگوں کو اس سہولت کے بارے علم ہونا چاہیے۔"

میں نے اسے لباس کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ مختلف ڈیزائن دکھائے اور طریقۂ کار کے بارے میں بتایا۔

چند دن بعد اس نے گولڈن نیڈل سٹور اور فوری لباس کے بارے میں کالم

لکھا۔ آرٹیکل کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا تھا۔

"آج کل فوری کھانا(Instant Food) ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ ہر کام میں جلدی نے کپڑوں کی صنعت پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اس معاملے میں صغیر اسلم ایسا شخص ہے جس کی مشین کی سوئی اتنی تیز ہے کہ وہ تقریباً دس منٹ میں فوری لباس تیار کرکے دے سکتی ہے۔"

اس نے اپنے کالم میں فوری لباس کا تعارف پیش کیا اور تفصیل سے ہمارے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی۔ فوری لباس کی تصاویر شائع کیں۔ اس کی خصوصیات بیان کیں اور تعریف و توصیف کی۔ (درحقیقت یہ میرا کارنامہ نہیں تھا بلکہ یہ لباس پہلے سے مارکیٹ میں موجود تھا مگر اس حوالے سے شہرت اللہ نے میرے مقدّر میں لکھ رکھی تھی)۔

یہ کالم بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔

لاس اینجلس ٹائمز میں کالم

کچھ دن بعد میری سیکرٹری نے بتایا کہ میری لولوتھر(Mari Lu Luther) جو لاس اینجلس ٹائمز (LA Times) کی فیشن ایڈیٹر اور کالم نویس ہیں، آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ میرے لئے حیرانگی کی بات تھی کیوں کہ میں اس عورت کو جانتا تھا وہ بڑی پاورفل عورت تھی، عام طور پر کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ میں نے جا کر ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔

میری لولوتھر: "مسٹر اسلم آپ مجھے پچھلے کئی سالوں سے جانتے ہیں۔ آپ کے پاس اگر اتنی اچھی سٹوری تھی تو وہ آپ نے مجھے کیوں نہیں بھیجی۔ آپ نے ایسے اخبار کا انتخاب کیا جو ہم سے اچھا تو نہیں۔"

میں: "میں آپ کو براڈوے کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ آپ

سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ میں آپ کو جدید فیشن کے بارے میں خبریں دینا چاہ رہا تھا لیکن آپ نے کبھی لفٹ ہی نہ کرائی۔"

میری لولو تھر: "آپ مجھے یہ بتائیں کہ میں آپ کو کب ملنے آسکتی ہوں"؟

میں نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا۔ جب وہ ہمارے سٹور میں آئی تو اس وقت ہر طرف گاہک ہی گاہک تھے اور ہمارے تمام کاریگر مصروف تھے۔ میں نے اسے تمام ڈیزائن دکھائے اور فوری لباس کا تعارف پیش کیا۔ وہ پہلے سے ہی متاثر لگ رہی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ مزید پرجوش ہو گئی اور بڑی دلچسپی سے پوچھا: "مسٹر اسلم! مجھے بتایئے آپ نے یہ سب کیسے کیا؟"

میں نے کہا" یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ میں نے اس لباس کو ایجاد نہیں کیا بلکہ یہ تو کئی سالوں سے مارکیٹ میں موجود تھا۔ میں نے اسے صرف لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس میں میرا کمال بہت کم ہے بلکہ ساری اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے۔"

میری لولو تھر: "نہیں نہیں، یہ قابل فخر ایجاد آپ ہی کی ہے۔ کیا میں آپ کو صرف صغیر کہہ سکتی ہوں؟" (امریکہ میں کسی سے بے تکلّف ہونے کا یہ مروّجہ انداز ہے کہ آپ مخاطب کو اس کے پہلے نام سے پکاریں)۔

میں نے کہا" جی کیوں نہیں! آپ یقیناً مجھے اس نام سے مخاطب کر سکتی ہیں۔"

اس نے کہا "آپ کا بہت شکریہ۔ یہ میرے لئے عزت کی بات ہے۔ آپ کے اس کارنامے پر کالم لکھنا بھی میرے لئے اعزاز ہے۔ میں لاس اینجلس ٹائمز میں ایک سنڈیکیٹڈ کالم (Syndicated Column) لکھوں گی جو امریکہ کے پنتالیس (45) مختلف اخباروں میں شائع ہو گا۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کا کالم پورے امریکہ میں شائع ہوا اور ہم گھر بیٹھے ہر کسی کے گھر جا بیٹھے۔ پورے امریکہ میں ہماری مشہوری ہو گئی۔ اس دن کے بعد ہمارے فون

کی گھنٹی نے مسلسل بجنا شروع کیا۔ بے شمار لوگ اپنا آرڈر بک کرانا چاہتے تھے۔

چند دن بعد ڈاکئے نے ایک بڑا بیگ میرے سامنے لا کے رکھا اور کہنے لگا!

”مسٹر اسلم! اتنی ڈاک تو پورے پلازا کی نہیں آتی جتنی آپ اکیلے کی آتی ہے۔“

گولڈن نیڈل کا عروج

جب لاس اینجلس ٹائمز میں ہمارا فیچر چھپا تو ہماری شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ دوسری ریاستوں سے لوگوں نے ہمیں بذریعہ ڈاک آرڈر بھیج کر ہماری خدمات لینا شروع کر دیں۔ یہ ایک ناقابل یقین اور حیرت انگیز تجربہ تھا۔

ہم صبح سے شام تک مصروف رہتے۔ اتنے آرڈر آتے کہ ہم بمشکل پورا کر پاتے۔ ہر وقت خریداروں کا ہجوم رہتا۔ شام کو اپنے خریداروں سے معذرت کر کے ہم انھیں باہر نکالتے اور اپنا سٹور بند کرتے۔ جیسے جیسے ہمارا کام بڑھتا گیا ہم نے کیلیفورنیا کے دیگر شہروں میں بھی اپنے سٹور کی شاخیں قائم کرنا شروع کر دیں یہاں تک کہ ان کی تعداد سات تک جا پہنچی۔ ہمارا کاروبار اس حد تک وسعت اختیار کر گیا کہ ہماری ایک دن کی ڈاک بوری میں بھر کے لائی جانے لگی۔

ہماری اپنے گاہکوں کو ترجیحی بنیاد پر خدمات دینے کی پالیسی انتہائی کامیاب رہی۔ ہماری مصنوعات کے معیار نے بھی لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔

ہالی ووڈ سٹارز کا پسندیدہ سٹور

ہم نے یہ سٹور ایک یہودی خاندان سے خریدا تھا جو پچھلے چالیس سال سے اسے چلا رہے تھے۔ انھوں نے اس سٹور کی ساکھ بنانے کے لئے بہت محنت کی تھی۔ فلمی دنیا اور شوبز سے وابستہ کئی نامور شخصیات مثلاً لو گوزہٹ (Lou Gossett)، شیر (Sher)، لینن سسٹرز (Lenin Sisters)، باب ہوپ (Bob Hope) وغیرہ پہلے ہی اس سٹور کے

خریداروں میں شامل تھے۔ جلد مختلف ریاستوں کے گورنرز اور کانگریس کے ممبران بھی ہمارے خریداروں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ نیشنل بنک آف کیلیفورنیا اور بنک آف امریکہ کی تزئین و آرائش بھی ہم نے کی۔ اس کے علاوہ سئیرز (Sears)، میسی (Macy's)، بلاکس (Bullocks)، رابنسن (Robinson)، نارڈسٹرام (Nord Strom) اور میرا پرانا سٹور براڈوے بھی ہمارے خریداروں میں شامل ہو گئے۔ اتنے دیو ہیکل سٹوروں کا آرڈر بھی ہزاروں گز کپڑے کا ہوتا تھا۔

رجوع

ہمارا گولڈن نیڈل سٹور کے مالک (land lord) سے معاہدہ تھا کہ ہم ہر ماہ اُسے کرائے کی مد میں ($3000) تین ہزار ڈالر ادا کریں گے۔ اس کے علاوہ سیل کی بنیاد پر انھیں کمیشن بھی دینا تھا۔ جب ہماری سیل بہت زیادہ ہوئی تو میرے اکاؤنٹنٹ نے میرے سامنے ایک بل رکھا جس میں گولڈن نیڈل کے مالک کا کمیشن بیس ہزار ڈالر بن رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا وہ کون ہوتا ہے اتنے زیادہ پیسوں کا حقدار۔ محنت ہم کریں۔ پیسے ہم لگائیں اور ہر ماہ اسے اتنی بڑی رقم گھر بیٹھے ملتی رہے۔ میں نے اکاؤنٹنٹ کو غصے میں کہا کہ اسے اتنی بڑی رقم بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر میں گھر چلا گیا۔

گھر جا کر میں نے نماز پڑھی دعا کی اور پھر سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ میری عادت ہے کہ میں رات کو اپنے پورے دن کے اعمال پہ غور کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ صبح سٹور پر جاتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ میں نے اپنے اکاؤنٹنٹ کو کہا کہ وہ دکان کے مالک کو اس کی واجب الادا رقم جو بیس ہزار ڈالر سے زائد بنتی تھی، فوراً ادا کرے۔

خدمت خلق

میں نے والدین سے کیا گیا وعدہ پوری طرح نبھایا اور باقاعدگی سے پاکستان آتا جاتا رہا۔ پاکستان آنے کی ضرورت یوں بھی پیش آتی کہ میں نے پاکستان میں 1965ء سے ایک رفاہی میڈیکل کلینک کھول رکھا تھا جہاں غریب اور ضرورت مند لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے پاکستان آنا ضروری تھا۔ میں نے عملے کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ غریب سے غریب مریض کو بھی وی۔ آئی۔ پی کے طور پہ لیں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔ میں کلینک پر مریضوں کے روپ میں اپنے لوگ بھیجتا جو واپسی پر مجھے رپورٹ دیتے کہ غریب مریضوں سے کیسا سلوک ہوتا ہے۔ اتنی سخت تاکید کی وجہ کے پیچھے ایک پوری کہانی ہے جو آگے چل کے آپ کو سناتا ہوں۔

یہ کلینک ”صباٹرسٹ“ کا آغاز تھا۔

میری کامیابی کے زرّیں عوامل

1۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رحمت۔

2۔ اسلامی اصول اپنانے سے ہر مشکل کام میں کامیابی۔

3۔ باقاعدہ نماز اور تلاوت قرآن پاک۔

4۔ ایمانداری۔

5۔ وعدہ پورا کرنا۔

6۔ والدین اور بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل۔

7۔ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا۔

8۔ غریبوں کے ساتھ محبّت، شفقت اور ہمدردی کا سلوک اور ان کی مدد۔

9۔ مشکل فیصلے عقلمندی سے کرنا۔ ایسا کرنے سے کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

10۔ تعلیمی سیمینار۔

11۔ گاہک کو اپنی چیز کے بارے اچھائیاں اور برائیاں دونوں بتانا۔

12۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اپنا ہوم ورک مکمّل کریں۔ تفصیلی تحقیق ضروری ہے۔

13۔ کام کے پیچھے پڑے رہیں۔ جب تک مکمّل نہ ہو جائے۔

14۔ تحمّل اور مستقل مزاجی سے کام لیں۔

15۔ جدوجہد اور کوشش ترک نہ کریں۔

16۔ وقت بے حد قیمتی متاع ہے۔ اس کی قدر کریں۔ ہر منٹ کا استعمال عقل مندی سے کریں۔

17۔ منصوبہ بندی انتہائی ضروری ہے۔ میں پھر دہراتا ہوں منصوبہ بندی بہت

ضروری ہے۔ اس کے لئے جتنا وقت چاہیے لگائیں اور جامع منصوبہ بندی کریں۔ پوری طرح جانچ کریں کہ اس کام میں فائدے کیا اور نقصانات کیا ہیں؟

18۔ اپنے ملازمین کے ساتھ مہربانی کا سلوک اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا (ایسے لوگوں کی دعائیں بھی کامیاب کرتی ہیں) ۔

ایک مرتبہ بدھا کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں ایک شخص ملا۔ اس نے بدھا پہ بلا سوچے سمجھے چڑھائی کر دی۔ ”میرے خیال میں تمہیں دوسروں کو سبق پڑھانے کا کوئی حق نہیں“۔ وہ شخص چلایا۔ ”تم باقی لوگوں جیسے ہی احمق ہو۔ تم لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہو۔“

بدھا اس کی باتیں سن کر بالکل پر سکون رہے۔ بلکہ اس سے سوال پوچھا

”مجھے آپ یہ بتاؤ کہ آپ نے کسی کے لئے کوئی تحفہ لیا۔ مگر وہ شخص آگے سے وہ تحفہ لینے سے انکاری ہے تو وہ تحفہ کس کے پاس رہے گا۔“

وہ شخص ایسا عجیب سوال سن کے حیران ہوا اور بولا

”تب تو ظاہر ہے میرے پاس ہی رہے گا کیوں کہ میں نے ہی خریدا تھا۔“

بدھا مسکرائے اور کہا

”بالکل ٹھیک، یہی حال تمہارے اس غصے کا ہے“۔

کایاپلٹ

وقت لمبے سفر پہ نکلتے پرندوں کی مانند آہستگی سے محوِ پرواز رہا۔ اس کی خوبی ہے کہ یہ ساکت نہیں رہتا، گزر جاتا ہے۔ چاہے اچھا ہو یا برا۔ بہت سا وقت گزر گیا حتیٰ کہ 1995 کا سال آپہنچا۔ میرے اندر بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ میرا دل پیسہ کمانے سے اچاٹ ہو گیا۔

میں نے سوچا اتنا زیادہ پیسہ کما لیا اس کے باوجود میں ایک پلیٹ سے زیادہ نہیں کھا سکتا۔ ایک وقت میں ایک ہی گاڑی میں سوار ہو سکتا ہوں اور سوتے وقت چند فٹ سے زیادہ جگہ نہیں گھیر سکتا۔ اتنی زیادہ دولت کس کام کی..... میرے آس پاس کے بہت سے لوگ خاک سے اٹھے اور خاک سے جا ملے۔ وہ اپنی دولت دنیا میں ہی چھوڑ گئے جس پر ان کے بیٹے، بیٹیاں اب عیّاشی کرتے اور ماں باپ کا نام روشن کرتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ملنے والی دولت ایسا ہی کمال دکھاتی ہے۔

ڈاکٹر مزّمل صدیقی اور زبیر زاہد سے میرا پرانا یارانہ ہے۔ دونوں سچّے مومن ہیں۔ میری ذہنی و فکری تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے گولڈن نیڈل کاروبار ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب میں خدا کے ساتھ کاروبار کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ جس کا منافع لاجواب اور بے مثال ہے۔ جناب حضرت عثمانؓ یاد آتے ہیں۔ جب شہر میں غلّے کی قلّت تھی۔ تاجروں نے جناب حضرت عثمانؓ کو کئی گنا زیادہ منافع پر غلّہ خریدنے کی پیشکش کی مگر انھوں نے فرمایا میں کسی کو اس سے زیادہ منافع پر غلّہ بیچتا ہوں۔ تاجر حیران تھے کہ کون اتنے زیادہ منافع پر غلّہ خریدے گا۔ جناب حضرت عثمانؓ نے وہ تمام غلّہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

میں جو کچھ بھی ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بعد میری بیگم بشریٰ کے

مرہونِ منّت ہے۔ میں نے اپنی بیگم اور دونوں بیٹیوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ میری بیٹیوں اور بیگم نے حسب روایت میری حمایت کی اور کہا کہ وہ میری ہر ممکن مدد کریں گی۔

میں اس وقت تک زیادہ تر وقت کاروبار کو دے رہا تھا اگرچہ فلاحی کام میں 1965 سے کر رہا تھا اور بے حد جوش و جذبے سے کر رہا تھا تاہم میرے وقت کا زیادہ حصّہ کاروبار لے جاتا تھا۔ فلاح عامہ کے کاموں پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے میں نے اپنا کاروبار بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک ایک کر کے اپنے گولڈن نیڈل سٹور بند کرنا شروع کر دیئے کیونکہ یہ کاروبار کل وقتی توجّہ مانگتا تھا۔ ان میں سے ایک سٹور ہم نے علم فاؤنڈیشن کو عطیّہ کر دیا۔ تین ہزار مربع فٹ پہ پھیلے اس سٹور میں تمام سامان بھی موجود تھا۔ علم فاؤنڈیشن ایفروامریکن (حبشی) لوگوں کی تنظیم ہے۔ میں جب امام صادق سفر، بانی علم فاؤنڈیشن اور ان کے نائب نعیم شاہ سے ملا اور ان سے سوال و جواب کئے تو محسوس ہوا کہ وہ لوگ واقعی دوسروں کیلیئے کچھ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے ان کے مشن میں اپنا تھوڑا سا حصہ ڈالنے کیلیئے وہ سٹور ان کے حوالے کر دیا۔

گولڈن نیڈل کی فروخت سے حاصل شدہ سرمائے کو میں نے سٹاک مارکیٹ اور جائیداد کی خرید و فروخت کے شعبے میں لگا دیا تاکہ مجھے اپنے رفاہی کاموں پہ توجہ دینے کا موقع مل سکے۔ یہ دونوں کاروبار نسبتاً کم توجہ مانگتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اپنا زیادہ تر وقت پاکستان میں گزارا۔ پاکستان میں، تعلیم، صحت، مذہبی ہم آہنگی، یتیموں اور بیواؤں کی فلاح و بہبود جیسے شعبوں میں کام کرتا رہا (ان کی تفصیل آگے آئے گی) ۔ امریکہ میں رہ کر میں اتنی تندہی سے کام نہیں کر سکتا تھا۔

اکتوبر 2005ء میں، میں اپنے دوست اکرم چوہدری کے ساتھ نیو جرسی (New Jersy) میں تھا۔ میں نے ایک منصوبہ اکرم چوہدری کے سامنے پیش کیا۔ میں نے انھیں

بتایا کہ میں ایک ایسا سٹیٹ آف دی آرٹ(State of the Art) گھر بنانا چاہتا ہوں۔ جہاں یتیم و بے سہارا بچیوں کو اعلیٰ رہائش اور جدید تعلیم کے ساتھ بہترین کردار کا مالک بنایا جائے تا کہ پاکستان کو ایماندار اور محب وطن نسل مہیا ہو۔ اس خیال کو اکرم چوہدری نے بہت سراہا اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

جب میں کیلی فورنیا واپسی کیلئے ائیر پورٹ پہنچا تو امریکی نیوز چینل سی این این (CNN) پہ پاکستان میں آنے والے تباہ کن زلزلے کی خبر چل رہی تھی۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پاکستان واپس آگیا اور زلزلے سے تباہ شدہ علاقوں میں امدادی کاروائیوں کا حصہ بنا۔ میں تقریباً تین ماہ تک پاکستان کے زلزلے سے متاثرہ علاقوں میں رہا۔ وہاں ہم نے خوراک، ادویات، خیمے، کمبل، کپڑے اور جوتے تقسیم کئے۔ کئی ایسے علاقے تھے جہاں گاڑی تو کجا پیدل پہنچنا بھی محال تھا۔ لہٰذا ہم خچروں کے ذریعے سامان پہنچاتے۔ اس زلزلے کے دوران بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ سینکڑوں بچے ایسے ہیں جن کے والدین اس زلزلے کے دوران جاں بحق ہو چکے تھے۔ میں نے یتیم ہو جانے والی بچیوں کے لئے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا.....

"یہی صباہومز کا آغاز تھا۔"

باب چہارم

خاندان اور دوست

بیگم بشریٰ سلطانہ اسلم

کہتے ہیں ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کئی مشہور ہستیاں گزری ہیں، جن کی کامیابی ان کی رفیقۂ حیات کی مرہون منّت ہے۔ میرے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

بشریٰ سلطانہ کمالیہ کے ایک نیک اور متموّل خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی۔ والدہ محترمہ زبیدہ خاتون نہایت پرہیز گار اور سادہ مزاج خاتون تھیں۔ بشریٰ سلطانہ نے اپنی والدہ کی آغوش میں پرورش پائی اور ان کی تمام اچھی عادات کو اپنایا۔ سادگی انھیں اپنی والدہ کی طرف سے ورثے میں ملی۔ خدا نے انہیں نرم دلی کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔

شادی کے بعد میں بیگم کو لیکر امریکہ آگیا۔ شروع کے چند ماہ تو بشریٰ سلطانہ اپنے امور خانہ داری میں مصروف رہیں۔ اس کے بعد میں نے انھیں اپنے ساتھ لے جانا شروع کیا۔ میں اس وقت براڈوے کے لئے کام کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں انھیں نیو یارک بھی لے گیا تاہم وہ گھر رہنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ حالانکہ پڑوسی خواتین انھیں کہتیں کہ میاں کو اکیلا مت چھوڑو کہیں خراب نہ ہو جائے مگر بیگم کا میاں پہ اعتماد لازوال تھا۔ براڈوے کے سٹاف کے ساتھ انھوں نے اپنی خوش اخلاقی کی بدولت خوشگوار تعلقات قائم کئے اور ہر سٹاف ممبر انھیں ماں، بہن اور ہمدرد کا درجہ دینے لگا۔

در حقیقت میری کامیابی کا ایک بڑا راز بشریٰ کے صبر اور قناعت میں پوشیدہ

ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کیلئے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ کاروبار میں بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے میں ان کو پورا وقت نہ دے پاتا۔ دور دراز کے ممالک کے سفر کے دوران وہ گھر پر اکیلی ہوتیں۔ اجنبی معاشرے اور زبان پہ عبور نہ ہونے کے باوجود بڑی ہمت سے مشکلات کا سامنا کیا کرتیں۔ تاہم مجھ سے کبھی شکایت نہ کی۔ میں جب فلاحی و سماجی خدمات میں مصروف ہوتا اور ایک وقت میں متعدد لوگ مدعو کئے جاتے تو ان کے کھانے کا انتظام بشریٰ کو ہی کرنا پڑتا۔ چاہے عید ملن پارٹی ہو، غیر مسلم مستحق افراد کو کھانا کھلانے کا موقع ہو یا پاکستانی ثقافت متعارف کرانے کی نمائش، ہر موقع پر انھوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔

1995 میں ہم دونوں نے کاروبار پہ توجّہ کم کرنے کا سوچا اور خود کو فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بخوشی اس فیصلے میں میرا ساتھ دیا۔ چند سال پہلے ہم نے جب اپنا وسیع و عریض مکان چھوڑا اور اورنج کاؤنٹی مسجد سے ملحقہ نسبتاً چھوٹے مکان میں منتقل ہوئے تو بھی مجھے ان کی مکمّل تائید حاصل تھی۔ وہ بذات خود نمود و نمائش سے پرہیز کرتی ہیں اس لئے انھوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ میں ہر کام ان کے مشورے سے کروں۔

میں نے جتنی بھی فلاحی سرگرمیاں سرانجام دیں ان تمام منصوبوں کی تشکیل و تعمیل میں ان کا گرم جوش تعاون کار فرما رہا۔ مختلف فلاحی اداروں اور تنظیموں کیلئے عطیّات اکٹھا کرنے میں ان کا کردار کلیدی حیثیت کا حامل رہا۔

انھوں نے مختلف اداروں اور تنظیموں کے علاوہ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی تعلیمی، فلاحی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اب بھی ایسے فلاحی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔

وہ چاہے پاکستان میں ہوں یا امریکہ میں، ان کی سوچ، نظریات اور معمولات

میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اب بھی ان کی تمام تر توانائی عام لوگوں کی فلاح و بہبود پہ خرچ ہوتی ہے۔ وہ خدمت خلق کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ صبا ہومز کا شاندار منصوبہ اب ان کی توجّہ کا محور بن چکا ہے۔ وہ تمام صبا گرلز کی "ماما" ہیں۔ ان کی ایسی خدمت کرتی ہیں کہ ان کی حقیقی والدہ بھی کیا کرتی ہوں گی۔

اگرچہ امریکہ میں رہتے ہوئے انھوں نے خدمت خلق کیلئے جو کوششیں کی ہیں، ان کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے تاہم دوسرے لوگوں کی معلومات میں اضافے اور ترغیب کیلئے ان کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

☆ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی مجلس شوریٰ کی رکن کی حیثیت سے بچیوں کیلئے مختلف تربیتی اور اصلاحی پروگراموں کا آغاز۔
☆ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کی سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات کی انجام دہی۔
☆ سکول میں بچیوں کیلئے ماں کا کردار ادا کرنا۔
☆ بچیوں کے مختلف آؤٹ ڈور پروگرامز ترتیب دینا اور ان میں شرکت کرنا۔
☆ بچیوں کیلئے ایک ہمدرد دوست اور ناصح کا کردار ادا کرنا۔
☆ بچیوں کو منشّیات، اخلاقی اور جنسی برائیوں سے بچانے میں کردار ادا کرنا۔
☆ بچیوں کے گھر سے بھاگنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرنا۔

اس کے علاوہ انھوں نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام بھی متعارف کروائے۔

☆ ہفتہ وار فہم القرآن (تفسیر پروگرام)
☆ کمیونٹی تک رسائی کیلئے رابطے کا پروگرام
☆ ہفتہ وار فہم حدیث پروگرام

☆ ماہانہ بازار
☆ لوکل پولیس کے ساتھ رابطے مؤثّر بنانا
☆ فائرڈیپارٹمنٹ کے ساتھ کمیونٹی کے روابط مستحکم کرنا
☆ بورڈ آف ایجوکیشن کا قیام
☆ غیر مسلم پڑوسیوں کے بارے میں حقوق آگاہی پروگرام
☆ اسلامی علماء کے لیکچرز کا انعقاد
☆ فیملی میلہ (جس میں خاندان کے مسائل پہ ورکشاپ کا اہتمام شامل ہے)۔
☆ انٹر نیشنل ویمن کانفرنس
☆ روزگار میلہ (کمیونٹی کے بے روزگار افراد کی معلومات اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے)
☆ خاندان کی بنیاد مضبوط بنانے کیلئے مختلف سطح پر مشاورت کے پروگرام
☆ بیواؤں اور یتیموں کی دیکھ بھال اور فلاح کے منصوبے تیّار کرنا
☆ ذرائع ابلاغ سے مضبوط روابط استوار کرنا
☆ اپنی مصالحانہ شخصیت کی بدولت خاندانوں کو تقسیم ہونے سے بچانا
☆ ہم خیال خاندانوں میں رشتے طے کرانے میں اپنا کردار ادا کرنا

رشتے طے کرانے کے کام میں ان کو اپنی دوست رخسانہ فاروقی کا گرم جوش تعاون بھی حاصل رہا۔ یہ کام اتنا مشہور ہوا کہ دور دراز شہروں سے بھی اس کیلئے درخواستیں موصول ہونا شروع ہو گئیں۔ اب تک بے شمار خاندان اس سہولت سے استفادہ کرچکے ہیں اور یہ کام اب تک جاری ہے۔

انھوں نے خدمت خلق کے دوسرے شعبوں مثلاً صحت عامہ، بچیوں کی تعلیم و تربیت اور بے آسرا لوگوں کی مدد جیسے کام پوری تندہی اور نہایت خوش اسلوبی سے کئے۔

اس دوران انھوں نے جو روّیہ اور سوچ اپنی بچیوں کیلئے اپنائی، جس خلوص نیت سے اپنی بچیوں کی پرورش کی، وہی انداز دوسری بچیوں کے لئے بھی اختیار کیا۔

کتاب لکھنے کے دوران جب ان سے میرے بارے پوچھا گیا تو انھوں نے مندرجہ ذیل جواب دیا:

"میرے میاں صرف صحیح راستے (صراطِ مستقیم) پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا، سخت محنت اور وقت سے پہلے مکمل تیاری ان کی خاص عادات ہیں۔ ہر کام میں اللہ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ آخرت میں جواب دہی کا شدید خوف رکھتے ہیں۔ نہایت رحمدل ہیں۔ مجھے ان سے مل کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ آ گیا۔ انھوں نے زندگی کے ہر مرحلے پر میری راہنمائی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" (آمین)

صائمہ اور عائشہ

اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پہ رحمتوں اور نعمتوں کا شمار نہیں۔ وہ بلا تخصیص اپنی عنایات اپنے بندوں پہ کرتا رہتا ہے۔ مجھ پر اس کی رحمت کی ایک صورت میری بیٹیاں عائشہ اور صائمہ ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ اتنی نیک سعادت مند اور خوف خدا رکھنے والی بچیوں کی پیدائش اور پرورش امریکہ جیسے مادر پدر آزاد ملک میں ہوئی ہے۔

صائمہ اور عائشہ کی تربیت میں زیادہ کردار ان کی والدہ نے ادا کیا ہے۔ میں نے تو ہمیشہ اپنی بچیوں پر محبّتوں کے پھول ہی نچھاور کئے۔ انھوں نے اگر کوئی غلطی کی تو جواباً میں نے انھیں گلے سے لگایا اور پیار کیا جبکہ میری بیگم کا رویہّ اس سے قدرے مختلف رہا۔ انھوں نے نظریۂ ضرورت کے تحت انھیں ڈانٹنے اور بسا اوقات دو چار تھپّڑ لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

دونوں کی پیدائش چونکہ امریکہ میں ہوئی اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا گیا تاکہ وہ خالص اسلامی اور مشرقی تہذیب و تمدن اپنائیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہ تھا مگر بشریٰ بیگم نے بچیوں کی تربیت ایسے انداز میں کی کہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

شروع میں ہم نے امریکی رواج کے مطابق صائمہ کو آیا(Baby Sitter) کے حوالے کیا۔ اس کا نام کرس(Chris) تھا۔ میری بیگم اگرچہ اس کی حامی نہ تھی مگر میرے کہنے پہ وہ نیم دلی سے راضی ہوئیں۔ ہم صائمہ کو کرس کے حوالے کر کے سٹور پہ چلے جاتے، جہاں سے شام کو واپسی ہوتی۔ کرس کو ہم نے اپنے گھر میں رہائش دے رکھی تھی۔ اپنے گھر کے پچھواڑے ہم نے کچھ کمرے تعمیر کئے تھے۔ کرس وہیں رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں آفس سے تھوڑا جلدی آ گیا تو میں نے دیکھا کہ کرس صوفے پر مزے سے بیٹھی چائے پی رہی ہے۔ صائمہ اس کے پاس نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ صائمہ کہاں ہے؟ اس نے بے پروائی سے جواب دیا کہ ادھر کمرے میں ہے۔ وہ مجھے تنگ کر رہی تھی اس لئے میں نے اسے سزا کے طور پر ایک کمرے میں بٹھا رکھا ہے۔ میں اس کی بات سن کر کانپ گیا۔ ایک چھوٹی سی بچّی کے ساتھ یہ سلوک بہیمانہ تھا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جا کر صائمہ کو اٹھایا اور اسے پیار کیا۔

میں نے کرس سے کہا ”میں آپ سے بالکل ناراض نہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لئے میں آپ کو قصوروار نہیں ٹھہراتا بلکہ اپنے آپ کو اس کا ذمہّ دار سمجھتا ہوں۔ آپ کو رہائش کے لئے ہم نے جو علیحدہ اپارٹمنٹ فراہم کر رکھا ہے اس میں آپ چھ ماہ تک قیام کر سکتی ہو لیکن آپ کا صائمہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس دوران آپ دوسری نوکری کا بندوبست کر لو۔“

جب بشریٰ بیگم سٹور سے گھر واپس آئیں تو میں نے انھیں ساری بات بتائی۔

بچیوں کی اس انداز میں تربیت ہم دونوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ کام کرنے کے بجائے گھر پر صائمہ کی دیکھ بھال کیا کریں۔ وہ تو پہلے سے یہی چاہتی تھیں۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یوں دونوں بچیوں کی تربیت والدین نے کی۔

دونوں بچیوں نے قرآن پاک ناظرہ اور پھر اس کا ترجمہ و تفسیر پڑھی۔ انھوں نے سات سال کی عمر سے پہلے ہی قرآن پاک ناظرہ ختم کر لیا تھا۔ صائمہ نے اورنج کریسنٹ سکول میں پہلی طالبہ کی حیثیت سے سکول کا افتتاح کیا۔ اورنج کریسنٹ سکول کے قیام کا مقصد مسلمان امریکیوں کو اسلامی تہذیب و تمدّن کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ اس ادارے نے ان مقاصد کو بڑی خوبی سے حاصل کیا۔

دونوں اپنی اساتذہ کی نہایت پسندیدہ طالبات رہیں۔ سسٹر رابعہ، جو ان کی عربی کی ٹیچر ہیں، کا کہنا ہے کہ صائمہ، عائشہ میری سب سے پسندیدہ طالبات ہیں۔ سسٹر خالدہ صدیقی، جنھوں نے انھیں قرآن مجید پڑھایا، وہ دونوں کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ کہتی تھیں "صائمہ اور عائشہ انتہائی ذہین سٹوڈنٹ ہیں بہت جلد سیکھ جاتی ہیں۔ صائمہ کا مزاج درویشانہ ہے اور وہ انتہائی صابر اور اللہ لوک لڑکی ہے۔" سسٹر خالدہ کے منہ سے اپنی بیٹیوں کی تعریف سن کر میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ جاتے تھے۔ سسٹر خالدہ ان کی سکول کی استاد بھی رہیں، اس لئے ان کی رائے کی خاص اہمیت ہے۔

ان کی ایک اور ٹیچر سسٹر راشدہ بھی صائمہ، عائشہ کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ بقول ان کے صائمہ اور عائشہ ان کی فیورٹ سٹوڈنٹ ہیں۔ وہ مجھے کہتی تھیں کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کو اتنی اچھی تربیت دی ہے کہ انھیں پڑھانا یا سکھانا چنداں مشکل نہیں بلکہ بڑا پر لطف کام ہے۔

صائمہ اور عائشہ نے تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان

کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ وہ دوسروں کی مدد کرنا سیکھیں۔ دونوں بہنوں کو جو گھر سے جیب خرچ ملتا، اسے وہ فضول کاموں پہ خرچ کرنے کے بجائے مسجد میں دے دیتیں، کبھی فلسطین اور کبھی کشمیر کے لئے بھجوا دیتیں۔ اگر ان سے سوال کیا جاتا کہ پیسے کہاں خرچ کئے تو جواب سننے کو ملتا کہ انھوں نے خود پہ خرچ نہیں کئے بلکہ مستحق افراد کو دے دیئے۔

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے لئے عطیّات اکٹھّے کرنے میں دونوں پیش پیش رہی ہیں۔ خاص تقریبات میں کیک گھر سے بنا کر ساتھ لے جاتیں اور اس کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی اسلامک سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کرا دیتیں۔ اورنج کریسنٹ سکول کے لئے دونوں نے اتنے فنڈز اکٹھے کئے جو سکول کے تمام بچوں سے زیادہ تھے۔ اس کارکردگی پر ان دونوں کو انعام دیا گیا۔ اس سے اگلے سال بھی دونوں بہنوں نے ریکارڈ عطیّات اکٹھے کئے اور انعام کی حقدار ٹھہریں۔ ایک مرتبہ ان دونوں بچیوں نے اپنی دیگر سہیلیوں کے ساتھ مل کر ممبران سے اپیل کی کہ وہ اپنی گاڑیاں ان سے صاف کروائیں۔ انھوں نے وہ سب گاڑیاں دھوئیں اور ان سے حاصل شدہ آمدنی اسلامک سوسائٹی کو عطیّہ کر دی۔

صائمہ اور عائشہ کو اورنج کریسنٹ سکول اور دیگر تنظیموں کی جانب سے اتنی تعریفی اسناد دی گئیں کہ ان کے کمروں کی دیواروں پر جگہ نہ رہی۔ یہ اسناد انھیں مختلف اوقات میں ان کی نصابی و غیر نصابی اعلیٰ کارکردگی نیز فلاحی خدمات کے اعتراف میں دی گئیں۔

بے شمار میڈل، ٹرافیاں اور انعامات بھی کمرے میں ترتیب سے سجے دکھائی دیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ثقافتی و سماجی پروگرام منعقد کروانا دونوں بیٹیوں کو ورثے میں ملا۔ بڑی محنت

اور لگن سے نہ صرف ہمارا ہاتھ بٹاتی رہیں بلکہ طریقہ کار میں بھی جدّت پیدا کی۔ صائمہ اور عائشہ گھر کے کام کاج میں نہ صرف اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی رہیں بلکہ کاروباری معاملات کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی ہیں اور دفتری و کاروباری امور کے بارے میں مفید تجاویز اور مشورے دیتی ہیں۔

عائشہ کو بچپن سے لکھنے کا شوق تھا۔ جب اورنج کریسنٹ سکول نے اپنا میگزین شائع کرنا شروع کیاتو اسے گویا سنہری موقع مل گیا۔ عائشہ نے میگزین کے لئے اشعاراور نظموں کے علاوہ مختلف مضامین تحریر کیے۔ رفتہ رفتہ اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اسے مختلف اداروں سے ملازمت اور آرٹیکل لکھنے کی پیشکش کی گئی۔

عائشہ کو خدمت خلق کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ وہ سدرن کیلی فورنیا(Southern California) میں علاقائی اور قومی سطح کی متعدد تنظیموں کے ساتھ وابستہ رہی۔ اسلامک ریلیف(Islamic Relief) کی جانب سے عطیات اکٹھے کرنے کی مہم میں عائشہ بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی رہی۔ شاید ہی کوئی ایسی تقریب ہو جس کا وہ حصہ نہ رہی ہو۔ وہ کم سنی میں اسلامک سنٹر آف اروائن(Islamic Centre of Irvine) کے بورڈ ممبر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیتی رہی ہے۔

اورنج کریسنٹ سکول کی پچیسویں سالگرہ(25th Anniversary Reunion) کے موقع پر صائمہ کو اس تقریب کا منتظم مقرّر کیا گیا۔ اسے مذکورہ سکول کی پہلی طالبہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ میں اس تقریب میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر پاکستان سے گیا۔ جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے امریکہ میں بھی طالب علم اپنے ادارے سے فارغ التّحصیل ہونے کے بعد بکھر جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں لوگ اپنے سکول یا کالج کے پرانے ساتھیوں سے ملنے اور پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جسے ری یونین(Reunion) کا نام دیا جاتا ہے۔ صائمہ کی انتظامی

صلاحیتیں اس تقریب کے دوران ابھر کر سامنے آئیں۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی جب اس تقریب کے بعد سب نے مجھے مبارک باد دی انھوں نے کہا کہ آپ کی بیٹی نے اتنا اچھا کام کیا ہے۔ میں جہاں بھی گیا لوگوں نے اس تقریب کے حوالے سے صائمہ کی تعریف کی۔

صائمہ کی شادی بہت چھوٹی عمر میں اپنے چچازاد سے پاکستان میں کر دی گئی۔ یوں اسے چند سال پاکستان میں گزارنا پڑے۔ اس دوران اسے فلاحی کاموں کا اتنا موقع نہ ملا جتنا عائشہ کو ملا ورنہ صائمہ کسی لحاظ سے فلاحی کاموں میں کم نہیں۔ شادی ہو جانے کے بعد اس نے میٹرک پاس کیا۔ میں کئی مرتبہ صائمہ کو ملنے اس کے گھر کمالیہ گیا۔ میں یہ بات فخر اور خوشی سے کہتا ہوں کہ صائمہ جیسی عقلمند اور صابر بچّیاں کم ہی ہوتی ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں باپ ہونے کے ناطے سے اس کی تعریف کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے۔ مجھے اس کے صابر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

خدا نے صائمہ کو تین خوبصورت بچوں سے نوازا ہے۔ بیٹی کا نام زینب اور بیٹوں کے نام جہاد اور آدم (ایڈم) ہیں۔ اب اس کی زندگی اپنے بچّوں کے لئے ہے۔ ہر ماں کی طرح اس کے پاس اب اپنے لئے وقت نہیں، ہر وقت بچوں کی فکر ہوتی ہے۔

نائن الیون (9/11) کے بعد تمام مسلمان امریکہ میں عدم تحفّظ کا شکار ہو گئے۔ ان کو دھمکیاں دی گئی، مارا پیٹا گیا حتیٰ کہ بعض کو جان سے مار دیا گیا۔ صائمہ کی ایک دوست کو جس نے سکارف پہن رکھا تھا، قتل کر دیا گیا۔

صائمہ ایک دن کالج گئی تو ایک امریکی خاتون نے اسے روک لیا کہنے لگی ”میں بوڑھی ہوں اور میرے اندر برداشت کا مادّہ ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہیں قتل کر دیتا۔ اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو یہ اسکارف اتار دو۔“

صائمہ نے کہا ”کوئی قتل کرتا ہے تو کر دے۔ میں اپنے خدا کے حکم سے منہ

نہیں موڑ سکتی۔"

جب صائمہ نے واپس آکر یہ واقعہ مجھے سنایا تو میں نے شکرانے کے نفل ادا کیئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری بچیوں کو مضبوط ایمان کا مالک بنایا اور اتنی سمجھداری عطا فرمائی۔

میرے مسلم و غیر مسلم دوستوں نے مجھے بارہا کہا کہ میں اپنی بیٹیوں کو حجاب پہننے سے منع کروں۔ میں ان کو جواباً کہتا "میں نے آج تک اپنی بیٹیوں کو حجاب کا پابند نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی مرضی سے اوڑھنا شروع کیا۔ وہ بچپن ہی سے اسلامی ذہن رکھتی ہیں۔ امریکہ جیسے ملک میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کو نہ چھوڑا۔ اس لئے میرے دوستو! مجھے علم ہے کہ آپ لوگ نیک نیتی سے میرے مفاد میں یہ بات کر رہے ہیں مگر چوں کہ میں نے انھیں نہیں کہا وہ حجاب پہنیں، اس لئے اتارنے کا بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اپنی بیٹیوں پر فخر ہے۔"

میں اپنی دونوں بیٹیوں کو ٹونی رابنسن (Tony Robinson) اور زگ زیگلر (Zig Zeagler) کے سیمیناروں میں لے کر جاتا جہاں پیسے بنانے اور ان کو اچھے طریقے سے استعمال کرنے کے بارے میں بتایا جاتا تھا۔

عائشہ کی شادی کویت کے مشہور خاندان "المطوع"(Almutwa) میں ہوئی۔ ان کے میاں کا نام احمد المطوع ہے۔ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ احمد نے چند مرتبہ عائشہ کو شادی کی پیشکش کی۔ عائشہ نے ہر مرتبہ جواب دیا "خاموش رہو اور یہاں سے چلتے بنو۔"

عائشہ سے مایوس ہو کر احمد نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ اس نے مجھے خط لکھا اور براہ راست مجھے دینے کے بجائے اسلامک سنٹر آف اروائن کے امام مسجد کے ذریعے وہ خط مجھ تک بھجوایا۔ امام مسجد شیخ سعد اللہ نے حیران ہوتے ہوئے احمد سے کہا

"یار احمد! تم کویتی لوگ تو بڑے متّعصب اور اپنے حسب نسب پہ فخر کرنے والے لوگ ہو۔ حتّیٰ کہ تم باقی عربوں کو بھی خود سے کمتر جانتے ہو اور ان سے شادی بیاہ نہیں کرتے تو کیا وجہ ہے کہ تم ایک پاکستانی نژاد امریکی، جو عجمی ہے، سے شادی کرنا چاہ رہے ہو۔"

احمد نے جواب میں کہا کہ براہ مہربانی آپ یہ خط صغیر اسلم صاحب تک پہنچا دیں اس بات کا جواب خط میں موجود ہے۔

بہر حال شیخ سعد اللہ نے وہ خط مجھ تک پہنچا دیا۔ یہ طویل خط جب میں نے پڑھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ احمد نے ساری بات اس خط میں لکھ دی تھی۔ عائشہ کا اس کو دیا گیا جواب بھی لکھا تھا۔ احمد نے عائشہ سے شادی کرنے کی بڑی وجہ یہ بیان کی تھی کہ عائشہ ایک عملی مسلمان لڑکی ہے اور احمد ایک اسلامی لڑکی اور ایک اسلامی خاندان میں شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ عائشہ کی فلاحی خدمات کا معترف ہے اور جانتا ہے کہ اس نے مختلف مساجد، اسلامک ریلیف (Islamic Relief)، کیئر (CAIR) اور دیگر تنظیموں میں جو خدمات سر انجام دی ہیں، وہ اس کے ایک اچھا انسان اور با عمل مسلمان ہونے کا ثبوت ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمارے خاندان کی ایسی پہچان بنائی۔ میں نے احمد کے بارے میں اپنے سب خاندان کے لوگوں سے ذکر کیا تو میری بیگم کی طرف سے کچھ مزاحمت ہوئی جنھیں بعد میں صائمہ نے کوشش کر کے راضی کر لیا۔ یوں احمد اور عائشہ کی شادی انجام پائی۔

دونوں اس وقت امریکہ میں ہی قیام پذیر ہیں اور خدا نے ان کو دو پیاری سی بیٹیاں عنایت کی ہیں، جن کے نام بالترتیب اصیل (Aseel) اور عاصمہ (Asma) ہیں۔ دونوں میاں بیوی سماجی بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کے حصّہ لیتے ہیں۔

اسلامک سوسائٹی آف اروائن میں بچّوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس

کرانے کے لئے سنڈے سکول(Sunday School) کا اجراء کیا گیا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ سکول اتوار کے دن لگتا ہے۔ سب بورڈ آف ڈائریکٹرز نے کہا کہ ایسے سکول جگہ جگہ کھلے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی کلاسز بالکل مفت رکھیں تا کہ زیادہ طلبہ داخلہ لیں۔ عائشہ نے کہا کہ میں اس تجویز سے متفق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں طلبہ سے فیس لینی چاہیے اور میرے پاس اس کے حق میں مضبوط دلائل ہیں۔ بہرحال عائشہ کی تجویز پر سنڈے سکول کے بچوں سے فیس لینے کا اجراء ہوا۔

بورڈ آف ڈائریکٹرز کی توقعات کے برعکس لوگوں کا ردعمل شاندار تھا۔ یہ سکول اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ جلد ہی مقررہ تعداد سے طلبہ تجاوز کر گئے اور ان کے لئے اتوار کے علاوہ ہفتے کو بھی کلاسز منعقد کرانا پڑیں۔ عائشہ سکول کے بچوں کو پڑھانے میں بے انتہا دلچسپی لیتی تھی اور بچوں کی تربیت پر خصوصی توجّہ دیتی تھی۔ اس کا سکول کے طلبہ وطالبات کے ساتھ روّیہ بے حد دوستانہ ہوتا۔

سکول فیس سے حاصل ہونے والی رقم پہ اختلافات کھڑے ہو گئے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کا کہنا تھا کہ فیس سے حاصل شدہ رقم سکول پر خرچ کی جائے جب کہ عائشہ کا کہنا تھا کہ یہ رقم جن سے لی گئی ہے انھی پر لگائی جائے گی۔ عائشہ کا کہنا تھا کہ اس رقم سے بچوں کو تفریحی و تاریخی مقامات کی سیر کرائی جائے گی تا کہ ان کے علم میں اضافہ ہو۔ اس معاملے پر بڑا جھگڑا ہوا مگر بالآخر بورڈ آف ڈائریکٹرز کو عائشہ کی بات ماننی پڑی۔ عائشہ کا سکول چلانے میں کردار بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ اپنے اس کام میں کتنی دلچسپی لیتی تھی اس کا اندازہ آپ کو مندرجہ ذیل واقعے سے ہو جائے گا۔

عائشہ شادی کے بعد کویت آ گئی کیوں کہ اس کے میاں احمد المطوع کا تعلق کویت سے ہے۔ وہ ہر سال گرمیوں میں سمر کیمپ کے لئے امریکہ واپس جاتی تھی۔ جون 2009 میں عائشہ کی ایک دوست امریکہ سے دبئی آئی تو اس نے عائشہ کو اپنے ساتھ سیر کی

دعوت دی۔ عائشہ اس سے ملنے کویت سے دبئی آگئی۔ سفاری ڈیزرٹ کی سیر کے دوران عائشہ بائیک سے گر کر شدید زخمی ہو گئی۔ میں اور بشریٰ پاکستان میں تھے۔ ہم فوراً دبئی پہنچے۔ عائشہ کا چہرہ بری طرح زخمی تھا۔ میں اور میری بیگم اس کے کمرے میں گئے مگر میں اس کی حالت دیکھ کر زیادہ دیر اندر نہ رہ سکا اور باہر آگیا۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب عائشہ کی طبیعت تھوڑی سنبھلی تو اسے خیال آیا کہ امریکہ میں سکول کے بچوں کا سمر کیمپ شروع ہونے والا ہے تو باوجود اس کے کہ ڈاکٹروں نے سفر سے ہزار منع کیا وہ نہ مانی۔ عائشہ نے کہا کہ اس کا امریکہ جانا بے حد ضروری ہے۔ اپنی صحت کا خیال کئے بغیر اس نے بچوں کی تعلیم و تربیت کو ترجیح دی اور امریکہ چلی گئی۔

میری دعا ہے کہ خدا ایسی نیک اور سمجھدار بیٹیاں ہر کسی کو عطا فرمائے۔ جب عائشہ سے میرے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا

''میرے والد عام لوگوں جیسے نہیں، وہ نہایت سادہ اور پیار کرنے والے ہیں۔ ہم نے جو چیز مانگی انھوں نے ہمیں لا کر دی۔ ہمیں خلق خدا کی خدمت کا درس دیا اور بتایا کہ نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ غیر مسلم لوگوں کی بھی مدد کرنی چاہیے۔'' انھوں نے ہمیں پیسے کی اہمیت کے بارے میں بتایا۔ جب ہم ان سے جیب خرچ مانگتے تو وہ ہمیشہ کہتے کہ وہاں سے اٹھا لو یا میرے کپڑوں سے لے لو۔ وہ ہمیں باور کراتے کہ پیسے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھنے سے نہیں ملتے بلکہ انھیں حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

مختار احمد۔ میرا لاڈلا بھائی

ہم دونوں بھائیوں کے درمیان مثالی پیار رہا ہے۔ مختار احمد میرا چھوٹا بھائی، میرا دوست اور دست راست رہا۔ ہم بچپن سے ہی اکٹھے رہے۔ ایک ساتھ سکول جاتے، ایک ساتھ کھیلتے اور ایک ساتھ کھاتے پیتے۔ وہ مجھ سے چھوٹا تھا اس لئے قدرتی طور پر میرے دل میں اس کے لئے محبت کے ساتھ ساتھ شفقت بھی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کا خیال

رکھا اور خود پر فوقیت دی۔ جواباً مختار احمد کا ردّ عمل بہت شاندار تھا۔ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ دلی پیار، انس اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ ہم ایک دوسرے کی صحبت میں بے حد خوش رہتے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے اور گپ شپ کے ساتھ ساتھ ہماری باتوں کے موضوعات وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے تھے مگر ہماری ذہنی ہم آہنگی میں ہمیشہ اضافہ ہوا۔ ہم ایک دوسرے کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کرنے پر تیار ہو جاتے۔ وہ اگرچہ مجھ سے چھوٹا تھا مگر میں اسے بڑے بھائیوں جیسی اہمیت دیتا رہا ہوں۔ اس کی رائے کو اپنی رائے پر افضل جانتا۔ ہم اکثر کاروباری معاملات پر بھی بات کرتے۔ دراصل ہم دونوں ہی فطری طور پر کاروبار کی اونچ نیچ کو سمجھتے تھے اور آگے چل کر اپنی اپنی جگہ ہم بہترین تاجر ثابت ہوئے۔ افسوس کہ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ (2012) میں الزائمر کے مرض سے وفات پا گئے۔ انھوں نے لواحقین میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں۔

یہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اتفاق ہی تھا کہ میں مختار احمد کے آخری وقت میں اس کے پاس تھا۔ میں نے کمالیہ جانا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ جب کبھی ایک آدھ مرتبہ کسی ضروری کام سے گیا تو کام ختم کر کے فوراً واپسی کی راہ لی لیکن اس مرتبہ میں نے وہاں قیام بڑھا دیا۔ یہ سب کسی ارادے اور منصوبہ بندی کے بغیر ہوا۔ مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں چھوٹے سے چھوٹا کام بھی منصوبہ بندی کے ساتھ کرنے کا عادی ہوں۔ یہ محض خدا کا فضل تھا۔ جب مختار بھائی کا آخری وقت آیا تو میں اس کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پہ جب کہ دوسرا اس کے رخسار پر تھا۔ میں اس کی پیشانی کو سہلاتا اور ہاتھ کو دباتا رہا۔ اسی عالم میں مختار احمد نے آخری ہچکی لی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے تکلیف اور اذیت میں تھا۔ اللہ کو پیارا ہونے سے اس کی تکلیف اور اذیّت بھی تمام ہوئی۔ یوں ایک طرح سے موت رحمت ہی ثابت ہوئی۔

جب مختار بھائی کی میت کو کاندھا دینے کی باری آئی تو میں نے گھر سے قبرستان

تک اپنے پیارے بھائی کی میت کو کاندھا دیا۔ لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میں ایسا نہ کروں لیکن میں نے سب کی باتوں کو نظر انداز کیا اور اپنے پیارے بھائی کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔

میرے دوست

امریکہ میں میرا پہلا دوست

میں جب پہلی بار کیلیفورنیا کے صدر مقام سیکرامنٹو میں اترا تو یہ میرے لیے قطعی اجنبی سرزمین تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں نے بابا امیر الدّین تک کیسے پہنچنا ہے۔ میں ائرپورٹ پہ کھڑا ابھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ مجھے قریب سے آواز آئی ''میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

میں نے مڑ کر دیکھا: ''جی ہاں! میں یہاں پہ نووارد ہوں۔ آج ہی پاکستان سے آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے یہاں سے کدھر جانا ہے۔''

یہ جیک ووڈ (Jack Wood) اور گلیڈس (Gladys) تھے جو ائرپورٹ پر اپنی بیٹی کو لینے آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہاں جانا ہے۔ میں نے انھیں بابا امیر الدّین کا پتہ بتایا اور کہا کہ مجھے ان کے پاس جانا ہے۔ انھوں نے مجھے پیشکش کی کہ وہ مجھے اس پتے پہ چھوڑ سکتے ہیں۔ میں بخوشی راضی ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیٹی کو وصول کیا اور مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہاں سے انھوں نے اپنے شہر جانے کے بجائے بابا امیر الدّین کے گھر کی جانب رخ کیا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی اسلام آباد ائرپورٹ سے نکلے اور اسلام آباد جانے کے بجائے مخالف سمت، روات کا راستہ پکڑے۔ انھوں نے مجھے بابا امیر الدّین کے گھر کے سامنے جا کے اتارا یہی نہیں بلکہ وہ اس

وقت تک وہاں گاڑی میں موجود رہے جب تک میں گھر کے اندر نہ چلا گیا۔ میں نے در حقیقت خدا کا شکر ادا کیا کیوں کہ اس وقت میری جیب میں کل پچاس ڈالر تھے اگر میں ٹیکسی میں بابا امیر الدّین کے پاس پہنچتا تو یہ پچاس ڈالر خرچ ہو جاتے اس لئے میرے دل میں ان کے لئے تشکّر کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ میری ان کے ساتھ گہری دوستی قائم ہو گئی۔ ہم بعد میں ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ انھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ مہربانی اور شفقت کا سلوک کیا۔

فریڈ براؤن اور ڈورتھی براؤن (فیملی فرینڈ)

مسٹر فریڈ براؤن (Fred Brown) اور ڈورتھی براؤن (Dorthy Brown) سے میری ملاقات کالج میں ہوئی۔ ابتدائی تعارف کے بعد انھوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ جس کے بعد میرے ان کے ساتھ انتہائی مضبوط تعلقات قائم ہوئے۔ رفتہ رفتہ میں ان کے گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ جب باہر کہیں کھانا وغیرہ کھانے کے لئے جاتے تو مجھے اپنے ہمراہ ضرور لے جاتے۔ یہ 1957 کی بات ہے۔ اس وقت فشر مین ریف (Fisher man's wraf, San Francisco) میں ایبلونی سٹیک (Abaloni Stake) پر تقریباً پندرہ ڈالر ($15) فی آدمی خرچ آتا تھا۔ میرے اصرار کے باوجود وہ میرے کھانے کا بل خود ہی ادا کرتے۔ یہ ان کی بے لوث محبت کا اظہار تھا۔

تمام امریکی کرسمس، نیو ائر نائٹ وغیرہ پہ اندھا دھند شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ وہاں لوگ ان مواقع پر اتنی شراب استعمال کرتے ہیں کہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ مسٹر فریڈ براؤن (Fred Brown) اور ڈورتھی براؤن (Dorthy Brown) مجھے ہر مرتبہ باور کراتے کہ آپ جب بھی ایسے کسی موقع پر ہمارے گھر آؤ تو پانی یا کولڈ ڈرنک کی وہ بوتل استعمال کرنا جو بند ہو کیونکہ ہم لوگ اکثر ایسی بوتلوں میں شراب ملا کے رکھ دیتے ہیں۔

میں جب کبھی ناشتے پر ان کے ہمراہ ہوتا، چاہے ان کے گھر پہ یا باہر کسی ہوٹل میں تو وہ میری موجودگی کا خیال کرتے ہوئے بیکن کا آرڈر نہ کرتے۔ (قارئین کی دلچسپی کے لئے بتاتا چلوں کہ زیادہ تر امریکی ناشتے میں بیکن یا سؤر کا گوشت استعمال کرتے ہیں)۔ اس کے بجائے وہ میرے احترام میں بیف ساسیج (Beef Sausage) یا سٹیک (Stake) کا آرڈر کرتے۔ ان کے ایسے رویّے کی وجہ سے میں ان کا بے پناہ احترام کرتا اور ہر ممکن کوشش کرتا کہ انھیں اپنے والدین جیسی عزّت دوں۔

ڈاکٹر ولیم جیکسن

ڈاکٹر ولیم جیکسن میرے بے حد اچھّے دوست ہیں۔ وہ ڈیزیرٹ انٹر نیشنل کے چیئر مین ہیں اور عالمی طور پر اپنی فلاحی خدمات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی تنظیم ڈیزیرٹ انٹر نیشنل پوری دنیا میں آنکھوں کے آپریشن اور مریضوں کو بینائی لوٹانے کے لئے معروف ہے۔ وہ ایک پکے مورمن (Mormon) ہیں۔ مورمن عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے۔ جن کا اپنا ایک زندہ پیغمبر (Living Prophet) ہوتا ہے۔ مورمن لوگ شراب نہیں پیتے حتیٰ کہ چائے، سگریٹ اور کولا مشروبات کا استعمال بھی نہیں کرتے۔ اپنی آمدنی یا تنخواہ کا دس فیصد اپنے چرچ، دی چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس (The Church of Jesus Christ of Later Day Saints) کے نام کرتے ہیں۔ ان میں عام اخلاقی برائیاں نہیں پائی جاتیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ انتہائی دیانت داری اور خوش اخلاقی کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے لگتا ہے کہ اگر یہ مورمن لوگ کلمہ پڑھ لیں تو انھیں کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور یہ بنے بنائے مومن ہوں گے۔

اکتوبر 2005 میں آنے والے تباہ کن زلزلے کے موقع پر ڈاکٹر ولیم جیکسن (Dr. Willium Jackson) ہمارے ساتھ موجود تھے۔ وہ رمضان المبارک

کے دن تھے۔ ہم سب لوگ روزے سے ہوتے تھے۔ وہ سارا دن ہمارے ساتھ گزارتے۔ وہ ہمارے روزے کے احترام میں خود بھی بھوکے پیاسے رہتے اور ہمارے اصرار کے باوجود کچھ کھانے پینے کو تیار نہ ہوتے۔

عام طور پر امریکی لوگ انتہائی مخلص، خوش اخلاق اور صاف گو ہیں۔ اگر آپ ان سے کوئی مشورہ طلب کریں تو وہ آپ کی بات کو غور سے سنیں گے اور نیک نیتی سے مشورہ دیں گے۔

ہر شخص فطرتاً خیر کا طالب ہے لیکن جہالت کی وجہ سے شر کو خیر سمجھ لیتا ہے۔ اس لئے جہالت کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ لوگ خیر اور شر میں امتیاز کر سکیں۔ جو شخص پختہ طور پر کسی بات کو خیر سمجھے گا وہ ضرور اس کے مطابق عمل کرے گا۔

(سقراط)

باب پنجم

فلاحی سرگرمیاں

اس نظام کائنات کو اللہ تبارک و تعالیٰ چلا رہا ہے جو اس کا خالق ہے۔ تمام معلوم و نامعلوم مخلوق کا رازق وہی ہے۔ انسان کے علاوہ دیگر مخلوق کبھی بھوک کے عفریت کا شکار نہیں ہوئی۔ البتہ بعض اوقات ایسا ضرور ہوا کہ انسانوں پر آنے والے عذاب نے باقی مخلوق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تاہم زیادہ تر مواقع پر انسان ہی انسان کو ظلم کا شکار بناتا ہے۔ انسان لالچ اور ہوس کی بناء پر دوسروں کے حصّے کا رزق اپنے پاس روک لیتا ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھوک پھیلتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جرائم بڑھنے لگتے ہیں۔ انسان کی ترقی کی رفتار رک جاتی ہے اور تہذیب و تمدّن کا ارتقاء بری طرح متاثّر ہوتا ہے۔

اسماناں تے اڈدے پنچھی — ویکھ تے سہی کی کردے نیں
نہ او کردے رزق ذخیرہ — نہ او بھکے مردے نیں
کدی کسے نے پنکھ پکھیرو — بھکے مردے ویکھے نیں
بندہ ای کردہ رزق ذخیرہ — بندے ای بھکے مردے نیں

(حضرت بابا بلّھے شاہؒ)

سائل کے ہاتھ پہ کچھ رکھنا اور بات ہے اور اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے کسی کو نوازنا ایک بالکل علیحدہ بات ہے بعض لوگ اپنی مٹھّی کو اتنی سختی سے بند کر کے رکھتے ہیں کہ کسی کو کچھ دینا گوارا ہی نہیں کرتے۔ اس حوالے سے ایک حکایت مجھے یاد آ رہی ہے۔

ایک حکایت

ایک فقیر نے دکاندار سے سوال کیا۔ دکاندار نے جواب دیا کہ ابھی تو دکان کھولی ہے۔ میں نے کچھ کمایا ہی نہیں، بعد میں آنا۔ فقیر کافی دیر بعد دوبارہ اس دکان کی طرف پلٹا اور دست سوال دراز کیا۔ دکاندار نے کہا بعد میں آنا۔ فقیر عالم حیرت میں وہاں سے چل دیا اور کئی گھنٹے بعد لوٹا اور دکاندار سے خیرات مانگی۔ چالاک تاجر اس وقت اپنی دکان بند کرتا تھا۔ اس نے پرانا جواب دیا کہ معاف کرو بابا۔ فقیر نے صدا دی ”جناب! اگر پیسے نہیں دے سکتے تو تھوڑی سی گندم ہی دے دو۔ دکاندار ترشی سے بولا کہ ایک مرتبہ کہہ دیا نا کہ معاف کرو۔ فقیر نے کہا اچھا ایسا کرو مجھے وہاں سے تھوڑی سی مٹّی اٹھا کر دے دو۔ دکاندار نے بادل نخواستہ اسے مٹّی اٹھا کر دی اور پوچھا ”تم اس مٹّی کا کیا کرو گے“؟ فقیر بولا ”میں اس کا کچھ نہیں کروں گا لیکن ہو سکتا ہے تمہیں کچھ دینے کی عادت پڑ جائے۔“

حقیقی اسلام کی جھلک

خدا کا آفاقی قرآنی پیغام جو اسلام کی صورت مکمل ہوا اگر اس الہامی پیغام کے اوّلین حصّوں کا بلاتعصّب مطالعہ کیا جائے یعنی زبور، توریت اور انجیل مقدّس تو کھلے گا کہ انسانیت کی خدمت کا درس ہر ایک میں یکساں طور پر مرقوم ہے۔ یہ یکسانیت پیغام اس بات کی دلیل ہے کہ ان تمام پیغامات کا خالق ایک ہی ہے۔ قرآن پاک کی تعلیمات کا نچوڑ اگر پیش کیا جائے تو وہ ایک اللہ کی عبادت، اس کے پیغمبر ﷺ کی اطاعت اور اس کی مخلوق کا احترام و خدمت ہے۔

دین اسلام انسانیت کے احترام اور ان کے ساتھ معاملات میں صبر و برداشت سے کام لینے کا درس دیتا ہے۔ اس حوالے سے ایک حیرت انگیز واقعہ کا ذکر کرنا مناسب

معلوم ہوتا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ ہمارے رہبر ﷺ کیسے عظیم ہیں۔ انھوں نے صرف زبانی نہیں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے ہمیں سمجھایا۔ لوگوں کی خدمت اور ان سے معاملات میں کیسے صبر اور برداشت سے کام لینے کی ہدایت کی۔

ایک مرتبہ ایک دیہاتی (بدّو) نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابۂ کرامؓ کو یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور وہ اس دیہاتی کو مارنے کے لئے دوڑے۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے محبوب ﷺ جو کہ تمام لوگوں پر مہربانی فرمانے کو تخلیق کئے گئے اور دنیا میں اعلیٰ انسانی اقدار کو پھیلانے تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے صحابۂ کرامؓ کو روکا اور فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور جگہ پانی سے صاف کر دو۔ تم لوگ (مسلمان) آسانیاں پیدا کرنے کے لئے تخلیق کئے گئے ہو، مشکلات پیدا کرنے کے لئے نہیں (مفہوم)۔

اس حدیث شریف کی رو سے ہمیں موقع کی تلاش میں رہنا چاہیے کہ ہم کہاں کہاں دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں؟

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پیغام کیا ہے؟ دوسرے الفاظ میں اسلام کیا ہے.....؟ اس کی جھلک اوپر بیان ہو چکی ہے۔ پیار، محبّت، عفوو در گزر، نرمی، حکمت سے تعلیم و تربیت، احترام انسانیت ایسے پھول ہیں جو سدا معاشرے کو مہکاتے رہتے ہیں۔ ہاں! قوت کا استعمال ان کے خلاف ضروری ہے جو انسانیت کے لئے ناسور ہیں اور سمجھانے کے باوجود باز نہیں آتے۔

اللہ تعالیٰ اس بات پہ قادر ہے کہ وہ اپنی لاڈلی مخلوق کی خدمت کسی بھی ذریعے سے کروا سکتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس خدمت کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہی ہے کہ اس نے مجھ جیسے عاجز اور خاکسار کو خدمت انسانیت کے کچھ امور سرانجام دینے کی توفیق بخشی اور یہ بے حد و حساب رحمت ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا دن رات شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری رہنمائی کی اور مجھے اپنی مخلوق کی خدمت کرنے کا موقع دیا۔

در حقیقت اگر آپ انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں تو آپ کو اس زندگی سے اور کیا چاہیے.....؟

میں نے زندگی بھر تمام فلاحی کام اللہ کی رضا کے لئے کئے۔ آقا ﷺ کی خوشی کی خاطر مخلوق خدا کو آسانیاں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ فلاحی کاموں کا تذکرہ اس مقصد سے کر رہا ہوں تاکہ دوسرے لوگوں کو ترغیب ہو ورنہ ہو سکتا ہے میں یہ سب کچھ بیان نہ کرتا۔

امریکہ پہنچتے ہی مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ یہاں بسنے والے مسلمان مذہب سے بہت دور ہیں۔ دہائیوں قبل امریکہ آ کے آباد ہونے والے مسلمان مکمل طور پر مغربی تہذیب میں رچ بس کر اپنی پہچان اور تشخص بھول چکے تھے۔ میں بحیثیت مسلمان اپنا فرض سمجھتا تھا کہ میں ایسے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد لاؤں۔ خاص طور پر نوجوان لوگوں کو اسلام کی جانب راغب کرنے کی کوشش کروں۔

مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA)

ہم مسلمان طلبہ نے مل کر سیکرامنٹو میں مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے زیر سایہ ہم نے بہت سے پروگرام شروع کئے جو خصوصی طور پر نوجوانوں کے لئے ترتیب دیئے گئے تھے۔ ان میں سر فہرست قرآن و تفسیر کا پروگرام تھا۔ تمام ممبران باری باری تفسیر کا درس دیتے۔ جس کی باری ہوتی اس کو خوب تیاری کر کے آنا پڑتا اور وہ مختلف تفاسیر سے استفادہ کرتا کیوں کہ آخر میں اسے حاضرین کے سوالات کے جواب دینا پڑتے تھے۔

یہ تنظیم جو چند طلبہ نے قائم کی تھی، آنے والے وقتوں میں خوب پھلی پھولی اور اسے پورے امریکہ میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد میں مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) کے زیر انتظام ہر طرح کے پروگرام ترتیب دیئے جانے لگے جس میں

بچّوں اور طلبہ کے لئے پروگرام شامل ہوتے تھے۔
مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن(MSA) کے ممبران کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ کالج میں مسلمان طلبہ کی تعداد میں اضافے کے ساتھ یہ تنظیم مضبوط ہوتی رہی یہاں تک کہ آنے والے وقتوں میں یہ امریکی مسلمانوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بن گئی۔ اسی تنظیم کی بدولت اور اللہ پاک کی رحمت کی وجہ سے تقریباً ہر امریکی کالج میں پرنسپل نے نماز جمعہ کے لئے ایک کمرہ مختص کیا۔ امریکی مسلمان اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ(Islamic Society Of North America) اور اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ(Islamic Circle of North America) نامی تنظیموں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان دونوں معروف تنظیموں کے ممبران کی تعداد لاکھوں میں ہے۔
الحمداللہ یہ دونوں تنظیمیں مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن(MSA) کی ذیلی شاخیں ہیں جو پھل پھول کر اب تناور درخت بن چکی ہیں۔

امن واسلام کی علمبرداری

1957ء میں پورے امریکہ میں مساجد کی تعداد تین تھی۔ اس زمانے میں وہاں پر مسلمان عالم تو کجا امام مسجد تک مہیّا نہ تھے۔ اس وقت مسلمان اتنی بڑی تعداد میں نہ تھے۔ امریکی لوگ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے تھے خاص کر وہ اسلامی تہواروں کے بارے میں متجسّس تھے۔ اللہ پاک نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی کہ میں مسلمانوں اور پاکستان کے غیر رسمی سفیر کے طور پر انھیں اسلام کے بارے آگاہ کر سکوں۔ مختلف مواقع پر مجھے ٹی وی اور ریڈیو پہ بلایا جاتا۔ میں انھیں رمضان اور عیدین کے بارے میں بتاتا۔ امریکی جاننا چاہتے تھے کہ ہم کرسمس کیسے مناتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلّام کے بارے کیا عقیدہ ہے؟
پیرنٹس ٹیچرز ایسوسی ایشن (PTA) ، مختلف چرچ اور دیگر معروف سماجی

تنظیمیں اس ضمن میں پیش پیش رہیں۔

امریکی مسلمانوں میں دین کا شعور آہستہ آہستہ بیدار ہوا۔ مذہبی بیداری کی لہر نے انھیں اپنے دین کی جانب رجوع کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس کے نتیجے میں آج صرف جنوبی کیلی فورنیا میں سو(100) کے قریب اسلامی مراکز ہیں۔ ان میں اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی ایسا اسلامی مرکز بھی ہے جہاں عیدین کے مواقع پر کم و بیش بارہ ہزار سے زائد کا مجمع ہوتا ہے۔

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی

ہم چند خاندانوں نے مل کر ایک چھوٹا سا مکان خریدا جس میں ہم نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی بنیاد رکھی۔ گیراج میں ہم نے نماز کی ادائیگی کے لئے جگہ بنائی۔ ایک کمرہ خواتین جبکہ ایک کمرہ بچّوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے مختص کیا گیا۔ یہ چھوٹی سی مسجد جو چند افراد نے شروع کی تھی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب جامع مسجد بن چکی ہے جہاں پر جمعہ کی نماز کے لئے تقریباً ایک ہزار(1000) تک نمازی جمع ہوتے ہیں۔ بے شمار لوگ اتوار کو مختلف پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ مسجد جس علاقے میں واقع ہے وہاں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بستی ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کا شمار قابل ذکر مسلم تنظیموں میں ہوتا ہے جس کے ممبران کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اسی تنظیم کے زیر سایہ امریکہ کے پہلے اسلامی سکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس سکول کے قیام کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

امریکہ کا پہلا اسلامی سکول

صائمہ جب سکول جانے کی عمر کی ہوئی تو ہم نے اسے ایک امریکی سکول میں داخل کرایا۔ ایک دن صائمہ جب سکول سے واپس آئی تو اس نے ایک ایسی بات کہی کہ

میں چونک گیا یہ ایک نئی بات تھی۔

میں نے صائمہ کو پاس بلایا اور پوچھا: ”بیٹا! یہ لفظ آپ نے کہاں سے سیکھا ہے؟ یہ لفظ ہماری خاندانی ڈکشنری میں تو موجود نہیں۔“

اس نے معصومیت سے جواب دیا ”پاپا سکول میں یہ عام بات ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! کل سے آپ ایسے سکول نہیں جاؤ گی جہاں ایسی لغو قسم کی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔“

میں نے تھوڑی دیر توقّف کے بعد کہا ”اب میں اپنا اسلامی سکول بناؤں گا۔“

میری بیگم نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا گویا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ فرمانے لگیں ”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ یہ کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے.....؟“

میں چونکہ اس قسم کی باتیں پہلے بھی بہت سن چکا تھا اس لئے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ میں بڑے اچھّے طریقے سے جانتا تھا کہ.....

اللہ سے کرے دور تو تعلیم بھی فتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لئے اٹھّے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا، نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

میں نے فیصلہ کیا کہ مسلمان بچّوں کے لئے علیحدہ سکول کا ہونا ضروری ہے۔

اگلے دن میں نے ایک درخواست لکھی اور اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے پیش کر دی۔ درخواست پڑھنے کے بعد سب نے مجھے، میری بیوی جیسی مشکوک نظروں سے دیکھا گویا میں پاگل ہو گیا ہوں..... کہنے لگے ”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ یہ کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے؟“

لیکن میں چونکہ یہ بات گھر سے بھی سن کے آیا تھا اس لئے اسے چنداں اہمیت نہ

دی۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا اور سنجیدگی سے کہا

''سنو دوستو! میری بات سنو!''

''ہم لوگ سات سمندر پار سے یہاں پر آئے ہیں، رزق حلال کمانے اور اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر..... اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں کی تہذیب و تمدّن اور ہمارے طرز زندگی میں واضح تضاد ہے۔ اگرچہ معاشی مجبوریوں نے ہمیں اور یہاں کے باسیوں کو ایک ہی زنجیر میں باندھ رکھا ہے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنے قابل فخر ورثے (Heritage) کو بھول کر یہاں کی رنگینیوں میں گم ہو جائیں۔ اسلام ہمیں غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ بھی عمدہ سلوک روا رکھنے کا حکم دیتا ہے اس لئے ہمیں اس معاشرے میں بغیر کوئی فساد کھڑا کئے سہولت سے زندگی گزارنی چاہئے لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ ہمارے بچّے ہمارا مستقبل ہیں۔ ہم ان کے کچّے ذہن کی تعلیم و تربیت اسلامی انداز سے نہیں کریں گے تو لازماً وہ یہاں کے بچوں سے اثرات قبول کریں گے اور اپنی تہذیب و تمدّن اور تشخّص فراموش کر دیں گے۔ میں یہ بات زور دے کر کہوں گا کہ ایک ایسی جگہ، ایک ایسا ادارہ ضرور ہونا چاہئے جہاں ہم نہ صرف اپنے بچّوں کو اسلامی طور طریقوں کے مطابق زیور تعلیم سے آراستہ کریں بلکہ وہاں ان کی معقول تربیت کا بھی تسلّی بخش انتظام موجود ہو۔''

جب میں نے اپنی بات ختم کی تو سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ میری ہر بات سے متفق ہوں مگر ان کا جواب تھا کہ ابھی ہم سکول نہیں بنا سکتے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے موجود نہیں۔ ہم چند لوگ ہیں اور اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنا سکول کھول سکیں۔

میں اس وقت خاموش ہو گیا مگر ہمّت نہ ہاری اور بعد میں انھیں آمادہ کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ صائمہ کو میں نے سکول جانے سے روک رکھا تھا اور اسے گھر پہ ہی

پڑھایا جا رہا تھا۔ اسی دوران کئی ماہ گزر گئے۔ جب بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوتی تو میں ان کو اسلامی سکول بنانے کی درخواست پیش کر کے یاد دہانی کراتا۔ میرے بار بار کہنے پر جب وہ سارے کے سارے زچ ہو گئے تو کہنے لگے!

"یار تم تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ چلو ایسا کرتے ہیں کہ اگلے سال سکول شروع کر دیں گے..... اب خوش ہو..... براہ مہربانی یہ درخواست دوبارہ لے کر ہمارے پاس مت آنا۔"

میں واقعی خوش تھا لیکن کام ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ اگلے ہفتے میں پھر درخواست لے گیا اور کہا

"صاحبو! اگلے سال سکول کھولنے کی تجویز خوش آئند ہے لیکن پہلے مجھے لکھ کر دو کہ ہم اگلے سال تک زندہ بھی رہیں گے..... لکھ کر نہیں دے سکتے..... تو چلو وعدہ ہی کر لو۔"

دفعتاً ماحول میں خاموشی چھا گئی..... لگتا تھا، سانپ سونگھ گیا.....۔

اسلامی سکول کا آغاز

ہم نے اپنے وسائل کے مطابق ایک خستہ حال چرچ خرید کر مسجد میں تبدیل کر رکھا تھا۔ چرچ کے ہال سے ملحق ایک کانفرنس ہال کو ہم نے بچوں کے سکول کے لئے مختص کر دیا۔ یہ سکول اسلامی تشخّص رکھنے کے ساتھ ساتھ امریکی تعلیمی نظام کی تمام خوبیاں بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس ہال کے ہر کونے میں ہم نے ٹاٹ بچھا کر بچّوں کی پڑھائی شروع کرا دی۔ یہ کام تو ہو گیا مگر بچّوں کے والدین کو تحفّظات تھے کہ ان کے بچے ٹاٹ پہ بیٹھ کے پڑھتے ہیں۔ سب والدین کا مطالبہ تھا کہ بچوں کے لئے کوئی قابل عزّت جگہ بنائی جائے جہاں وہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ وہ کہتے کہ ان کے بچے اس حال میں پڑھ رہے ہیں گویا پاکستان کے کسی گاؤں میں ہوں۔ ایسے عالم میں پڑھائی کرنے سے ممکن ہے

کہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں۔ اس لئے ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔

کچھ عرصے بعد بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی (ISOC) کے اجلاس میں قرارداد منظور کی کہ سکول کے لئے نئی عمارت بنائی جائے۔ اس کے اخراجات کا تخمینہ دو ملین ڈالر ($2000000) لگایا گیا۔ اس منصوبے کا چیئرمین خاکسار کو نامزد کیا گیا۔ اس وقت پیسے نہ ہونے کے برابر تھے۔ پہلے ہمیں سکول کی عمارت بنانے کے لئے عطیّات اکٹھّے کرنے تھے۔ ابھی اس منصوبے پہ کام کا آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

کمیونٹی کی رائے کا تقسیم ہونا

جہاں ہم نے سکول بنانا تھا اس سے ملحق دو ایکڑ زمین خالی پڑی تھی۔ جس کے بارے میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ زمین ایک شخص خریدنے کی کوشش کر رہا ہے جو یہاں اپارٹمنٹ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا منصوبہ متعلقہ سرکاری محکمے نے منظور کر لیا تھا۔ اب ہماری کمیونٹی کے افراد دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروپ کا کہنا تھا کہ ہمیں سکول کی نئی عمارت کی بہت ضرورت ہے کیونکہ ہمارے بچے ٹاٹ پہ بیٹھ کے پڑھتے ہیں جبکہ دوسرے گروپ کا مؤقّف تھا کہ ہمیں اس شخص سے زمین خرید لینی چاہئے جو اس پہ اپارٹمنٹ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ جب یہاں پر فلیٹ تعمیر ہوں گے تو ان کی بالکنی میں لڑکیاں بکنی (انتہائی مختصر لباس) پہن کے شمسی غسل (Sun Bath) کریں گی۔ یہ مسجد اور سکول کے سامنے درست نہ ہو گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ نئی عمارت تعمیر کرنے کے بجائے اس شخص سے وہ زمین خرید لی جائے تاکہ ہم لوگ سکون سے نماز ادا کر سکیں اور ہمارے بچّے اپنی تعلیم پہ توجّہ مرکوز کر سکیں۔ یہ معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ تنازع کی کیفیت پیدا ہو گئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ کیا کرنا چاہیے.....؟

آمادگی کی کوشش

میں چونکہ منصوبے کا سربراہ تھا اس لئے مسئلے کا حل سوچتا رہا۔ چند دن بعد میں نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے ممبران کی میٹنگ طلب کی۔ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے ممبران میں مصری، عربی، پاکستانی، بنگالی، انڈین غرضیکہ پوری دنیا کے مسلمان ممالک سے امریکہ آئے لوگوں کی بڑی تعداد شامل تھی۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو میں اپنی نشست سے اٹھا۔ ان کے آنے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اپنی بات کا آغاز امریکی مسلمانوں کو درپیش مسائل سے کیا۔ اس کے بعد میں نے حالیہ مسئلے پر بات کرنا شروع کی۔ آہستہ آہستہ میری آواز بلند اور لہجہ تلخ ہوتا چلا گیا۔ میں نے کہا

"آپ لوگ اتنے بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں۔ آپ میں سے اکثر لوگوں کے پاس مرسڈیز (Mercedeze Benz) ہے۔ آپ کے کلیدی عہدوں پر فائز لوگوں سے تعلّقات ہیں اور یہ سب کچھ آپ کی اپنی ذات کے لئے ہے۔ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ آپ کے اور میرے بچّے ٹوٹے پھوٹے اور خستہ حال کمروں میں بیٹھ کے پڑھتے ہیں۔ ہماری مسجد اور سکول کے سامنے والی زمین پہ اپارٹمنٹ بننے جارہے ہیں۔ جہاں پر جلد ہماری آنکھوں کے سامنے نامناسب مناظر ہوں گے جن کو ہم برداشت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی حل موجود نہیں۔

"We must buy the land now and we must build school now."

مجھے یقین ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں اور اگر ہم سب مل کر سکول کی بلڈنگ نہیں بنا سکتے اور زمین نہیں خرید سکتے تو ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

جیسے ہی میرے الفاظ ختم ہوئے پورے ہال میں شور مچ گیا۔ "ہاں ہاں! ہم یہ کر

سکتے ہیں۔" سب اپنی نشستوں پہ کھڑے ہو کر چلّانے لگے۔ "برادر اسلم! ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

اس کے فوراً بعد ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں طے پایا کہ سکول بلڈنگ کے علاوہ ملحقہ دو ایکڑ زمین بھی خریدی جائے گی۔ سب نے اس میں اپنا حصہ ڈالنے کا عزم ظاہر کیا اور طے پایا کہ باقی اخراجات کے لئے دیگر مسلم تنظیموں اور کاروباری افراد سے عطیات کی اپیل کی جائے گی۔ سکول کی بلڈنگ میں کیفے ٹیریا اور پارکنگ کی جگہ بھی شامل تھی۔

جب ہم نے عطیّات اکٹھے کرنا شروع کئے تو ڈاکٹر مزمّل صدیقی اور باقی بورڈ آف ڈائریکٹرز نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ آپ فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے کسی بھی جگہ جاسکتے ہیں مگر آپ فلاں شخص کے پاس نہ جائیں۔ اس شخص کے پاس ہم خود جائیں گے۔ اس سے ہمیں بڑا بھاری عطیّہ ملنے کی امید ہے۔ (یاد رہے کہ وہ شخص پاکستانی نژاد امریکی تاجر ہے اور اس کا شمار امریکہ کے ممتاز مسلمان کاروباری و سماجی افراد میں ہوتا ہے)۔ مجھے ان کی یہ بات بہت عجیب لگی مگر میں خاموش رہا۔

اب ان لوگوں نے ان صاحب سے ملاقات کا وقت لینے کی کوشش شروع کر دی۔ چند روز کے بعد انھیں بڑی مشکل سے ملاقات کا وقت ملا۔ جب یہ لوگ ان سے ملنے کے لئے پہنچے تو ان کو کافی دیر باہر انتظار کرنا پڑا۔ اس شخصیت نے ان کے ساتھ کھڑے کھڑے چند منٹ گزارے۔ آنے کا مدّعا پوچھا۔ پانچ ہزار ڈالر کا چیک عطا کیا اور رخصت ہوگئے۔ ان لوگوں نے اپنی بڑی سبکی محسوس کی۔ انھوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ ہماری بڑی بے عزّتی ہوئی ہے۔ آپ خود ہی ان کو جا کے ملو۔

صفی قریشی

میں نے اپنے سٹاک بروکر سے رابطہ کیا اس شخص کا نام بتایا اور کہا کہ مجھے اس

کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ امریکہ میں پبلک کمپنیوں، ان کے عہدیداروں اور کاروباری لوگوں کی تفصیلات قانوناً خفیہ نہیں رکھی جا سکتیں لہٰذا جلد ہی مجھے معلومات مل گئیں۔ مجھے ایجنٹ نے بتایا کہ وہ ایک بہت امیر شخص اور کامیاب تاجر ہے۔ اس نے دیگر معلومات بھی مہیا کیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد میں نے اس شخص کو، جس کا نام ''صفی قریشی'' تھا، فون کیا۔ میں ان سے ملاقات کا وقت لینا چاہ رہا تھا۔

میں نے انھیں اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ مجھے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی طرف سے سکول بنانے کی ذمّہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کافی رقم کی ضرورت ہے جو ہم آپ جیسے لوگوں سے عطیّات اکٹھے کر کے پورا کریں گے۔ مجھے آپ سے ملاقات کا وقت چاہئے۔ میں اس وقت حیران رہ گیا جب میں نے ان کو یہ کہتے سنا تو ٹھیک ہے میں آپ کو کب آ کے ملوں۔ میں نے عاجزی سے کہا ''نہیں جی آپ مصروف آدمی ہیں۔ میں آپ سے آ کے ملتا ہوں۔''

انھوں نے کہا ''نہیں صغیر بھائی! میں خود آپ کو آ کے ملوں گا۔ آپ مجھے وقت اور جگہ بتائیں۔'' ان کے اصرار پر میں نے کہا ''چلو ایسا ہی سہی۔'' ہم نے ملاقات کا وقت اور طریقۂ کار طے کر لیا۔

صفی قریشی جب آئے تو بڑے تپاک سے ملے اور کہا ''صغیر بھائی! مجھے اس منصوبے کے بارے میں بتائیں کہ یہ ہے کیا؟'' جب میں نے انھیں بتایا کہ ہم ایک اسلامی سکول بنانا چاہ رہے ہیں تو انھوں نے اس میں بھرپور دلچسپی لی اور پوچھا کہ یہ سکول کیسا ہو گا؟ کتنا بڑا ہو گا؟ اس کا تعلیمی نصاب کس قسم کا ہو گا.....؟

میں نے انھیں تفصیل سے سکول کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے میرے بارے میں بھی پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں؟ میں نے انھیں بتایا کہ میں کاروبار کرتا ہوں۔ میں نے انھیں اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا۔ تمام تر تفصیلات جاننے کے بعد وہ کہنے

لگے ''صغیر بھائی !آپ کو کتنے پیسوں کی ضرورت ہے''؟ میں نے کہا''بیس ہزار ڈالر۔''
انھوں نے فوراً ہی چیک کاٹ کر میرے حوالے کیا۔ مجھے گلے لگایا اور کہنے لگے
''صغیر بھائی! جب بھی آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو مجھے فون کریں۔ آپ سے دوبارہ مل کے خوشی ہوگی۔''

رؤف گجیانی

سکول کے لئے عطیّات اکٹھے کرنے کے دوران رمضان المبارک آگیا۔ ہم نے لوگوں کو افطار ڈنر پہ بلایا تاکہ ان سے عطیّات کے لئے درخواست کی جاسکے۔ دونوں ہال شرکاء سے بھرے ہوئے تھے جن میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔ ان کے لئے بہترین افطار ڈنر کا بندوبست کیا گیا تھا جس پر بہت خرچ آیا۔ بد قسمتی سے جب عطیّات دینے کی باری آئی تو بہت کم لوگوں نے اس میں حصہ ڈالا حتّیٰ کہ جو خرچ ہوا تھا وہ بھی بمشکل پورا ہوا۔ یہ مایوس کن صورت حال دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اتنا خرچ کرنے کے باوجود کچھ فائدہ نہ ہوا۔

میں عشاء کی نماز کے لئے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اداسی میرے اندر گھر کر چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کی تقریب بے کار رہی۔ اسی اثناء میں ایک آدمی نے پیچھے سے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پوچھا''آپ ہی صغیر اسلم ہیں؟''

میں ان کی جانب پلٹا ''جی ہاں! میں صغیر اسلم ہوں۔''

انھوں نے کہا ''میں نے آپ کا کافی نام سنا ہے اور میں آپ کو عطیّہ دینا چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک چیک میرے حوالے کیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں جب میں نے چیک پہ لکھی رقم دیکھی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

''بیالیس ہزار ڈالرز ($42,000)۔''

میں نے خدا کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کیا۔

یہ مسٹر عبد الرؤف گجیانی تھے جو امریکی ریاست شکاگو (Chicago) میں رہتے تھے۔ آنے والے وقت نے صفی قریشی اور رؤف گجیانی کو میرا انتہائی قابل اعتماد دوست اور معاون بنا دیا۔ انھوں نے اس سکول کی تعمیر میں بھرپور تعاون کیا حالانکہ اس سے پہلے میں ان لوگوں کو جانتا تک نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوئے اور ہم لوگوں نے اس کام کو ممکن کر دکھایا جسے لوگ ناممکن سمجھ رہے تھے۔ صفی قریشی اور رؤف گجیانی نے اس منصوبے کے لئے فراخ دلی سے پیسہ لگایا۔ باقی سب لوگوں نے بھی بھرپور حصّہ لیا۔ ہم نے نہ صرف سکول کی نئی عمارت بنائی بلکہ وہ دو ایکڑ زمین بھی خرید لی جس پہ اپارٹمنٹ بننے جا رہے تھے۔ اس زمین پر بعد میں پارکنگ بنا دی گئی۔

میرا ایمان ہے کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرنا شروع کر دیں تو وہ ہمارا کام آسان بنا دیتا ہے بشرطیکہ نیّت صاف ہو۔

اورنج کریسنٹ

ہم نے 1980 کے اوائل میں اورنج کریسنٹ میگزین شروع کیا جو کہ محض چار صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ سادہ سا میگزین تھا اور اس کی پرنٹنگ میں رنگوں کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی پرنٹنگ وغیرہ پہ خرچ آتا تھا۔ تو اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے اس میں اشتہارات متعارف کرائے گئے۔ شروع کے کئی سال اس کے آدھے صفحے پر گولڈن نیڈل سٹور کا اشتہار چھپتا رہا جس کی آمدن کی وجہ سے یہ میگزین چلتا رہا۔ فروری 2003 تک یہ چھوٹا سا میگزین 48 صفحات کا ایک بہترین مجلہ بن گیا۔ اس کے 2003 کے ایک ایڈیشن کی تصویر، تصویر گیلری میں دی گئی ہے۔

مسلم پبلک افیئرز کونسل کا قیام(MPAC)

ہماری مسلم کمیونٹی میں متعدّد مسلمان ممالک کے باسی شامل تھے اور وہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلّق رکھتے تھے۔ ہم اکثر ایک جگہ اکٹھے ہو کر مسلم امّہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل پہ بات کرتے۔ ہم مسلمان امریکیوں کو درپیش مسائل پر بھی تفصیلی بحث و مباّحثہ کرتے عام طور پر ایسی ملاقاتیں بغیر کسی خاص نتیجے کے ختم ہو جاتی تھیں گویا نشستند، گفتند و برخاستند والا معاملہ ہوتا تھا۔

یہ بھی معمول کے مطابق ایسا ہی ایک موقع تھا۔ کمیونٹی کے تمام لوگ ہمارے گھر پر جمع تھے۔ بشریٰ بیگم نے سب کے لئے حلیم بنائی جو بے حد پسند کی گئی۔ اس مرتبہ بھی سب لوگوں کا ارادہ کھاپی کر رخصت ہونے کا تھا۔ ابھی ڈاکٹر مہر حطوت(Maher Hathout) نے دعا ختم ہی کی تھی کہ میں نے ہاتھ بلند کیا اور کہا!

”ڈاکٹر صاحب! ہم لوگ اکٹّھے ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، باتیں کرتے اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک عمل کا تعلّق ہے اس طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ آیئے آج ہم ایک قرارداد پاس کریں جس میں اپنا لائحہ عمل طے کریں۔ آج یہاں سے کچھ ایسا کر کے اٹھیں جو نظر آئے۔“

اس وقت سب اٹھنے کی تیاری میں تھے۔ ڈاکٹر مہر حطوت نے سب لوگوں سے درخواست کی کہ وہ ابھی تشریف رکھیں۔ انھوں نے سب لوگوں کو بتایا کہ اس وقت امریکی مسلمانوں کو ایک عملی تنظیم کی اشد ضرورت کیوں ہے.....؟ان کی بات سنتے ہی بڑے زور و شور سے بحث چھڑ گئی۔ آخر کار حتمی طور پر سب نے ایک قرارداد منظور کی جس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہمیں ایک ایسی تنظیم بنانی چاہیے جو امریکہ میں موجود مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد مسلم پبلک افیئرز کونسل (MPAC) کا قیام عمل میں آیا۔ آج کل امریکہ میں رہنے والا ہر مسلمان اس تنظیم کے

نام اور کام سے بخوبی واقف ہے۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ اس تنظیم کی بنیاد میرے گھر پر رکھی گئی۔

امریکن مسلم ریسورس گائیڈ

میں جب امریکہ گیا تو اس وقت وہاں مسلمان خال خال نظر آتے۔ اگر آپ کو مہینے میں ایک مسلمان مل جاتا تو یہ غنیمت ہوتی چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے سے تعلق رکھتا۔ 1960ء سے 1990ء تک کے تین عشروں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھی۔ معلومات تک آسان رسائی کی بدولت سچ اور جھوٹ میں تمیز سب کے لئے آسان ہو گئی۔ یوں امریکہ میں مسلم و غیر مسلم افراد کا رجحان دین اسلام کی جانب تیزی سے بڑھا۔ آج کل تمام امریکی ریاستوں میں لاتعداد اسلامی مراکز قائم ہو چکے ہیں (نائن الیون کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو اور اس کے مقاصد کیسے ہی خفیہ یا منفی ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد امریکی بہت تیزی سے اسلام میں داخل ہوئے)۔

1990ء کے عشرے تک مسلمانوں کی امریکہ میں موجودگی کے بارے کوئی ریکارڈ مرتّب نہیں کیا گیا تھا جس میں بتایا گیا ہو کہ پورے ملک میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے اور وہ کن علاقوں میں بستے ہیں؟ ان کے ہاں کتنی مساجد موجود ہیں اور ان کے امام اور نائب امام کون ہیں؟ ان کے کمیونٹی سنٹرز کہاں کہاں واقع اور ان کے عہدیدار کون کون ہیں؟ غرض مسلمانوں کے متعلق جامع معلومات اکٹھی کرنا اور ترتیب دینا لازم تھا تاکہ ضرورت پڑنے پہ ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ یہ ضروری کام سرانجام دینے کا بیڑا اسلامک ریسورس انسٹی ٹیوٹ نے اٹھایا۔

اسلامک ریسورس انسٹی ٹیوٹ
(Islamic Resource Institute)

امریکی قوانین کے مطابق ہم نے ایک نئی تنظیم رجسٹر کروائی جس کا نام اسلامک ریسورس انسٹی ٹیوٹ (Islamic Resource Institute) رکھا گیا۔ اس کا سربراہ ڈاکٹر احسان باگبی (Dr Ahsan Bagbi) کو نامزد کیا گیا۔ ہم نے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کے تعاون سے ایک ٹیم تیاّر کی۔ جس نے اخراجات کا تخمینہ تقریباً ایک ملین ڈالر ($1000000) لگایا۔ اس منصوبے پر اٹھنے والے اخراجات کا ایک بڑا حصّہ صفی قریشی نے اپنے ذمّہ لیا۔ اس کام کی زیادہ تر رہنمائی بھی صفی قریشی کی طرف سے سرانجام پائی۔ اس کے انتظام وانصرام کی ذمّہ داری مجھے نبھانا تھی۔

اسلامک ریسورس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈاکٹر احسان باگبی کی ذمّہ داری تھی کہ وہ ہر شہر کے مسلمانوں کے بارے میں مطلوبہ معلومات اکٹھی کریں۔ اس معاملے میں انھیں اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کا نیٹ ورک پورے شمالی امریکہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے عہدے دار انتہائی فعّال اور متحرک ہیں۔

ڈاکٹر احسان باگبی نے بڑی محنت سے کام کیا۔ انھوں نے جو مفید معلومات اکٹھی کیں ان کی روشنی میں ہم نے ایک انتہائی جامع رپورٹ تیار کی۔ اس مفصّل رپورٹ میں امریکہ میں موجود تمام مساجد کی تفصیلات، ان کے امام اور نائب امام، مسلم تنظیموں کی تفصیل، اسلامی سکول، ان کے پرنسپل، اساتذہ کے بارے میں معلومات کے علاوہ دیگر مسلمانوں کے بارے میں اعداد و شمار شامل تھے۔ اس کے علاوہ ہم نے ہر علاقے کی مسجد میں آنے والے تمام لوگوں کی تفصیلات بھی اس میں شامل کی تھیں کہ جمعہ پڑھنے کتنے لوگ آتے ہیں؟ اتوار والے دن منعقد ہونے والے پروگرام میں کتنے لوگ شرکت

کرتے ہیں؟ کتنے لوگ عید کے اجتماع میں شریک ہوتے ہیں؟ ان مساجد میں کس طرح کے پروگرام منعقد ہوتے ہیں..... وغیرہ وغیرہ۔

اس رپورٹ کی اہم تفصیلات مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھیں۔

فلاحی، عوامی اور سیاسی تنظیمیں

(1) قومی مسلم تنظیموں کی تفصیل
(2) بین الاقوامی مسائل پر نظر رکھنے والی قومی تنظیموں کی تفصیل
(3) مسلمانوں کے زیر اہتمام شائع ہونے والے میگزین اور کتابوں کی تفصیل
(4) عوامی و سیاسی تنظیموں کی تفصیل
(5) اپنے کام میں خصوصی مہارت رکھنے والی تنظیمیں
(6) علاقائی متّحدہ کونسل

جامع مساجد

مختلف ریاستوں میں واقع مساجد کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں۔

مسلمانوں کے مختلف اعداد و شمار

(1) کسی بھی ریاست میں مساجد کی کل تعداد
(2) نماز جمعہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کی کل تعداد
(3) نماز جمعہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کی اوسط تعداد
(4) نماز جمعہ میں مسلمانوں کی شرکت کی تعداد سے مختلف ریاستوں کی درجہ بندی
(5) مختلف ریاستوں میں مساجد کی تعمیر کی شرح
(6) مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی اپنے ملکوں سے ہجرت کی شرح
(7) مختلف ریاستوں میں موجود مسلمانوں کی ان کے آبائی علاقوں کے حساب سے

درجہ بندی

اس کے علاوہ مسلمانوں کی امریکہ آمد اور ان کی مختلف سیاسی، سماجی تنظیموں کی مختصر تاریخ بیان کی گئی تھی جب کہ کتاب کے آخر میں اسلامی عقائد و نظریات پہ مختصر روشنی ڈالی گئی تھی۔

اس کتابچے کو ''مسلم ریسورس گائیڈ'' کا نام دیا گیا اور اس پر نظر ثانی ڈاکٹر مزّمل صدیقی صاحب نے کی کیونکہ وہ ان تمام علاقوں میں لیکچر دینے جاتے رہتے تھے اور ان علاقوں کے بارے میں ان کی معلومات قابل رشک تھیں۔ ہمیں یہ کتابچہ مکمّل کرنے میں دو سال کا عرصہ لگا مگر اس کے بعد امریکہ کی کسی بھی مسجد، سکول یا تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا۔

ابلاغ عامہ کا رہنما کتابچہ

ڈاکٹر احسان باگی نے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے لئے ایک مکمّل ''میڈیا گائیڈ'' بھی تیار کی۔ جس میں مسلمانوں کے بارے میں بنیادی معلومات کے علاوہ ہر علاقے میں رابطہ کار مہیا کئے گئے تھے۔ اس میں مسلمانوں اور اسلامی مراکز کے بارے بھی تفصیلی معلومات موجود تھیں۔ اس میڈیا گائیڈ کی تیاری پر جو اخراجات آئے وہ صفی قریشی نے ادا کئے۔ صفی قریشی نے اس رہنما کتابچے کو ترتیب دینے میں بھی حتّی المقدور ہاتھ بٹایا۔

چاند نظر آنے نہ آنے کے تنازع کا مستقل حل

پاکستان کی طرح امریکہ میں بھی چاند نظر آنے اور نہ آنے کا مسئلہ زوروں پہ رہتا تھا۔ رمضان المبارک اور عیدین کے موقع پر سب لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ امریکی مسلمان اپنی آئندہ کی مصروفیات کو پہلے سے طے نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں

رمضان المبارک یا عید سے ایک روز پہلے تک انتظار کرنا پڑتا۔ یہ صورت حال مجھ سمیت تمام امریکی مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ تھی۔ ہم سب لوگ بہت مصروف رہتے تھے اور ہماری مصروفیات مہینوں پہلے سے طے شدہ ہوتی تھیں۔ رمضان المبارک اور عید کا دن معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ گومگو کا شکار رہتے اور اپنی آئندہ مصروفیات طے نہ کر پاتے۔ ہم لوگوں نے اس کا مستقل حل نکالنے کے لئے غور وفکر کرنا شروع کیا۔ شبّیر منصوری نے یہ خیال پیش کیا کہ ہم لوگ ایسا کیلنڈر بنا سکتے ہیں جس میں چاند کی درست تاریخوں کی پیش گوئی کی گئی ہو۔ صفی قریشی نے اس منصوبے کی مالی مدد کی۔ اس کی ذمّہ داری بھی ڈاکٹر احسان باگبی کے سپرد کی گئی۔

ڈاکٹر احسان باگبی نے اس اہم ترین کام کے لئے بے حد محنت کی۔ ظاہر ہے یہ آسان کام نہ تھا اور حسّاس نوعیت رکھتا تھا۔ انھوں نے مختلف مسلمان علماء، سائنس دانوں (astrologists) اور کاروباری افراد سے ملاقاتیں کیں۔ انھیں متعدّد مرتبہ ایک جگہ بغرض مشاورت اکٹھا کیا۔ بالآخر سب لوگوں کی کوشش رنگ لائی۔ انھوں نے مل کر ایسا کیلنڈر بنا لیا جس میں رمضان اور عید کا چاند نظر آنے کی درست تاریخیں متعیّن کی گئی تھیں۔ تمام لوگ ان پہ متفق تھے۔ صرف چند لوگوں نے ان پڑھ ہونے کی بنیاد پر اس کیلنڈر کو اعتراض کا نشانہ بنایا۔ ان کے خیال میں یہ "بدعت" تھی۔ وہ مروّجہ طریقے سے ہٹ کر کوئی بات سوچنے کو تیار نہ تھے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں

(علامّہ اقبالؒ)

کونسل آن اسلامک ایجوکیشن

کونسل آن اسلامک ایجوکیشن (Council on Islamic Education)

جس کا نیا نام انسٹیٹیوٹ آف ریلیجیس اینڈ سوک ویلیوز(Institute on Religious and Civic Values) ہے، نے اسلام اور مسلمانوں کی لازوال خدمت کی ہے۔

نوّے کی دہائی سے قبل امریکی تعلیمی نصاب میں اسلام کا تعارف محض دو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس تعارف میں ایک اونٹ اور اس کے ساتھ ایک شخص کو ریت پہ اپنا ماتھا ٹیکتے دکھایا گیا تھا۔ امریکیوں کے نزدیک بس یہی اسلام اور اس کا تعارف تھا۔

ایک مرتبہ شبیر منصوری پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹی ایک امریکی سکول میں پڑھتی ہے۔ امریکی نصاب میں اسلام کے متعلق جو بتایا گیا ہے وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔ اس سے امریکہ میں پڑھنے والے تمام مسلمان بچے اسلام سے درست طور پہ واقف نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اسے ٹھیک کرنے کے لئے کچھ کرنا ہو گا۔ میں نے شبیر منصوری سے پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی لائحہ عمل ہے یا نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بالکل ہے۔ میں نے کہا! ''شبیر بھائی! آپ آگے بڑھیں اور اس پر کام کا آغاز کریں۔ اخراجات کی فکر نہ کریں، ان کا بندوبست ہو جائے گا۔

شبیر منصوری نے خود کو اس اہم کام کے لئے وقف کر دیا۔ اس منصوبے پر اخراجات کا بڑا حصّہ صفی قریشی اور میں نے اپنے ذمّہ لیا۔ شبیر منصوری نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر امریکی تعلیمی نصاب کے لئے اسلام کا تفصیلی تعارف تیار کیا جس میں اسلام کی شاندار تاریخ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ شبیر منصوری نے امریکہ کی پالیسی بنانے والے افراد، تعلیمی نصاب تیار کرنے کے ماہرین، علماء اور محققین سے اس معاملے پر بے شمار ملاقاتیں کیں اور ان سے مل کر امریکی تعلیمی نصاب میں اسلام کا مفصّل تعارف شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ شبیر منصوری صاحب کا یہ کارنامہ تاریخی ہے اور امریکی مسلمانوں میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ تفصیلی معلومات تنظیم کی ویب سائٹ پہ دیکھی جا سکتی ہیں: www.ircv.org

رضاکارانہ کام کے بارے میرا فلسفہ

عام طور پر جن لوگوں کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو وہ بطور رضاکار کام کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ضرور ہوتے ہیں جو خلوص نیت سے کام کرنا چاہتے ہیں مگر زیادہ تر لوگ یہ کام محض شغل کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ دکھاوے کی خاطر یہ کام کیا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں ہر کام پوری ذمّہ داری اور بہترین طریقے سے سرانجام دینا چاہئے۔ اگر کوئی ذمّہ داری ہمارے سپرد کی جاتی ہے تو محض اس عہدے کا لطف اٹھانے کے بجائے اس مقصد پر نظر رکھنی چاہیے جس کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ ذمّہ داری ایسی چیز ہے جس کے بارے قیامت کے دن ہم سے پوچھا جائے گا۔ اس لئے ہمیں اس بارے محتاط رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔

رضاکارانہ کام کے بارے میں میرا اپنا ایک نظریہ اور طریقۂ کار ہے۔ جب مجھے کوئی رضاکارانہ کام سونپا جاتا ہے تو میں اس کو پوری ذمّہ داری اور سنجیدگی سے سرانجام دیتا ہوں۔ میں نے اس بارے کچھ اصول وضوابط وضع کر رکھے ہیں جو بعض لوگوں کے نزدیک بہت سخت ہیں۔ وہ لوگ شاید نہیں جانتے کہ میری بیگم اور بیٹیوں نے بھی اپنے اصول وضع کئے ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ سخت ہیں اور یہ انھوں نے خود سے بنا رکھے ہیں ایس اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔

میں نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی میں مختلف عہدوں پر کام کیا ہے۔ میں اس سوسائٹی کے بانیوں میں سے ایک تھا اس کے علاوہ میں نے چیئرمین، سیکرٹری، خزانچی اور دیگر عہدوں پر بھی کام کیا ہے۔ 1993ء سے 1995ء کے دوران مجھے اس سوسائٹی کی صدارت کا عہدہ دیا گیا۔ میں نے جیسے ہی یہ عظیم ذِمّہ داری سنبھالی تو پینتیس (35) صفحات پر مشتمل ایک ایکشن پلان تیار کیا (ایکشن پلان کی تصویر گیلری

میں موجود ہے) اور اسے اپنی پہلی میٹنگ میں ممبران کے سامنے پیش کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں اس پلان میں موجود سارے کام اپنے عہدۂ صدارت کے دوران پورے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اگر کسی کو میرے ان تمام منصوبوں پر کوئی اعتراض ہے تو وہ بتا دے۔ سب نے متفقہ طور پر اس پلان کی منظوری دے دی۔

میں ہر مہینے کے پہلے اتوار کو تمام ممبران کی میٹنگ طلب کرتا اور ان کے سامنے پورے مہینے کی رپورٹ پیش کرتا۔ میں ان کی تجاویز اور آرا کو پوری پوری اہمیت دیتا۔ میں نے اپنی ذاتی سیکرٹری (جسے میں اپنی جیب سے تنخواہ دیتا تھا) کو اپنے کاروباری امور سے ہٹا کر سوسائٹی کے کام پر لگا دیا۔ اس کا پورے دن کا ستّر سے پچاّسی فیصد وقت سوسائٹی کے کام کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں اپنے منصوبے مقررہ وقت میں مکمل کرلوں۔ میرے عہدۂ صدارت کی مدّت دو سال تھی۔

ابھی دو سال پورے نہ گزرے تھے کہ میں نے ممبران کے سامنے دوبارہ ”ایکشن پلان“ کی ایک کاپی رکھی اور کہا کہ یہ میرا پلان تھا، اس کے ساتھ میں نے اکیّس صفحات پر مشتمل ایک اور فائل پیش کی جس کا نام تھا ”کمیونٹی اچیومنٹ“ (Community Achievement)۔ میں نے تمام لوگوں کو بتایا کہ میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ اللہ کی رحمت سے پورا کر چکا ہوں۔ جو منصوبے میں نے شروع کئے تھے وہ سب کے سب پورے ہو چکے ہیں۔ اب میں اپنے موجودہ عہدے سے استعفٰی دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ نئے صدر کا انتخاب کریں جو ہماری کمیونٹی کے مفاد میں کام کرے۔

تمام لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ نے اتنا اچھا کام کیا ہے آپ اسے جاری رکھیں اور کم از کم ایک اور صدارت کی مدّت پوری کریں مگر میں نے بڑے ادب کے ساتھ سب کا شکریہ ادا کیا اور معذرت چاہی۔ میں نے کہا کہ اب میں کسی اور کو موقع دینا چاہتا ہوں۔

میں کسی بھی عہدے کو ایک بھاری ذمّہ داری سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ہم سے بروز قیامت اس بارے پوچھا جائے گا۔ اس لئے میں نے اپنا کام مکمّل ہونے کے فوری بعد اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

جن تنظیموں کی ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد کی

مندرجہ ذیل تنظیموں میں سے کسی کا میں بانی ہوں، کسی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل رہا یا کسی کے لئے رقم عطیہ کی یا عطیات اکٹھے کرنے میں مدد کی۔

1. Council on American - Islamic Relations (CAIR)
2. Council on Islamic Education (CIE)
3. Ilm Foundation (Los Angeles)
4. Indian Muslim Relief Committee (IMRC)
5. Indo Chinese Muslim Association
6. Islamic Circle of North America (ICNA)
7. Islamic Information Service
8. Islamic Relief
9. Islamic Shura Council of South California
10. Islamic Society of North America (ISNA)
11. Muslim Mortuary and Cemetery Committee (MMCC)
12. Muslim Public Affairs Council (MPAC)
13. Muslim Student Network
14. Alshiffa Free Clinic
15. University of Muslim Medical Association Community Clinic (UMMA)
16. Bilal Islamic Centre (Los Angeles, CA)
17. Islamic Centre of Irvine
18. Islamic Society of Orange County
19. Islamic Education Centre of Orange County
20. Islamic Centre of Claremont
21. Islamic Centre of Cypress
22. Islamic Centre of Northridge (CA)

23. Islamic Centre of San Gabriel (CA)
24. Islamic Centre of South California
25. Islamic Education Centre (Walnut, CA)
26. Islamic Society of Corona/Norco (Coronet, CA)
27. King Fahad Mosque (Culver City, CA)
28. Masjid Abdullah (Los Angeles)
29. Masjid Al-Sharif (Long Beach, CA)
30. Masjid Omar Ibn Al-Khattab (Los Angeles, CA)
31. Momin Lodge (Torrance, CA)
32. The Mosque of Riverside (Riverside, CA)
33. Universal Heritage Foundation

ISLAMIC SCHOOLS

1. California Science Academy
2. New Horizon School (Los Angeles, CA)
3. Orange Crescent School (Garden Grove)
4. New Horizon School. (Irvine, CA)

OTHER ORGANIZATIONS

1. Feed the Children
2. Easter Scale
3. American Red Cross
4. American Institute for Cancer Research
5. March of Dims
6. Paralyzed Veterans of America
7. National Glaucoma Research
8. City of Hope Cancer Centre
9. Braille Institute
10. Alzeimer's Association
11. Goodwill Institute of Orange County
12. Union Rescue Mission
13. Orange County Area Cancer Drive
14. Make a Wish Foundation
15. Orange County Rescue Mission
16. U.S Fund of UNICEF

ایسافاؤنڈیشن

(Aisha Syma Aslam Family Foundation-ASA)

ہم نے خدمت خلق کے لئے یہ فیملی فاؤنڈیشن رجسٹر کرائی۔ اس کے تحت گزشتہ سالوں میں ہم نے خدمت خلق کے مندرجہ ذیل کام کئے جس کے صلے میں خدا نے ہمیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازا۔

1۔ یونین ریسکیو مشن آف لاس اینجلس(Union Rescue Mission of Los Anglas) نامی تنظیم جو بالخصوص خواتین کو مشکل حالات میں مدد فراہم کرتی ہے، کو عطیّات دے کران کی خدمات میں حصّہ لیا۔

2۔ امریکی شہر اوکلوہاما(Oclohama) میں ہونے والے بم دھماکوں کے نتیجے میں ایک سو اڑسٹھ(168) جانوں کے ضیاع کا واقعہ اپریل1995ء میں پیش آیا۔ ایسافاؤنڈیشن نے دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کران کی مدد کی۔

3۔ کوسوو میں جنم لینے والے عظیم المیے اور اس کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے متاثرین کی امداد کیلئے متعدد اشیائے ضرورت کوسوو بھجوائیں۔

4۔ چیچنیا اور بوسنیا کے لوگوں کے لئے امدادی سامان روانہ کیا۔

5۔ ایسافاؤنڈیشن(ASA) نے فیڈ دی چلڈرن(Feed the Children) نامی تنظیم کو عطیّات فراہم کئے۔ یہ تنظیم ضرورت مند امریکی بچّوں میں کھانا تقسیم کرتی ہے۔

6۔ ایسافاؤنڈیشن(ASA) نے چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس (The Church of Jesus Christ of Later Day Saints) کے تعاون سے عراق جنگ کے متاثّرین کو امداد روانہ کی۔

7۔ امّہ کلینک کو ایسافاؤنڈیشن کے ذریعے ہر ممکن امداد فراہم کی گئی۔

8۔ ایسا فاؤنڈیشن نے الشفاء فری کلینک کی طبی خدمات کو سراہتے ہوئے اس کی خدمات میں اپنا حصہ ڈالا۔

9۔ کیلی فورنیا سائنس اکیڈمی (CSA) ایک اسلامی ہائی سکول ہے جو مسلم اور غیر مسلم طلباء میں تعلیم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ وہ اسلامی ماحول کے متلاشی طلباء کے لئے ایک نمایاں ہائی سکول کے طور پہ سامنے آئے۔ ایسا فاؤنڈیشن کیلی فورنیا سائنس اکیڈمی (CSA) کی ان کوششوں میں اس کے ہم رکاب رہی ہے۔

10۔ مسلم سٹوڈنٹس نیٹ ورک (MSN) سمر انٹرن شپ (Summer Internship) کی سہولت دینے والی نوجوانوں کی ایک نمائندہ تنظیم ہے جو 1993 میں قائم کی گئی تھی۔ ایسا فاؤنڈیشن نے اس تنظیم کے قیام کے پہلے ہی دن سے اس کی مالی مدد کرنا شروع کی۔

صبا ٹرسٹ

صبا ٹرسٹ میں ''صبا'' ایک ایسا لفظ ہے جس کے بارے میں اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ''صبا'' کون ہے۔ میں آپ لوگوں پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ''صبا'' نہ تو میری بیوی کا نام ہے اور نہ میری کسی بیٹی کا..... گو اس میں اتفاقی طور پر ہم میاں بیوی اور دونوں بیٹیاں صائمہ، عائشہ سب کے ناموں کے ابتدائی حروف موجود ہیں مگر نام ہمارے خاندان کے کسی فرد کے بجائے ایک کمیٹی نے منتخب کیا۔

صبا کا مطلب ہے ''تازہ ہوا'' (Fresh Air) ۔ اس وقت یہ نام تجویز کرنے والے کے ذہن میں اس کا یہی مطلب تھا۔ عام طور پر ایک دوسرا سوال بھی پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو انسانیت کی خدمت کا کام شروع کرنے کا خیال کیسے آیا؟ اس کا جواب دینا بڑا ضروری ہے۔

1965ء کے زمانے میں حج کی غرض سے سعودی عرب پہنچا تو وہاں جا کے سخت بیمار ہو گیا۔ بیمار کیسے ہوا یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ گویا کہانی میں ایک اور کہانی..... مگر فکر نہ کریں یہ طوطا کہانی نہ ہو گی۔

سعودی عرب میں میری ملاقات شکاگو (Chicago) سے آئے ایک لڑکے سے ہوئی جس کا نام محمد علی تھا۔ جلد ہی ہم دونوں دوست بن گئے۔ حج کے دوران جب ہم منیٰ پہنچے تو اپنے معلّم سے بچھڑ گئے۔ ہم نے انھیں بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملے۔ اب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہماری تمام جمع پونجی ہمارے معلّم کے پاس تھی اور ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ آج کل کی طرح اس وقت جگہ جگہ کھانے پینے کی سہولیات نہ تھیں۔ ہم منیٰ سے عرفات گئے۔ عرفات پورا دن رہے۔ وہاں سے رات کو مزدلفہ پہنچے، اس کے بعد واپس منیٰ آئے۔ اس تمام سفر میں نہ تو ہمارے پاس کھانا تھا اور نہ ہی پانی۔ سر ڈھانپنے کو چھتری بھی نہ تھی۔ گرمی بے حد شدید تھی۔ ایک دو مرتبہ ہم نے حاجیوں کے خیمے میں

پناہ کی غرض سے گھسنے کی کوشش کی مگر انھوں نے ہمیں وہاں سے نکال دیا۔ شدید گرمی، بھوک پیاس اور جسم سے اضافی پانی خرچ ہو جانے کی وجہ سے ہم دونوں شدید بیمار ہو گئے۔ اسی بیماری کے عالم میں ہم اپنے اپنے وطن واپس لوٹے۔

جب میں بیماری کی حالت میں پاکستان لوٹا تو مجھے ایک سرکاری ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ ہسپتال میں جلد ہی مشہور ہو گیا کہ میں امریکہ سے آیا ہوں، پڑھا لکھا اور امیر آدمی ہوں۔ ہسپتال کے عملے نے میرا خصوصی خیال رکھا۔ وہ میرے ساتھ عزّت سے پیش آتے تھے۔ وقت پر دوا دیتے اور میری ہر ضرورت پوری کرتے جب کہ میرے ساتھ دیگر مریضوں کی حالت قابل رحم تھی۔ ہسپتال کا عملہ مریضوں کے علاج اور دیکھ بھال میں دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اگر مریض کے لواحقین احتجاج کرتے تو انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیا جاتا۔ میں یہ مناظر دیکھتا رہا مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں خود بیمار تھا اور کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔

جب اللہ پاک نے مجھے صحت دی تو میں نے اس کا شکر ادا کیا۔ اب میں گھر واپس جا سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے دوا اور ہدایات وصول کیں اور باہر کی جانب بڑھا۔ میں جب مریضوں کی انتظار گاہ میں پہنچا تو دیکھا کھوے سے کھوّا چھلتا ہے۔ مریض اور ان کے لواحقین سے ہال بھرا ہوا تھا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جب میرا دل قطرہ قطرہ موم بنا..... میں حال سے بے حال ہوا.....۔

ایک جانب ایک بچی بخار سے کانپے جاتی..... ماں اسے دلاسہ دیتی..... ماں کو دلاسہ دینے والا کوئی نہ تھا..... بچی کانپے جاتی اور ماں روئے جاتی..... ایک طرف ایک بابا جی درد سے بے حال پڑے تھے..... وہ رحم طلب نظروں سے ہر کسی کو دیکھتے..... انھیں لگتا مسیحا آیا ہے..... ایک بچّہ مسلسل روتا تھا..... اسے کہیں درد تھا..... چونکہ درد اسے تھا..... کسی اور کو نہ تھا..... لہٰذا عملہ اور ڈاکٹر شانت گھومتے پھرتے تھے..... پوچھنے پر کہا

جانے والی نظریں اور ڈانٹ ڈپٹ..... غریب اور لاچار مریض سہم جاتے.....انھیں علاج جو کرانا تھا.....یہ انسانیت کی تذلیل تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرا دل قطرہ قطرہ پگھلا.....۔

میں نے ایسے مریضوں کے لئے ایک فری ڈسپنسری کا منصوبہ بنایا جہاں نہ صرف بروقت علاج کیا جاسکے بلکہ مریض کی عزّت نفس کا خیال بھی رکھا جائے۔

یہ میڈیکل کلینک 1965ء میں بنایا گیا۔ جہاں ضرورت مند اور مستحق افراد کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ ضروری ان کی عزّت نفس کا تحفّظ تھا۔ میں نے کلینک پر موجود اپنے عملے کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ غریب سے غریب مریض کے ساتھ بھی ایسا رویّہ اختیار کرنا ہے کہ جیسے وہ اپنے علاقے کا چوہدری یا وڈیرا ہے۔

میں نے کئی مرتبہ مریضوں کے روپ میں اپنے بھروسے کے لوگ بھیجے تاکہ وہ پتہ کریں کہ میری ہدایات پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں نے کلینک کے عملے کو بھی آگاہ کر رکھا تھا کہ مریضوں کے ساتھ ان کے برتاؤ کا جائزہ لینے کے لئے میں نے کچھ افراد کا خفیہ تقرر کیا ہوا ہے اس لئے عام طور پر کلینک کا عملہ محتاط رہتا اور پوری کوشش کرتا کہ مریضوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا جائے۔

خدمات کا تعارف

فلاحی وامدادی خدمات

پچھلے 52سال (1965ء سے2017ء تک) میں صابٹرسٹ نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے دستیاب وسائل سے ہر کسی کی خدمت کی۔ اس میں کسی رنگ، نسل، زبان یا قومیت کا فرق نہ رکھا گیا۔ دنیا کے کسی حصّے میں آنے والی قدرتی آفت کے موقع پر صابٹرسٹ کا مختصر عملہ فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ متاثّرہ علاقے میں کپڑے، ادویات، خوراک اور دیگر ضروری اشیاء بھجواتا ہے۔

- ☆ سونامی طوفان جس میں دو لاکھ سے زائد افراد لقمۂ اجل بنے، صابٹرسٹ نے خوراک، لباس، ادویات اور خیمے متاثّرین تک پہنچائے۔
- ☆ بام (ایران) میں متاثّرین زلزلہ تک تین کنٹینر جن میں کپڑے، کمبل، جوتے، ادویات اور دوسرا طبّی سامان موجود تھا، اپنا فرض سمجھ کے پہنچائے۔
- ☆ انڈیا(2003ء) میں ہونے والے مسلم کش فسادات میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا۔ اس میں صابٹرسٹ نے بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ مل کر متاثّرین کی ہر ممکن مدد کی۔
- ☆ صابٹرسٹ نے افغان جنگ کے متاثرین کی مدد کی اور ان کو پانچ بڑے کنٹینرز وہیل چیئرز (Wheel Chair) کے بھجوائے۔ اس کے علاوہ دوسری ضروریات زندگی مہیا کیں۔
- ☆ صابٹرسٹ نے عراق جنگ(2003ء) کے متاثّرین کو چرچ آف ایل۔ ڈی۔ ایس جیسی نامور تنظیموں کے ساتھ مل کر ادویات، خوراک، کپڑے، کمبل

وغیرہ پہنچائے۔

☆ جولائی 2001ء میں راولپنڈی، اسلام آباد میں ہونے والی طوفانی بارشوں نے تباہی مچادی۔ خاص طور پر نالہ لئی میں طغیانی آنے سے نالے کے آس پاس کی آبادیاں بری طرح متاثّر ہوئیں۔ صباٹرسٹ نے مصیبت کی اس گھڑی میں متاثرین کو ہر ممکن طریقے سے مدد دی اور ان تک ریلیف کا ضروری سامان پہنچایا۔

☆ گجرات (انڈیا) میں آنے والے زلزلے کے متاثّرین کو صباٹرسٹ نے امداد روانہ کی۔

☆ صباٹرسٹ باقاعدہ ایک نظام کے تحت امریکہ سے ہر سال کپڑوں (مردانہ، زنانہ اور بچگانہ) کا حصول اور پاکستان میں ان کی بلا تخصیص تقسیم یقینی بناتا ہے۔ اب تک تقریباً ڈھائی کروڑ سے زائد اشیاء تقسیم کر چکا ہے۔ جس میں مردوں، عورتوں اور بچّوں کے کپڑوں کے علاوہ جوتے، گرم سویٹر، کمبل اور لحاف شامل ہیں۔

☆ صباٹرسٹ اب تک لاکھوں روپے مالیت کی نئی جیکٹس، ٹی شرٹس، جرسیاں، بچّوں کے کپڑے اور تحائف عطیّہ کر چکا ہے۔

☆ صباٹرسٹ ایک ہزار سے زائد جوڑوں کو شادی کے سلسلہ میں مالی معاونت فراہم کر چکا ہے۔ کئی غریب اور بے آسرا لڑکیوں کے جہیز کا بندوبست کیا گیا ہے۔

☆ صباٹرسٹ بیواؤں اور یتیموں کیلئے عطیّات اکٹھا کرنے اور تقسیم کرنے کے لئے پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔

☆ ہیومن رائٹس نیٹ ورک (Human Rights Network) اور صباٹرسٹ

مل کر قیدیوں کو کپڑوں اور خوراک کے علاوہ قانونی مدد فراہم کرتے رہے۔

☆ کمالیہ میں رمضان المبارک میں ہزاروں افراد کے لئے سحر و افطار کا بندوبست کیا گیا۔

☆ صبا ٹرسٹ ہیڈ آفس میں رمضان المبارک کے موقع پر خصوصی افطاری کا اہتمام کرتا ہے جس سے ہزاروں لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

☆ صبا ٹرسٹ پاکستان میں ہزاروں ویل چیئرز ضرورت منداور نادار مریضوں میں تقسیم کر چکا ہے۔ بیرون ممالک مثلاً افغانستان، عراق وغیرہ بھیجی گئی وہیل چیئرز اس کے علاوہ ہیں۔

نوٹ: مندرجہ بالا اشیاء پچھلی نصف صدی کے دوران تقسیم کی گئیں۔ اس میں ایک خاندان میں کئی اشیاء کی تقسیم شامل ہے۔ جہیز میں دی گئی اشیاء بھی شامل ہیں۔ جس میں واحد دلہن کو دیئے گئے لاتعداد ملبوسات، جوتے اور دیگر سامان بھی شامل ہیں۔

1965 سے لے کر 2017 تک باون (52) سال میں تقسیم کئے گئے سامان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

سامان	مقدار اور مالیت
دلہن کے جہیز کے کپڑے	950,000
خواتین کے کپڑے	16,00,000
مردوں کے کپڑے	7,500,000
خواتین کے موزے اور جوتے	7,900,000
مردوں کے موزے اور جوتے	1,600,000
بچّوں کے کپڑے	24,000,000

کھلونے اور کتابیں	3,870,000
کمبل اور لحاف	10,600,000
خواتین کے پرس	3,590,000
کوٹ	4,100,000
جرسیاں، سکارف اور ٹی شرٹ	12,000,000
شرٹ، ٹوپیاں اور جیکٹ	11,090,000
متّفرق اشیاء	25,000,000

پاکستان میں آنے والا بدترین زلزلہ 2005ء

یہ زلزلہ پاکستان میں آنے والی بدترین قدرتی آفت تھی۔ اس میں 74,698 سے زائد اموات ہوئیں۔ شدید زخمی افراد کی تعداد 1,38,000 کے قریب تھی۔ کل متاثرہ افراد کی تعداد 35,000,00 سے زائد تھی۔

صباٹرسٹ نے آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں آنے والے تباہ کن زلزلے کے متاثّرین کیلئے امدادی سامان مثلاً ادویات، خوراک، کمبل اور کپڑوں کی فراہمی تواتر کے ساتھ جاری رکھی۔ انفرادی طور پر اور دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے پر ریلیف پروگرام ترتیب دیئے۔ صباٹرسٹ کے امدادی کارکن سامان کے ٹرک لے کر دوسرے ہی دن پہنچ گئے تھے۔ ہماری ٹیم نے دوردراز علاقوں میں کام کیا۔ میں خود اس ٹیم کا حصہ تھا۔ ہم صبح سویرے روزہ رکھ اپنے مشن پہ روانہ ہوتے اور رات دیر تک متاثرہ علاقے کے لوگوں کی مدد کرتے ان علاقوں میں بفّہ، کلہاڑے، گلی باغ، اور مانسہرہ کے آس پاس واقع تقریباً پچھتّر گاؤں شامل ہیں۔

نیٹ لیشمین(Nate Leishman) ،دی چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس کے نمائندے ہیں جو امریکہ سے پہنچے۔ ان کے ساتھ 747 بوئنگ جہاز تھا جوزلزلہ متاثرین کے لئے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سامان صبا ٹرسٹ کے تعاون سے زلزلہ متاثرین میں تقسیم کیا گیا۔

متاثرین میں مندرجہ ذیل کھانے اور مشروبات تقسیم کئے گئے۔

نمبر شمار	تقسیم کردہ سامان	نمبر شمار	تقسیم کردہ سامان
1	لیموں کا شربت	2	مالٹے کا جوس
3	پائن ایپل کا جوس	4	سیب کا جوس
5	متفرق پھلوں کا جوس	6	چاکلیٹ دودھ
7	کیلا	8	خشک آڑو
9	خشک ناشپاتی	10	خشک بلیو بیریز
11	ڈبے میں بند گاجریں	12	بادام
13	نمکین بسکٹ	14	نوڈلز(سویاں)
15	ڈبے میں بند مکئی	16	لونا فائبر بارز
17	ڈبے میں بند مرچ	18	دالیں
19	چائے	20	آملیٹ
21	پنیر	22	گوشت
23	ڈبے میں بند مرغی کا گوشت	24	غیر مسلم بھائیوں کے لئے ڈبے میں بند ٹرکی(Turkey)
25	آلو کی ٹکیاں	26	کرسپی بسکٹ

مندرجہ ذیل علاقوں میں زلزلہ متاثرین کی خدمت کی گئی

نمبر شمار	علاقہ	نمبر شمار	علاقہ
1	گل میرا۔1	2	گل میرا۔2
3	حسن بیگ	4	گھورنا
5	غنال	6	ہساری
7	محمد فیض پور	8	بوئی
9	نوگران	10	بھونجیا
11	گل باغ	12	بٹال
13	سگھدار	14	شریف آباد
15	سلونا	16	مانسہرہ
17	چتر پلین	18	کھیتر
19	باغ	20	ملک پور
21	چوندری	22	تیمری
23	کشمیر	24	سری کوٹ
25	لنڈا	26	جاباملک پور
27	ڈبا۔1	28	ڈبا۔2
29	شنکیاری	30	بتوڑا
31	مہاندری	32	جبی
33	مرادپور	34	غلام پور
35	بفہ	36	کلہاڑے

سیلاب 2010ء

اس سیلاب میں پاکستان کے کل رقبے کا پانچواں حصّہ سیلابی پانی سے متاثر ہوا۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑا سیلاب تھا جس نے پاکستان کے چاروں صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اس دوران بیس لاکھ کے قریب لوگ متاثّر ہوئے۔ زیادہ تر گھروں، فصلوں اور دیگر تعمیرات کو شدید نقصان پہنچا۔ 2000ء کے قریب لوگ اس سیلاب کی نذر ہوئے۔ ان گنت مویشی ہلاک ہوئے۔ بنیادی طور پر سیلاب نے مالی لحاظ سے بے انتہا نقصان پہنچایا۔

صبا ٹرسٹ نے 2010ء میں آنے والے اس بدترین سیلاب میں متاثّرین کی ہر ممکن مدد کی۔ امدادی سرگرمیوں کا آغاز اپنے قریبی علاقوں سے کیا۔ بارش ابھی جاری تھی کہ ہماری ٹیم کپڑے اور خوراک لے کر نوشہرہ پہنچی۔ راستے میں بارش اور سیلاب کا یہ عالم تھا کہ سڑک کے اطراف پانی ہی پانی تھا۔ یوں لگتا جیسے پانی میں سڑک اگ آئی ہو۔ کئی جگہوں سے سڑک پانی میں مکمل غائب تھی۔ بارش کی چادر ہر طرف تنی ہوئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے آس پاس سمندر ہو۔ اس ٹیم کی سربراہی میں نے خود کی تھی۔

اس دوران مندرجہ ذیل علاقوں میں متاثرین کی مدد کی گئی۔

نوشہرہ			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	گنڈیری پایاں	2	خٹکلے
3	اسماعیل آباد	4	میٹھا خیل
5	بارابانڈہ	6	دیگر

چارسدہ			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	دلدار گڑھی	2	امیر آباد
3	دین بار	4	دیگر

دیگر علاقے			
نمبر شمار	علاقہ	نمبر شمار	علاقہ
1	میاں والی	2	مردان

مندرجہ ذیل سامان تقسیم کیا گیا

نمبر شمار	تفصیل سامان	نمبر شمار	تفصیل سامان
1	کھانا	2	خشک راشن
3	کپڑے	4	گرم کمبل
5	ادویات	6	عید پہ مٹھائی
7	نقدی	8	دیگر

میڈیکل کیمپ

سیلاب کے بعد متاثرین میں بیماریاں پھیل گئیں جن میں سرفہرست جلدی بیماریاں تھیں۔ صباٹرسٹ نے ماہر امراض جلد اور دیگرڈاکٹروں کے ہمراہ نوشہرہ کے علاقے میں میڈیکل کیمپ لگایا۔ جس میں مریضوں کا مفت چیک اپ اور ادویات دی گئیں۔

سوا ارب روپے کی ادویّات کی تقسیم

صباٹرسٹ نے دیگر غیر ملکی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر سوا ارب روپے مالیت کی ادویّات سیلاب متاثرین میں تقسیم کیں۔ ان ادویّات میں جراثیم کش اور ڈپریشن دور کرنے کی ادویّات شامل تھیں۔ اس منصوبے کے لئے تجربہ کار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے ان ادویّات کی تقسیم کا پورا منصوبہ بنایا۔ ان ادویات کو پاکستان کے چاروں صوبوں کے علاوہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں تقسیم کیا گیا۔ ان ادویات کی تقسیم میں میرٹ کی انتہائی سختی سے پابندی کی گئی۔

متاثرین بحالی منصوبہ

مویشی فراہمی پروگرام

صباٹرسٹ نے متاثرہ غریب خاندانوں کی معیشت بحال کرنے کی غرض سے انھیں بکریاں اور گائیں لے کر دیں تاکہ وہ ان کا دودھ بیچ کر اپنے گھر کا خرچ چلا سکیں۔ اس کے لئے منتخب خاندانوں کو کڑی تحقیق کے بعد مویشی فراہم کئے گئے۔ کچھ ایسی بیوہ خواتین بھی تھیں جنھیں کاروبار کے لئے رقم فراہم کی گئی۔ اس رقم سے انھوں نے اپنے گھر میں محلّے کی خواتین کے لئے کپڑوں کا کاروبار شروع کیا جس سے ان کی مستقل آمدن کا وسیلہ پیدا ہو گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مویشی فراہمی پروگرام کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں تو سینکڑوں موصول ہوئیں۔ جب اپنے طریقۂ کار کے مطابق صباٹرسٹ نے اصل مستحق لوگ تلاش کرنے کے لئے جامع سروے کیا تو پتہ چلا اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ہمارے طریقۂ کار کے مطابق اہل نہ تھے۔ ہمارے طریقۂ کار کے مطابق،

بالترتیب مستحق بیوہ عورتوں، یتیم بچّوں، ایسے افراد جن کی بچیّاں زیادہ ہوں، جن کے بچے زیادہ ہوں یا بے حد غریب ہوں ان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

گھروں کی تعمیر

صباٹرسٹ نے ایسے سیلاب متاثّرین کو جن کے گھر اس سیلاب کے دوران گر گئے تھے اپنے بجٹ کے مطابق گھر تعمیر کر کے دیئے۔ اس سلسلے میں صباٹرسٹ کو دیگر تنظیموں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ ہم نے متذکرہ بالا طریقۂ کار کے مطابق مستحقین کو منتخب کیا۔ اس کے بعد انھیں گھر کی تعمیر کی ادائیگی کا طریقۂ کار وضع کیا۔ اس طریقۂ کار کے مطابق گھر کی تعمیر کرنے والے متاثرین کو رقوم یکمشت دینے کے بجائے قسطوں میں دی گئیں۔ گھر کی تعمیر کو مختلف مراحل میں تقسیم کیا گیا۔ ایک قسط ایڈوانس ادا کی گئی۔ اس کے بعد باقی اقساط ہر مرحلے کی تکمیل کے بعد ادا کی گئیں۔ قسط کی ادائیگی سے قبل نمائندہ علاقے میں جا کے گھر کی تعمیر کا جائزہ لیتا تھا اور دیکھتا تھا کہ آیا مطلوبہ مرحلہ تکمیل کو پہنچایا نہیں۔ سیلاب متاثرین بحالی منصوبہ نوشہرہ کے علاقے گنڈیری پایاں اور میٹھا خیل کے علاقے میں سرانجام دیا گیا۔

سیلاب 2014ء

پاکستان میں ہر سال سیلاب کسی نہ کسی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ صباٹرسٹ ہر سال متاثرین تک امداد پہنچاتا ہے۔ سال 2014 میں صباٹرسٹ نے غیر ملکی امدادی اداروں کے ساتھ مل کر جھنگ کے علاقے اٹھارہ ہزاری میں غریب کسانوں میں بیج اور کھاد تقسیم کی۔ تقریباً سوا ایکڑ اراضی کے لئے بیج اور کھاد تقسیم کئے گئے۔ ہماری ٹیم نے متاثرہ علاقے میں جا کر چھوٹے کاشتکاروں کو منتخب کیا اور پھر ایک تقریب میں بیج اور کھاد ان کسانوں کے حوالے کئے۔

2015ء میں آنے والے سیلاب کے دوران صباٹرسٹ نے لیہ کے متاثرین کے لئے امدادی سامان روانہ کیا۔ جس میں اشیائے خوردونوش، کمبل، جوتے اور ضرورت کا دیگر سامان موجود تھا۔

زلزلہ 2015ء

2005ء میں آنے والے زلزلے کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔ اتفاق سے اکتوبر 2015ء میں آنے والے زلزلے کے اگلے دن میں پاکستان پہنچا۔ دوسرے دن میں نے اپنی ٹیم کے ہمراہ سروے کیا۔ ہم چھ سات گھنٹے کا فاصلہ طے کر کے بونیر (خیبر پختونخواہ) کے علاقے ڈگر پہنچے۔ ضلعی انتظامیہ کے افسروں کے ہمراہ ہم بازار گے، جواڑاور بامپوخہ کے علاقے میں گئے۔ متاثرہ لوگوں سے ملے اور انھیں ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔ دودن کے بعد ہم نے وہاں کے لوگوں کے لئے کمبل، کپڑے اور گوشت بھجوادیا۔ میں نے امریکہ میں موجود پنے دوستوں سے بات کی۔ ایک مرتبہ پھر ایل۔ڈی۔ ایس چرچ کے لوگوں نے ہماری پکار پہ لبیک کہا۔ ایل۔ڈی۔ ایس چرچ اور دوسرے دوستوں کی مدد سے خیبر پختون خواہ میں زلزلے سے متاثرہ لوگوں کے لئے ایک بڑا ریلیف پروگرام ترتیب دیا۔ جس میں ہم نے انھیں خیمے، کمبل، گرم کپڑے، جیکٹس، گرم ٹوپیاں، جوتے، رضائیاں، زنانہ و مردانہ گرم چادریں اور راشن مہیا کیا۔ ریلیف کا یہ سامان بونیر، ڈگر، شانگلہ اور لوئر دیر کے علاقوں میں تقسیم کیا گیا۔

تعلیمی خدمات

☆ صباٹرسٹ کوشش کرتا ہے کہ اپنی ہم خیال تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرے تاکہ ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے اور پیشہ ورانہ مہارت کو مزید پروان چڑھایا جائے۔

☆ صباٹرسٹ کو شفاء میڈیکل کالج کے قیام کے موقع پر ابتدائی عطیّات دینے والی تنظیم کا اعزاز حاصل ہے۔ شفا کالج آف میڈیسن اور شفا سکول آف نرسنگ کو بھی ممکنہ حد تک مالی مدد فراہم کی گئی۔

☆ صباٹرسٹ نے "سٹیٹ آف آرٹ" ایمبولینسز، دی چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس کے تعاون سے مختلف ہسپتالوں کو عطّیہ کیں۔ ان ایمبولینسز کو چلتے پھرتے ہسپتال (موبائل ہسپتال) بھی کہا جاسکتا ہے۔

☆ دور دراز کے گاؤں اور دیہاتوں میں صباٹرسٹ نے رفّہ ٹرسٹ اور ریلوے ہسپتال کے ساتھ مل کر آئی کیمپ لگائے۔ جن میں ڈیزرٹ انٹرنیشنل کا بھرپور تعاون شامل رہا۔ تمام اخراجات، آپریشن کے ضروری آلات اور آئی لینس ڈیزرٹ انٹرنیشنل کے ڈاکٹر جیکسن نے مہیّا کئے۔

☆ صباٹرسٹ ایسے مستحق طالب علموں کو، جن کے والدین ان کے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، مالی مدد فراہم کرتا رہا ہے۔ صباٹرسٹ ایسی بہت سی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے جو علم کی روشنی پھیلانے اور جہالت ختم کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

☆ وزڈم ہاؤس (Wisdom House) کھاریاں میں واقع ایک بہت بڑا تعلیمی منصوبہ ہے۔ جہاں پر چار ہزار سے زائد طلباء 83 سے زائد دیہاتوں سے علم

حاصل کرنے آتے ہیں۔ 40 کلو میٹر تک آس پاس کے علاقہ کے طلباء اس ادارے تک روزانہ پہنچتے ہیں۔ صباٹرسٹ نے اس ادارے کے مختلف منصوبوں کی تکمیل میں گرم جوشی سے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس کے چیئرمین جناب عبدالشکور صاحب میرے انتہائی گہرے دوست ہیں۔

☆ سوہاوہ کے گورنمنٹ سکولوں میں کمپیوٹر اور کتابوں کے عطیّات دیئے۔

صباٹرسٹ مندرجہ ذیل اداروں کو چلانے کیلئے مدد فراہم کرتا رہا

۱۔ للّا کمال پور ہائی سکول

۲۔ نکرالی ہائی سکول

۳۔ پائل مڈل سکول

☆ یونیورسل پرائمری ایجوکیشن (Universal Primary Education) کو صباٹرسٹ اور یونیسیف (Unicef) نے مشترکہ طور پر چلایا۔ یہ پروگرام مری اور کوٹلی ستیاّں کے علاقے میں شروع کیا گیا۔

☆ صباٹرسٹ مستحق طلباء کو وظائف بھی مہیاّ کرتا رہا۔ یہ وظائف مندرجہ ذیل تعلیمی اداروں کے ذریعے فراہم کئے گئے۔

۱۔ تعمیر ملت

۲۔ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ

۳۔ سینا اکیڈمی

☆ صباٹرسٹ ایسے تمام طلبا کو موقع فراہم کرتا رہا جو آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر غربت اور وسائل کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر پا رہے تھے۔

☆ صباٹرسٹ مستحق اور غریب طلباء کو کتابوں اور کاپیوں کی بلا تخصیص فراہمی بھی کرتا رہا۔ اس وقت پورے سال کی کتابوں اور کاپیوں پر ایک طالب علم کا

خرچ محض دس امریکی ڈالر آتا تھا۔

☆ صباٹرسٹ تعلیمی اداروں کو جدید تقاضوں کے مطابق ہم آہنگ کرنے کیلئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ اس مقصد کیلئے نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈیویلپمنٹ (NCHD) کی شراکت سے چھ ہزار سے زائد کمپیوٹر سترہ مختلف اضلاع میں تقسیم کئے گئے۔

☆ صباٹرسٹ نے 2005ء میں زلزلہ سے متاثّر ہونے والے طالب علموں کو یونیورسٹی اور کالج میں تعلیم جاری رکھنے کے لئے وظائف دیئے تاکہ ان کی تعلیمی سرگرمیاں متاثّر نہ ہوں۔

☆ صباٹرسٹ بچّوں کی تعلیم و تربیت کیلئے اساتذہ کو ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیت دیتا ہے۔ اساتذہ کی تربیت کے مختلف پروگرام صباٹرسٹ کے زیر اہتمام ترتیب دیئے گئے تاکہ نوجوان نسل کو جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق زیور تعلیم سے آراستہ کیا جاسکے۔ اس کے لئے اساتذہ کے ذہنی و نفسیاتی معیار کو اس مقام تک لانا ضروری تھا۔

ووکیشنل ٹریننگ

مشہور ضرب المثل ہے کہ ”کسی کو مچھلی دینے کے بجائے اسے مچھلی پکڑنے کا طریقہ سکھا دینا بہتر ہے۔“

لہٰذا اس اصول کے تحت صباٹرسٹ نے غریب اور کم آمدنی والے لوگوں، خاص طور پر عورتوں کو ووکیشنل ٹریننگ پروگرام شروع کرائے۔ صباٹرسٹ ایسے افراد جو مہارت کی کمی کی وجہ سے مختلف معاشی مسائل کا سامنا کر رہے ہوں، کو ووکیشنل ٹریننگ سنٹر کے ذریعے مختلف ہنر سکھانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی معاشی حالت میں مثبت تبدیلی لاسکیں۔

☆ تلہ گنگ کے نزدیک اہل علاقہ کی خواہش پر بچیوں کیلئے ایک سلائی سنٹر کھولا گیا جہاں بچیوں کو سلائی کڑھائی کی تربیت دی جاتی تھی۔ صبا ٹرسٹ کی اس کاوش کو لوگوں نے بہت سراہا۔

☆ صبا ٹرسٹ نے سینا اکیڈمی میں آئی۔ ٹی سینٹر قائم کیا۔

☆ صبا ٹرسٹ یادگار ویلفیئر سوسائٹی کے ساتھ مل کر مختلف قسم کے پروگرام منعقد کرواتا رہا۔

مائیکرو کریڈٹ پروگرام

صبا ٹرسٹ "مائیکرو کریڈٹ پروگرام" کے ذریعے غریب لوگوں کو چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لئے قرضہ فراہم کرتا رہا۔ معاشی طور پر اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے بعد آسان اقساط میں قرضہ واپس لوٹانا ضروری ہوتا تھا۔ یہ قرضے بلاسود فراہم کئے جاتے رہے۔

اس پروگرام کے تحت تقریباً پانچ ہزار خاندانوں کی مدد کی گئی اور مندرجہ ذیل کاروبار شروع کرائے گئے۔

نمبر شمار	نام کاروبار	نمبر شمار	نام کاروبار
1	پولٹری	2	مچھلی (فش فارمنگ)
3	بھیڑ بکریوں کی پرورش	4	مویشی برداری
5	جنرل سٹور	6	بڑھئی (کارپینٹر)
7	ستو سٹور	8	حجام کی دکان
9	پلاسٹک کے برتنوں کی دکان	10	سلائی کڑھائی (ووکیشنل)
11	بیل گاڑی	12	شہد کی مکھیوں کا فارم

تعمیر ملت تعلیمی پروگرام

پاکستان کو دنیا کی ممتاز ترین اقوام کی صف میں لا کھڑا کرنے کیلئے صباٹرسٹ کے پیش نظر طویل و قلیل مدتی پروگرام موجود ہیں۔ صباٹرسٹ کی جانب سے زندگی کے مختلف شعبوں میں بھرپور مدد اور توجہ کا مقصد پاکستان کی نوجوان نسل اور ذہین افراد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ آئندہ چل کر پاکستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ صبا ہومز کا منفرد منصوبہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

اس مقصد کیلئے مختلف میٹنگز، سیمینار اور کانفرنسز منعقد کرائی جاتی ہیں۔ کردار کی تعمیر، تحریک و ترغیب اور وقت کی پابندی جیسے پروگرام ان کا اہم موضوع ہوتے ہیں۔ طلباء اور نوجوانوں کے لئے پروگرام شروع ہیں۔ جس میں ان کے کردار کی تعمیر اور اصلاح سر فہرست ہیں تاکہ معاشرے میں ان کی مثبت سرگرمیوں کو اجاگر کیا جائے۔ پاکستان میں نوجوانوں کی اکثریت ہے۔ اگر انھیں محبت اور احترام سے اچھے مقصد کی جانب بلایا جائے تو وہ ضرور لبیک کہیں گے۔

بین المذاہب ہم آہنگی

صباٹرسٹ انسانیت کے روشن مستقبل، خوشحالی، امن کے فروغ، برداشت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے بین المذاہب مکالمے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اپنے ممکنہ وسائل کے ذریعے بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں پوری دنیا سے ہر مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد شرکت کرتے ہیں۔

صباٹرسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پاکستان میں کئی بار بین المذاہب امن کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں سب مذاہب کے ماننے والوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس میں شرکاء نے عالمی بھائی چارے کو درپیش مسائل اور مشکلات کا احاطہ

کیااور اس صورت حال سے نکلنے کیلئے تجاویز پیش کیں۔

کانفرنس کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوتے ہیں۔

☆ بین المذاہب ہم آہنگی اور بھائی چارے کا قیام

☆ اسلامی تہذیب و تمدّن کو اصلی نظریات کے ساتھ پیش کرنا تاکہ تمام مذاہب کے ماننے والے اسلام کے بنیادی نظریات سمجھ سکیں۔

☆ اسلام کے خلاف پھیلتے منفی تصوّر کو روکنا اور ختم کرنا۔

میں نے امریکہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی مذہبی ہم آہنگی کے لئے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ دیگر طلبہ کے ساتھ مل کر پہلا کاسموپولیٹن کلب (Cosmopolitan Club) 1957ء میں شروع کیا۔ مجھے اس کلب کا پہلا منتخب صدر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ ہم نے اسی کلب کے زیر اہتمام پہلی عالمی مذہبی ہم آہنگی کانفرنس منعقد کروائی۔ اس کانفرنس میں دنیا کے پچیس ممالک سے ہر مذہب کے پیروکاروں نے شرکت کی۔ یہ ایک انتہائی کامیاب کانفرنس تھی جس کے انعقاد کے بعد ایسی کانفرنس کرانے کا رواج چل پڑا جو ابھی تک جاری ہے۔

ہم نے اسی کلب کے ذریعے عطیّات اکٹھے کئے جو غریب، مستحق اور قابل طلباء کو وظائف دینے کے لئے استعمال کئے۔

بیرون پاکستان خدمات

نمبر شمار	ملک	نمبر شمار	ملک
1	اوکلوہاما بمباری کے متاثرین کی مدد	2	ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے متاثرین کی مدد
3	اروائن میں آگ کے متاثرین	4	افغانستان
5	بھارت	6	فلسطین
7	عراق	8	کشمیر
9	ایران	10	نائیجیریا
11	بوسنیا	12	سونامی ممالک
13	سوڈان	14	بنگلہ دیش
15	صومالیہ	16	دیگر

اندرون ملک خدمات

مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر مختلف علاقوں میں عیسائی بھائیوں کے ساتھ کام کیا گیا۔ انھیں کرسمس تحائف دیئے گئے۔ ضرورت مندوں میں کھانے پینے کا سامان تقسیم کیا گیا۔ کمپیوٹر مہیّا کئے گئے اور ان کے ساتھ مل کر مذہبی ہم آہنگی کانفرنسز کا انعقاد کیا گیا۔

اندرون ملک خدمات

پنجاب			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	اٹک	2	راولپنڈی
3	چکوال	4	رحیم یار خان
5	مری	6	فیصل آباد
7	گوجرہ	8	جڑانوالہ
9	کھاریاں	10	چیچہ وطنی
11	راہوالی	12	قلعہ دیدار سنگھ
13	سیالکوٹ	14	گجرات
15	جہلم	16	کھاریاں
17	جھنگ	18	مظفر گڑھ
19	ٹوبہ ٹیک سنگھ	20	لیہ
21	سرگودھا	22	قلعہ دیدار سنگھ
23	ساہیوال	24	ٹیکسلا
25	لاہور	26	سوہاوہ
27	تلہ گنگ	28	ڈیرہ اسماعیل خان
29	نارووال	30	قصر
31	راجن پور	32	فتح جھنگ
33	میاں والی	34	خانیوال
35	بہاول نگر	36	شیخوپورہ
37	میاں چنوں	38	متعدد دیگر

سندھ			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	شکارپور	2	ٹھٹھہ
3	بدین	4	گھوٹکی
5	میرپور خاص	6	حیدرآباد
7	سکھر	8	دیگر
خیبر پختونخواہ			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	صوابی	2	شانگلہ
3	مانسہرہ	4	ہری پور
5	بٹگرام	6	ایبٹ آباد
7	کوہاٹ	8	دیگر
بلوچستان			
نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
1	نصیر آباد	2	مستانگ
3	پشین	4	زیارت
5	قلعہ عبداللہ	6	جعفر آباد
7	بولان	8	جھل مگسی

انفرادی علاقے

نمبر شمار	نام علاقہ	نمبر شمار	نام علاقہ
راولپنڈی			
نمبر شمار	**نام علاقہ**	**نمبر شمار**	**نام علاقہ**
1	شیر ون کالونی	2	کرسچین ٹاون
3	نصیر آباد	4	پنڈورا
5	صادق آباد	6	ڈھوک الٰہی بخش
گوجرانوالہ			
نمبر شمار	**نام علاقہ**	**نمبر شمار**	**نام علاقہ**
1	راہوالی	2	کچہ فتح مند
3	کوٹ کالیاں	4	بچہ چٹھہ
5	کوٹلے میانے	6	اجن چک
7	کوٹ فاضلہ	8	درگاہی والا
جہلم			
نمبر شمار	**نام علاقہ**	**نمبر شمار**	**نام علاقہ**
1	نیو کرسچین کالونی	2	ڈھوک جمعہ
3	کھاریاں کینٹ	4	ستار پورہ
5	رانجھاہی	6	نور پور چیل
7	قلعہ دیدار سنگھ	8	تاری والا
دیگر شہر			
نمبر شمار	**نام علاقہ**	**نمبر شمار**	**نام علاقہ**
1	پشاور	2	ملتان
3	فیصل آباد	4	لاہور
5	کراچی	6	کوئٹہ

صحراء میں پھول (Blossom in The Desert)

کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر خود بناتا ہے لیکن میرے خیال میں غریب آدمیوں پر یہ مثال صادق نہیں آتی کیونکہ غریب لوگ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے کا خواب نہیں دیکھتے بلکہ اپنی زندگی، ضروریات زندگی حاصل کرنے کی جدّوجہد میں گزار دیتے ہیں۔ وطن عزیز میں ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو بنیادی ضروریات زندگی سے یکسر محروم ہیں۔

پاکستان کو آزادی حاصل کئے کئی دہائیاں گزر چکی ہیں مگر آج بھی دیہاتی علاقوں میں رہنے والی اسّی فیصد (80%) سے زائد آبادی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ ایک طرف تو دنیا جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقّی کے اس عہد میں مریخ اور پلوٹو پر جا پہنچی ہے جبکہ دوسری طرف وطن عزیز میں اکثریت ان دیہاتوں اور گاؤں کی ہے جہاں پر صحت، تعلیم اور پینے کے صاف پانی جیسی بنیادی سہولیات تک میسر نہیں۔ عدم مساوات کے اس پس منظر میں صوبہ پنجاب کے ضلع چکوال کے ایک گاؤں کا تذکرہ خصوصی طور پر اہمیت کا حامل ہے کہ اس علاقے میں پینے کا صاف پانی تک مہیّا نہ تھا۔

ایک گاؤں کا تذکرہ

جس گاؤں کا تذکرہ ہم کرنے جارہے ہیں، ایک ایسا گاؤں تھا جہاں پہ انسان اور مویشی ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔ خواتین پینے کا پانی حاصل کرنے کے لئے تین میل دور تک سفر کرتی تھیں اور پانی کے بھاری برتن اپنے سروں پہ اٹھا کے لاتی تھیں۔ چاہے سخت گرمی ہو یا سردی انھیں بہر حال یہ کام کرنا ہوتا تھا۔ یہ تو محض ایک گاؤں کا تذکرہ ہے۔ پانی کے مسائل آپ کو جگہ جگہ دکھائی دیں گے۔

جس علاقے کی ہم بات کر رہے ہیں اس علاقے میں غربت اتنی عام تھی کہ

لوگوں کے پاس اپنے بچّوں کی فیس ادا کرنے کے لئے پیسے تک نہ تھے لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اپنے بچّوں کو پڑھا نہیں سکتے تھے۔ جو چند ایک خاندان اپنے بچّوں کو پڑھا رہے تھے وہ بھی بڑی مشکل سے ان کی فیس ادا کرتے تھے حتّٰی کہ کچھ طالب علم اپنی فیس ادا کرنے کے لئے اپنی پالتو مرغی کے انڈے بیچ کر پیسے اکٹھے کرتے۔ اس علاقے میں اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے خود ہی تندرست ہو جانے کا انتظار کرتا کیوں کہ اس کے پاس ڈاکٹر کی فیس کے پیسے تو کجا، اس تک پہنچنے کے لئے کرایہ تک نہ ہوتا تھا۔ آپ اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ معاشی ناانصافی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟

یہاں کی غریب بچیّاں کوئی ہنر نہیں سیکھ سکتی تھیں کیونکہ کوئی تربیتی مرکز موجود نہ تھا۔ حکومت ابھی تک ان لوگوں کو کسی بھی قسم کی سہولیات فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ حکومتی اداروں کی اس غفلت کا شکار زیادہ تر بیوائیں اور یتیم بچّے ہوئے اور ان کو بے پناہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

صباٹرسٹ کا کردار

یہ نئی صدی یعنی 2000ء کا آغاز تھا جب صباٹرسٹ کی ٹیم اس علاقے میں پہنچی۔ وہاں پر لوگوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صباٹرسٹ نے ان لوگوں کی زندگی تبدیل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اہم اور انقلابی اقدام اٹھائے۔

1) صباٹرسٹ نے وہاں کے لوگوں کو پانی مہیّا کرنے کی غرض سے پانی کے نل لگوا کر دیئے اس طرح ان کا سب سے بڑا اور دیرینہ مسئلہ حل ہوا۔ ان کے گھروں کے پاس ہی پینے کے صاف پانی کی سہولت فراہم ہو گئی۔

2) صباٹرسٹ نے خواتین کی ضروریات کا احساس کیا۔ ہنر مندی (Skill Training) اور استعدادی صلاحیت مرکز (Vocational Training)

قائم کئے۔ ان کو سلائی مشینیں (Sewing & Stitching Machines) ، کڑھائی مشینیں (Embroidery Machine) اور دوسرا ضروری سامان مہیّا کیا۔ اس مرکز میں انھیں سلائی کڑھائی اور دیگر ہنر سکھائے جاتے تاکہ وہ کسی پر بوجھ بننے کے بجائے اپنے آپ کو اس قابل بنا سکیں کہ اپنے گھر کا یا اپنا ذاتی خرچ خود اٹھا سکیں۔

چند ہفتوں میں ہی ان کے گھر کے حالات بدل گئے۔ وہی مرد جو بعض حالات میں گالم گلوچ کرتے تھے اس بات کا خیال کرنے لگے کہ اب ان عورتوں اور لڑکیوں کے جذبات و احساسات کو ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب انھوں نے گھر کے معاشی مسائل کو کم کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

3) صباٹرسٹ نے وہاں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک سکول کھولا۔ غریب طلباء کے لئے نصابی کتب مہیّا کیں اور پڑھنے لکھنے کا ضروری سامان لے کر دیا تاکہ وہ اپنی تعلیم دوبارہ سے شروع کر سکیں۔ صباٹرسٹ نے وہاں کے یتیم اور بے آسرا بچوں کو عید کے کپڑے اور جوتے لے کر دیئے تاکہ وہ اپنی عید اچھے طریقے سے منا سکیں۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان خدمات کی بدولت وہ صباٹرسٹ کے لئے کیا جذبات اوراحساسات رکھتے ہوں گے۔ صباٹرسٹ نے ان کے لئے انقلابی اقدامات اٹھائے۔ اس گاؤں کے لوگوں نے صباٹرسٹ کو "صحرا میں پھول" (Blossom in the Desert) کا خطاب دیا کیوں کہ صباٹرسٹ ان کی زندگیوں میں بنیادی اور اہم تبدیلیاں لے کر آیا تھا۔ ان کے شب وروز کو خوشگوار انداز میں تبدیل کر دیا تھااور ان کی زندگی میں خوشی اور مسّرت بھر دی تھی۔

جب صباٹرسٹ کی ٹیم وہاں سے رخصت ہونے لگی تو ان لوگوں نے بہترین انداز میں صباٹرسٹ کو خراج تحسین پیش کیا۔ اگرچہ دھوپ تیز اور زمین گرم تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے اور ان کے معصوم بچّوں نے صباٹرسٹ کے لئے اور اس کے بہتر مستقبل کے لئے نوافل ادا کئے اور دعا کی۔ یہ نوافل اور دعائیں وہ بہترین خراج تحسین تھا جو ان لوگوں نے صباٹرسٹ کی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا۔

صباٹرسٹ اور ربّ نواز

ربّ نواز کی کہانی۔ ربّ نواز کی زبانی

میں آپ سے ایک ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈیویلپمنٹ (NCHD) کے لئے کام کرتا ہوں۔ صباٹرسٹ کی طرف سے نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈیویلپمنٹ کو کچھ کپڑے عطیّہ کئے گئے۔ مجھے اپنے ادارے کی طرف سے ذمّہ داری سونپی گئی کہ میں ان کپڑوں کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے علاقے میں جا کر تقسیم کروں۔ یہ میرے لئے کوئی خاص بات نہ تھی بلکہ یہ میرے لئے کام کا ایک عام دن تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے ٹوبہ ٹیک سنگھ جا کے کپڑے تقسیم کرنا ہوں گے۔

جب میں نے کام کا آغاز کیا اور کپڑے تقسیم کرنا شروع کئے تو جلد ہی کپڑے لینے والے غریب افراد کی ایک لمبی قطار لگ گئی۔ مرد، عورتیں، بچّے، بوڑھے سب ہی اپنا حصہ لینے کو بے تاب دکھائی دیتے تھے۔ جب لوگ اپنے حصّے کا بنڈل وصول کرتے تو ان کی خوشی دیدنی ہوتی۔ مسرت ان کے چہروں سے چھلک رہی ہوتی۔ ان کے دل سے اپنے محسنوں کے لئے دعاؤں کا نکلنا ایک فطری امر تھا۔ اس منظر نے مجھ پر عجیب اثر کیا اور یہ ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گیا۔ خدمت خلق کے اس تجربے کے خوش کن

احساس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ میں نے اپنے اندر ایک گہری طمانیت اترتی محسوس کی کیونکہ جو لوگ یہ کپڑے لے رہے تھے ان کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر ننگے پاؤں تھے اور پھٹے پرانے کپڑوں سے انھوں نے اپنے اجسام کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ایک خاتون جس نے وہ کپڑے حاصل کئے اس کا کہنا تھا کہ وہ ایسے کپڑوں کا صرف خواب ہی دیکھ سکتی ہے۔ ایک دوسری عورت نے کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اتنے خوبصورت کپڑے پہن سکتی ہوں۔ ایک اور خاندان کو میں نے ان کی بچّی کے جہیز کے لئے بہت سارے کپڑوں کے بنڈل دیئے تو وہ تقریباً رو دیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اتنے غریب ہیں کہ ان کو یہ کپڑے ایک بہت بڑا اثاثہ معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہو سکتا تھا کہ آپ ہمارے لئے یہ سب کچھ نہ کرتے تو ہم اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

صبا ہومز

صبا ہومز، صبا ٹرسٹ کا ذیلی ادارہ اور ایک شاندار منصوبہ ہے۔ ٹرسٹ سے متصّل صبا ہومز کی پانچ (5) منزلہ عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ صبا ہومز میں داخل ہوتے ہی سادگی اور صفائی آپ کو متاثر کرتی ہے۔ فرش پہ لگا ہوا سنگ مرمر چمک رہا ہوتا ہے۔ دیواروں پہ ان محترم ہستیوں کی تصاویر آویزاں ہیں جنہوں نے دنیا کیلئے اعلیٰ خدمات سر انجام دی ہیں۔

صبا ہومز کی زمینی منزل پر کچن اور اس کے ساتھ کھانے کا وسیع ہال ہے جس میں ترتیب اور سلیقے سے کھانے کی میز کے گرد کرسیاں لگی ہیں۔ ڈائننگ ہال کی دیواروں پر بچّوں کے لئے تصاویر پینٹ کی گئی ہیں۔ نیز دیواروں پر پینٹ سے لکھا گیا کھانا کھانے کا اسلامی طریقہ، آداب اور قرآنی آیات اس ہال کی دلکشی میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ ہال

کے اختتام پر درزی کا کمرہ ہے جہاں ایک خاتون درزی بچیوں کے کپڑے تیار کرنے میں منہمک رہتی ہے۔ اس سے اوپر کی منزل یعنی پہلی منزل پر ایڈمنسٹریٹر روم، ایک بڑا ہال اور لائبریری موجود ہیں جبکہ اس سے اوپر کی منزل پر بچیوں کے رہائشی کمرے ہیں۔

آپ چشم تصوّر سے ملاحظہ کریں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں (جن کی عمریں 4 سے 19 سال کے درمیان ہیں) ایک قطار میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوتی ہیں۔ وہ پہلے سے وہاں موجود لوگوں کو سلام کرتی ہیں اور اس کے بعد باورچی خانے کی کھڑکی سے کھانا لے کر اپنی اپنی نشست پر بیٹھ جاتی ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی ہے۔ جب آخری لڑکی بھی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے تو سب بچیاں بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo پڑھ کر کھانا کھانے کی دعا پڑھتی ہیں اور کھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کے کھانے کے انداز میں وقار اور آہستگی ہوتی ہے اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مکمل اسلامی آداب کے ساتھ کھانا کھائیں۔ کھانا ختم کر کے سب بچّیاں با آواز بلند دعا پڑھتی ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتی ہیں۔ اپنے برتن اٹھا کے باورچی خانے کی کھڑکی میں رکھتی ہیں اور اسی طرح قطار کی صورت میں ہال سے باہر نکل جاتی ہیں۔

ان تمام بچیوں کے والدین اگرچہ وفات پا چکے ہیں تاہم یہ یتیم ہر گز نہیں۔ صغیر احمد اسلم اور بشریٰ سلطانہ اسلم کی صورت میں انھیں والدین مل چکے ہیں۔ صبا ہومز، یتیم بچیوں کا گھر ہے مگر یتیم خانہ ہر گز نہیں۔ صبا ہومز میں ساٹھ سے زائد بچیوں کی رہائش کا انتظام موجود ہے۔ بنیادی طور پر یہ منصوبہ 2005ء میں آنے والے زلزلے کے باعث یتیم ہونے والی بچّیوں کے لئے شروع کیا گیا تھا۔ کشمیر کے علاوہ دیگر علاقوں کی بچیاں بھی صبا ہومز میں ہیں۔ صبا ہومز ایک منفرد اور اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ایسا ادارہ جو باقاعدہ کسی نظریے کے تحت قائم کیا گیا۔ یہ ادارہ ایک آئین کے تحت کام کرتا ہے اور اپنی بہت سی خوبیوں کی بناء پر دوسروں سے ممتاز ہے۔

صبا ہومز میں بہترین تعلیم کے ساتھ بچیوں کی تربیت اور ذہنی نشوونما کا خاطر خواہ انتظام موجود ہے۔ ان کی تربیت ایسے انداز میں کی جا رہی ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق، مضبوط کردار، ایماندار، جرأت مند، دردمند، غیرت مند، اچھی انسان اور پکی مسلمان کے طور سامنے آئیں اور معاشرے کی بہتری کے لئے اپنی خدمات سرانجام دے سکیں۔ ان کا کردار اتنا مثالی ہو کہ صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کا کردار اور زمانہ یاد آ جائے۔ اگر ہماری نوجوان نسل اس کردار کی حامل ہو تو پاکستان کو مختصر عرصے میں ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

صبا ہومز میں بچیوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مضبوط بنانے کیلئے ان کی ہر طرح سے آرام و آسائش کا خیال رکھا گیا ہے۔ جتنی شفقت اور محبت سے اپنی اولاد کی پرورش کی جاتی ہے، بالکل وہی انداز صبا ہومز کی بچیوں کے لئے اپنایا گیا ہے۔ ان کو اتنے اعلیٰ درجے کی رہائش مہیّا کی گئی ہے کہ اس کو بلا مبالغہ ”سٹیٹ آف آرٹ“ قرار دیا جاسکتا ہے۔

بچیوں کے ہر رہائشی کمرے میں بہترین لکڑی کا فرنیچر، بیڈ، کپڑوں کی الماری اور کمرے کو ٹھنڈا اور گرم رکھنے کا انتظام موجود ہے۔ ان کی تربیت اور دیکھ بھال کیلئے مستعد ”روم مدرز“ موجود ہوتی ہیں جو چوبیس گھنٹے، صبا گرلز کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ ان کی تربیت کے علاوہ آرام و آسائش کا بھرپور خیال رکھتی اور ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرتی ہیں۔

صبا ہومز کی بچیوں کو پڑھنے کیلئے ایک معیاری نجی سکول بھیجا جاتا ہے۔ ”ماما“ اور روم مدرز بچیوں کو سکول چھوڑنے اور لانے کیلئے گاڑی کے ہمراہ جاتی ہیں۔ صبا ہومز میں بھی خوبصورت کلاس رومز موجود ہیں جہاں پہ شام کو صبا گرلز ٹیوشن پڑھتی ہیں۔ اس کیلئے قابل اور محنتی خواتین اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ آڈیو، ویڈیو لائبریری کے علاوہ کتب لائبریری بھی موجود ہے جہاں چھوٹے بچوں کی دلچسپی کی کتب موجود ہیں۔

بچیوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کیلئے ایک جدید ترین کمپیوٹر لیب(Computer Lab) قائم کی گئی ہے جہاں ان کیلئے خصوصی کمپیوٹر کلاسز کا اہتمام کیا گیا ہے۔

صبا ہومز میں بچیوں کو دینی تعلیم دینے کا خاطر خواہ بندوبست موجود ہے۔ ان کو پانچ وقت نماز ادا کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو وہ خود بخود ہی کمرۂ نماز میں اکٹھے ہو کر نماز ادا کرتی ہیں۔ صبح سویرے قرآن پاک پڑھتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کچھ بچیاں ابھی قرآن پاک پڑھنا سیکھ رہی ہیں۔ ہر جمعہ کو میلاد کا دن ہوتا ہے۔ اس دن تمام بچیوں کو حمد و نعت کے ساتھ قابل فخر اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ صبا ہومز کی کوشش ہے کہ صبا گرلز کو سنت نبوی ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی سیرت و کردار کے مطابق زندگی گزارنے کا اہل بنایا جائے۔ پاپا بچیوں کو وقت کی پابندی پر خصوصی لیکچر دیتے ہیں۔ بچیوں کی کردار سازی میں پاپا کا کردار بے حد اہم ہے۔ بچیوں میں اچھائی کی تحریک پیدا کرنے اور برائی سے بچنے کی ترغیب دینا پاپا کا اوّلین مقصد ہوتا ہے۔

صبا گرلز کی تفریحی سرگرمیوں اور کھیل کود کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے تاکہ جسمانی وذہنی طور پر صحت مند رہیں۔ ایک چھوٹا سا کھیل کا میدان صبا ہومز کے اندر بنایا گیا ہے جس میں مختلف قسم کے جھولے نصب کئے گئے ہیں۔ ایک بڑے کمرے کو بچّوں کے کھیلنے کے لئے مختص کیا گیا ہے تاکہ بارش کی صورت میں ان کا معمول متاثر نہ ہو۔

بچیوں کو جسمانی اعتبار سے مضبوط بنانے کیلئے ان کو جوڈو کراٹے کی تربیت بھی دی جاتی ہے تاکہ خطرے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکیں۔ ایک بلیک بیلٹ جوڈو کراٹے ماہر روزانہ شام کو جوڈو کراٹے کی تربیت دیتا ہے۔ پاپا بچیوں کو یوگا کی تربیت دیتے ہیں اور سکھاتے ہیں کہ اس کی مدد سے کیسے خود کو صحت مند رکھا جاسکتا ہے۔

ادارے کی جانب سے بچیوں کو تفریحی و تاریخی مقامات کی سیر کیلئے لے جایا جاتا ہے۔ جن میں کشمیر، مری، ایوب پارک، سہالہ، روہتاس قلعہ، مانسہرہ اور بفّہ جیسے تاریخی و تفریحی مقامات شامل ہیں۔ صبا گرلز کو یکسانیت سے بچانے کے لئے مختلف دعوتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جیسے باربی کیو، آئس کریم اور برگر پارٹی وغیرہ۔

اس ادارے کے قیام کا مقصد باصلاحیت بچیوں کی کردار سازی ہے جو پاکستان کے روشن مستقبل کیلئے کام کر سکیں۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ والدین کی وفات کے بعد زیادہ تر بچوں کو، خاص کر بچیوں کو بوجھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایسی بچیاں عموماً گھروں میں کام کرتی ہیں۔ جب کہ صبا ہومز میں بچیوں کو موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ یہاں پہ عزّت سے رہ سکتی ہیں۔ جہاں تک اور جس قسم کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کو اجازت حاصل ہے یہاں تک کہ اس میں ڈاکٹر یا انجینئر بننا تک شامل ہے۔ صبا ہومز میں صبا گرلز اپنے اخلاق و کردار کو اس عروج تک لے جاسکتی ہیں جہاں اسلام ایک عورت کو دیکھنا چاہتا ہے۔

صبا ہومز میں بچیوں کو سب سے اہم چیز، توجّہ اور پیار کا ملنا ہے۔ میں اور بشریٰ بچیوں کو اپنی اولاد کی مانند پیار کرتے ہیں۔ صبا گرلز کو وہ سہولیات، آرام و آسائش اور تعلیم و تربیت دے رہے ہیں جیسی اپنی حقیقی بیٹیوں کو دی۔ ہم میں سے کوئی جب چھوٹی بچیوں کو دکھائی دیتا ہے تو وہ بھاگ کے لپٹ جاتی اور پیار کرتی ہیں۔ اپنے چھوٹے موٹے مسائل اور ضروریات بتاتی ہیں جو ہم انتہائی توجّہ سے سنتے اور فوری طور پہ حل کرتے ہیں۔ صبا ہومز، میں صبا گرلز کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت اور خواہش کا احترام کیا جاتا ہے۔ صبا گرلز کو آپس میں اخلاق و ایثار کا مظاہرہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کو حقیقی بہنوں کی طرح رہنے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی افادیت بھی ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

ہر چھ ماہ بعد صبا گرلز کا طبی معائنہ کرایا جاتا ہے جس میں ان کے تمام ٹیسٹ لئے

جاتے ہیں۔ ہر طریقے سے ان کی صحت کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ بچیوں کیلئے صبا ہومز کے اندر ہی مستقل طور پر ایک خاتون درزی کا بندوبست کیا گیا ہے جو صرف بچیوں کے کپڑے تیار کرتی ہے۔

ان بنیادی سہولیات اور تعلیم و تربیت کا ہی اثر ہے کہ صبا گرلز کسی فکر اور پریشانی کے بغیر پوری محنت سے اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ان کا نصب العین بہت بلند ہے۔ ان کی ذہنی تربیت کے معیار کا اندازہ اس دعائے امن (Peace Pledge) سے لگایا جاسکتا ہے جو وہ صبح سویرے دنیا کے تمام لوگوں کیلئے کرتی ہیں۔

صبا گرلز کا پیغام ساری دنیا کے نام

1۔ ہم نے حقیقی اور سچاّ اسلام، جو ہمیں امن اور محبت کا پیغام دیتا ہے، سیکھنا اور سکھانا ہے۔

2۔ ہم کسی مذہب، ملت، رنگ، نسل، ذات اور برادری کا فرق کئے بغیر انسانیت کو عزّت واحترام دینا اور محبت کو عام کرنا چاہتے ہیں۔

3۔ پوری دنیا کے ساتھ ہمارا تعلّق محبت، پیار اور عزّت واحترام پہ مبنی ہے۔

4۔ ہمارا مشن اور نصب العین مل جل کر تعصّب، نفرت اور ظلم کا خاتمہ ہے۔

5۔ ہم نے صبر و تحمّل اور علم کی روشنی سے امن پھیلانا ہے۔

6۔ ہم پاکستان کے مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ انشاء اللہ ہم پاکستان سے دہشت گردی، جہالت، ظلم، ناانصافی، غربت اور عدم مساوات کا خاتمہ کریں گی۔

صبح کی دعا

خود کو تحریک دینے کی خاطر صبا گرلز مندرجہ ذیل باتیں خود کو ذہن نشین کراتی رہتی ہیں۔ وہ یہ دہراتی رہتی ہیں کہ وہ اپنے خواب حاصل کرنے کی اہل ہیں۔

1۔ میں اللہ پاک کی رحمت کا شکر ادا کرتی ہوں۔
2۔ میں بہادر ہوں۔ میں سب کچھ حاصل کر سکتی ہوں۔ میں وہ سب کچھ کر سکتی ہوں جو دوسرے نہیں کر سکتے۔
3۔ میں لوگوں کی راہنمائی کروں گی۔
4۔ میں خود کو ایک مکمّل اور اچھا انسان بنانے کے لئے جدوجہد کروں گی۔
5۔ میں اپنی کلاس میں اوّل آنے کے لئے سخت محنت کروں گی۔
6۔ میں ماما، پاپا اور صباہومز کا بہترین تاثّر قائم کروں گی۔
7۔ میں پاکستان کو مدینہ منورہ جیسی پر امن ریاست بنانے کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالوں گی۔
8۔ میں پاکستان کو پر امن اور خوشحال ریاست بناؤں گی جیسا کہ اس کے بانی قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ نے خواب دیکھا تھا۔
9۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ماما اور پاپا کے خواب سچ کر دکھائے۔ انھیں اور ان کے باقی خاندان کو لمبی اور صحت مند زندگی عطا فرمائے۔

صباہومز سے بچیوں کی لگن

ایک واقعہ آپ کو صباہومز کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے۔ آپ یہ واقعہ صباہومز کی سابقہ ایڈمنسٹریٹر فرحت الکبریٰ کی زبانی سنیے۔

صباہومز میں عید کی چھٹیاں تھیں۔ سب بچیاں اور سٹاف کے لوگ عید منانے اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے گھر پہ تھی کہ عید کے دوسرے روز ہی مجھے ایک صبا گرل کے سرپرست کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ انھوں نے مجھے کہا کہ آپ کی چھٹیاں کب تک ہیں؟ ہماری بیٹی اب واپس صباہومز جانا چاہتی ہے۔ اس کال کے بعد تو فون کالوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوسری طرف سے صبا گرلز کے سرپرست بات کر رہے

تھے۔ ان سب کا ایک ہی مسئلہ تھا۔ ساری صبا گرلز، واپس صبا ہومز آنا چاہ رہی تھیں۔ انھیں صباہومز یاد آ رہا تھا۔ انھیں اپنے "ماما" اور "پاپا" یاد آ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں اتنی محبت اور عزّت کہیں بھی نہیں مل سکتی جو انھیں صباہومز میں مل رہی ہے۔ ان کے بغیر عید کا کوئی مزہ نہیں۔ ہم واپس آ کے اپنی عید ان کے ساتھ منانا چاہتے ہیں۔

صباہومز کے بارے میرا نظریہ

میں جب اس نظریئے کے بارے میں لوگوں کو بتاتا ہوں تو مجھے یقین ہے کافی لوگ میرے پاس سے اٹھ کر دوسروں کو بتاتے ہوں گے یہ بندہ حد درجہ ناممکنات کو سوچنے اور انھیں تعبیر کرنے کے خیال خام میں مبتلا ہو کر ہوائی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کہتا۔

صباہومز کی یتیم بچیاں انشاء اللہ مستقبل قریب میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے خوابوں کی تعبیر بن کر ابھریں گی۔ انھی میں سے مفکر، سائنس دان، اور قوم کے لئے اچھا سوچنے والے اعلیٰ دماغ پیدا ہوں گے۔ پاکستان جس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا انشاء اللہ اس کی تکمیل کے لئے اپنا پرجوش کردار ادا کریں گی۔ ان کا کردار صحابہ کرامؓ کی سیرت پاک کے مطابق ہو گا اور ان کے دلوں میں اسلام اور پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہو گی۔ وہ دوسروں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر میدان عمل میں نکلیں گی۔

بچیوں کو صباہومز کے نظریئے سے متعارف کرانے اور ان کی روز مرّہ زندگی کا جزوِلاینفک بنانے کی خاطر مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ تمثیل کا بھی ہے۔ درج ذیل مختصر ڈرامہ پر بچیوں کی پرفارمنس بے حد عمدہ رہی ہے۔ انھیں لوگوں کی طرف سے بے حد پذیرائی موصول ہوئی۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ڈرامہ کا سکرپٹ پیش کیا جارہا ہے جس سے انھیں بھی صباہومز کے قیام کا مقصد سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

ڈرامہ

منظر: ہر طرف ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ لڑائی، جھگڑا، ڈکیتی، چوری، گولیاں چل رہی ہیں، بم دھماکے ہو رہے ہیں۔

اسی اثناء میں دو شخصیات منظر پر نمودار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قائدِ اعظم اور دوسرے علامہ اقبال ہیں۔ وہ جیسے ہی اس سارے منظر کو دیکھتے ہیں تو انتہائی پریشانی اور افسوس کی کیفیت ان کے چہروں پہ نظر آتی ہے۔

قائداعظم: مسٹر اقبال! کیا آپ نے اسی دن کے لئے ہمیں پاکستان بنانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ دیکھیں تو سہی کیا ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال: مسٹر جناح! میں نے تو ایک ایسی فلاحی مملکت کا خواب دیکھا تھا جہاں پہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نظام رائج ہو۔ جہاں پہ امن و سکون ہو۔ جہاں پہ سب بھائیوں کی مانند پیار و محبت سے رہیں۔ لیکن افسوس......۔

قائدِاعظم: یہ دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے کہ مملکتِ پاکستان کے لوگ ان قربانیوں کو بھول گئے جو ہم لوگوں نے دی تھیں۔ یہ لوگ بھول گئے کہ ہم نے کتنا طویل عرصہ جدوجہد کی، مشکلات کا سامنا کیا۔ لاکھوں لوگوں نے اپنے خون سے پاکستان تخلیق کیا۔ کسی نے اپنی جان دی، کسی نے مال اور جائیداد لٹائی، کسی نے ماں باپ کھو دیئے، کسی نے بیوی بچوں کو قربان کیا۔ خواتین نے اپنے سہاگ لٹائے۔ اپنے معصوم بچوں کو اپنے سامنے موت کے منہ میں جاتے دیکھا.....یوں یہ پاک سرزمین وجود میں آئی۔ لیکن جن لوگوں کے حوالے ہم نے پاکستان کیا اُن میں سے بیشتر نے اس کی بڑی ناقدری کی۔

علامہ اقبال: ہمارے جانے کے بعد ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھلا دیا۔ تحقیق کے بجائے تقلید کو اختیار کر لیا۔ قرآن کو پڑھتے تو ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ کاش یہ قرآن پہ تحقیق کرتے تو آسمان کی رفعتوں کو چھوتے۔ زمین میں چھپے خزانے دریافت کرتے۔ اپنے اصل لیڈر کی زندگی پہ تحقیق کرتے تو سماجی و اخلاقی انقلاب برپا کرتے۔ زندگی کے ہر معاملے میں راہنمائی حاصل کرتے۔ مگر ان لوگوں نے اپنے زندگی کے اصل مقصد کو چھوڑے اور جعلی مقاصد پہ قربان کر دیا۔

قائدِ اعظم: چلو! مسٹر اقبال، واپس چلتے ہیں۔ پیارے پاکستان کو اس حالت میں دیکھنا بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔

علامہ اقبال: چلیں! (اچانک ایک طرف سے آواز آتی ہے۔)

ٹھہریئے! رکیے! پلیز ہماری بات سن کے جایئے۔

چند بچیاں بھاگ کر آتی ہیں اور دونوں سے لپٹ جاتی ہیں۔

(بیک گراونڈ میں لب پہ آتی ہے دعا)

پہلی بچی: ہمیں پتہ ہے کہ پاکستان کے حالات بہت مشکل ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لا تقنطو من رحمت اللہ (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہوں)۔

دوسری بچی: پاکستان کے لوگ آپ کے نظریئے کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ آپ لوگوں نے جس مقصد کے پاکستان بنایا ہے۔ انشاء اللہ وہ مقصد ضرور پورا ہو گا۔ اور پاکستان عطائے مدینہ ریاست میں ضرور تبدیل ہو گا۔

پہلی بچی: صبا ہومز کے قیام کا مقصد بھی وہی ہے جو قیامِ پاکستان کا تھا۔ ایک ایسی نسل کی تعلیم و تربیت جو پاکستان کو درست سمت میں لے جانے میں اپنا

کردار ادا کرے۔ اگرچہ یہ کوشش ایک چھوٹے سے قطرے کے برابر ہے۔ مگر یہ بارش کا پہلا قطرہ ہے۔ دھیرے دھیرے شعور بیدار ہو رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہر شہر میں صباہومز جیسے ادارے نظر آئیں گے۔

دوسری بچی: ہمارا نظریہ ہے کہ ساری دنیا کے لوگوں کی عزت کرو اور ان سے محبت سے پیش آؤ۔

پہلی بچی: صباہومز انشاءاللہ اس دور کے قائدِ اعظم اور علامہ اقبال پیدا کرے گا۔ صباہومز ایسے سائنس دان، ڈاکٹر، انجینئر، ماہرِ تعلیم، مفکر اور فلاحی کام کرنے والے افراد پیدا کرے گا جو معاشرے میں جا کر اپنے اپنے شعبے میں انقلاب پیدا کر دیں اور بلا تفریق لوگوں کی خدمت کریں گے۔ ماما پاپا نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد خدمتِ خلق ہے....۔

(We are born to serve)

(قائداعظم اور علامہ اقبال کے چہروں پر خوشی نظر آتی ہے)

(قومی ترانہ۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں)۔

مادی دولت کے بجائے نظریے کو ترجیح

میرے ایک قریبی دوست بریگیڈیر(ر) سلطان مقصود نے میرا تعارف سکولوں کی ایک مشہور اور بین الاقوامی چین سے کروایا۔ وہ لوگ ہمیں آکر ملے۔ صباہومز کا دورہ کیا تو عمارت اور اُس کا ڈیزائن انھیں بے حد پسند آیا۔ انھوں نے ہمیں اپنی فرنچائز دینے کی آفر کی اور کہا کہ آپ ہمارے سکول کی ایک برانچ کھولیں۔ یہ یاد رہے کہ ایسی چین کی فرنچائز اگر کوئی لیتا ہے تو اس کی فیس لاکھوں میں ہوتی ہے۔ جبکہ انھوں نے ہمیں کہا کہ ہم آپ سے اس کی کوئی پیشگی فیس نہیں لیں گے۔ نہ آپ سے ماہانہ فیس لیں

گے اور نہ ہی سالانہ فیس لیں گے۔ انھوں نے کہا ہم آپ کے مشن اور آپ کے کئے گئے کاموں سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ ہم آپ سے کوئی فیس لینے کے بجائے آپ کو ایک کروڑ روپے اپنی طرف سے ادا کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اتنی اچھی آفر دی۔ مگر بات دراصل یہ ہے کہ ہم دونوں متضاد نظریئے کے حامل ہیں۔ میرا اوڑھنا بچھونا اسلامی طرزِ حیات ہے جب کہ آپ کسی اور نظریئے کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں لہٰذا ہمارا آپس کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔

میری نظر میں مادی دولت کے بجائے ایمان کی سلامتی اور بقا بے حد ضروری ہے۔ اس لئے میں نے دولت کے بجائے ایمان کو ترجیح دی اور ان لوگوں کی پیشکش اچھے انداز میں مسترد کردی۔

صبا ہومز کا دورہ کرنے والے ایک صاحب نے ایک بچّی سے پوچھا کہ وہ بڑی ہو کر کیا بننا پسند کرے گی۔ اس نے جواب دیا ''میں بڑی ہو کر اس ملک کی وزیر اعظم بنوں گی اور اپنی جیبیں بھرنے کے بجائے غریبوں کی جیبیں بھروں گی۔ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا طرز حکمرانی رائج کروں گی۔'' وہ صاحب یہ سن کر حیران رہ گئے اور بچی کو شاباش دی۔

ایک اور صبا گرل ''ندا'' کہتی ہے ''میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔ میں پاپا اور ماما کی طرح ایک اور صبا ہومز کھولوں گی۔'' اس طرح کے دل کو گرما دینے والے خیالات سے آگاہی حاصل کر کے مجھے لگتا ہے کہ انشاءاللہ آنے والی نسلیں ہم سے بہتر پاکستان کی محافظ ثابت ہوں گی۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

(علامہ اقبالؒ)

صباہومز کی نئی تشکیل

صباہومز کی ابتدا خاندانی عطیّات پر مبنی خیراتی ادارے کی حیثیت سے کی گئی۔ صباہومز محدود پیمانے پہ کی گئی ایک عاجزانہ کوشش تھی جواب عالمی معیار کے مطابق خودمختار ادارے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ صباہومز کو بورڈ آف ڈائریکٹرز، بورڈ آف ایڈوائزرز اور بورڈآف ٹرسٹیز کی راہنمائی اور مدد حاصل ہے۔ یہ تمام لوگ اپنے شعبوں کے ماہرین ہیں۔ جن کے پاس وسیع علم اور تجربہ ہے۔ صباہومز بین الاقوامی اداروں کے ساتھ مل کے کام کرتا ہے او رپاکستان کے علاوہ امریکہ، برطانیہ اور کویت میں رجسٹرڈ ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ جرمنی، کینیڈا، ناروے، قطر، سعودی عرب اور دبئی میں رجسٹرہو گا۔ آسٹریلیامیں رجسٹریشن کا عمل جاری ہے۔

آج صباہومز بین الاقوامی معیار کا خودمختار ادارہ بن چکا ہے۔ یہ نہ صرف یتیم بچّیوں کی فلاح و بہبود میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے بلکہ ضرورت مند افراد جن میں بچے، بوڑھے اور خواتین شامل ہیں، کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ یہ عزّم نہ صرف پاکستان بلکہ دیگر ممالک کے لئے بھی ہے۔ جہاں ایمرجنسی ریلیف اور دیرپا ترقی کے منصوبے زیر غور ہیں۔صباہومز ایک منفرد منصوبہ ہے جو متعدد یتیم بچیوں کی زندگی میں انقلاب لاچکا ہے۔ ان کے خواب سچ کر دکھانے میں اپنا کردار ادا کر رہاہے۔ صباہومز نے یہ مقام سخت محنت اور جدوجہد کے بعد حاصل کیاہے۔ یہ منصوبہ انتہائی مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکاہے جو سماج کے سب سے کمزور اور نظرانداز حصے یعنی یتیم بچیوں کی فلاح کے لئے کام کر رہا ہے۔ جلد ہی یتیم بچوں (لڑکوں) کے لئے ایساہی گھر بنانے کا ارادہ ہے۔

بچیوں کے بارے اہم معلومات

صباہومز کی بچیوں کی غالب اکثریت A , A+اور B+ گریڈ لیتی ہیں۔ جب کہ

زیادہ تر بچیاں اپنی کلاس میں مانیٹر ہیں۔ قومی سطح پر منعقد ہونے والے کراٹے کے حالیہ مقابلوں میں صبا گرلز نے دو سونے کے تمغے، ایک چاندی کا تمغہ اور ایک کانسی کا تمغہ جیتا۔ اس مقابلے میں پاکستان کے چاروں صوبوں سے بچیوں نے حصّہ لیا۔ نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں یہ جذبہ اور اعتماد صبا ہومز کے پروگرام کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

میں صغیر احمد اسلم بحیثیت بانی چیئرمین صبا ٹرسٹ، صبا ہومز اور میری شریک حیات مسز بشریٰ سلطانہ اسلم بڑی خوشی سے چاہیں گے کہ ایسے لوگ جو انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں خاص طور پر جو یتیم بچّیوں اور بچّوں کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، وہ آئیں اور اس عظیم اور منفرد منصوبے کا حصّہ بنیں اور اپنی صلاحیتوں کے بل پہ قائدانہ کردار ادا کریں۔

باب ششم

متفرق واقعات

میں آپ سے اپنی زندگی کے چند خاص واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں جو نہ صرف بہت دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ میری کامیابی اور عزّت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ اسلامی اصولوں کو اپنی زندگی کا حصّہ بناؤں۔

دوست کا وقت پر نہ آنا

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ابھی امریکہ نہ گیا تھا۔ میں اپنے دوست عبدالرّشید کی وجہ سے بہت پریشان تھا کیونکہ وہ وقت پر کبھی نہ پہنچتا۔ ایک آدھ گھنٹہ لیٹ ہونا اس کے لئے معمول کی بات تھی۔ یوں ہم نے جہاں بھی جانا ہوتا اکثر دیر ہو جاتی۔ وہ جب بھی میرے پاس دیر سے پہنچتا تو میرا پارہ چڑھ جاتا اور میں اس کو بے نقط سناتا۔ آخر میں ہمیشہ وہ میرے ساتھ وعدہ کرتا کہ آئندہ لیٹ نہیں آئے گا مگر اس کا یہ وعدہ کبھی وفا نہ ہوا۔ اگلے دن وہ پھر ویسا ہی کرتا۔ اس صورت حال نے مجھے بہت زچ کیا۔ میں نے اس کا علاج سوچنا شروع کر دیا۔

چند دن کے بعد میرے دوست عبدالرّشید نے وقت پہ آنا شروع کر دیا حتّٰی کہ وہ وقت سے کچھ دیر پہلے پہنچ جاتا۔ اب ہمارے درمیان لڑائی وغیرہ بند ہو چکی تھی۔ میرے دوست کو علم بھی نہ تھا کہ لڑائی کیوں اور کیسے بند ہو گئی۔ آخر ایک دن مجھے کہنے لگا

”یار صغیر! کیا بات ہے۔ پہلے ہم روز لڑتے تھے تو بڑا مزہ آتا تھا اب ایسی کیا بات ہو گئی کہ لڑنا چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے کہا: ”کچھ نہیں یار، اب میں نے خود کو سمجھا لیا ہے۔“

دراصل میں نے اسے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے بلانا شروع کر دیا تھا۔

اصول پسندی

یہ 1960ء کی بات ہے میں کراچی سے امریکہ جا رہا تھا۔ جب میری فلائٹ کا وقت ہوا تو میں بورڈنگ کے لئے ٹرمینل کے اندر گیا۔ وہاں پہ کسٹم کے کچھ اہلکاروں نے جب میرا امریکی پاسپورٹ دیکھا تو مجھے رازداری سے ایک طرف لے گئے۔ کہنے لگے کہ آپ کے پاس امریکن پاسپورٹ ہے۔ آپ ہمیں کسٹم فری شاپ سے ایک بوتل شراب کی لا دیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جناب! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ایک تنک کر بولا "کیوں نہیں کر سکتے۔ جبکہ ہم پیسے بھی دے رہے ہیں۔" میں نے کہا کہ جناب نہ تو میں شراب پیتا ہوں اور نہ ہی آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں اپنی بات پہ قائم رہا۔ انھوں نے کہا چلو ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس اس بات کا اختیار ہے کہ ہم کسی کو باہر جانے سے روک سکیں۔ ہم کوئی بہانہ بنا کے آپ کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ جو مرضی کر لو، میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مجھے بہت پریشان کیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں یہ فلائٹ مس کر دوں گا۔ مگر میں چونکہ حق پہ تھا اس لئے میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ بالآخر انھوں نے بالکل اس وقت میری جان چھوڑی جب جہاز کے دروازے بند ہونے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ میں بڑی تیزی سے جا کے جہاز میں سوار ہوا۔ میں اپنی فلائٹ چھوڑنے پہ تیار ہو گیا مگر ان کا ناحق مطالبہ تسلیم نہ کیا۔

رشوت ستانی

جب ہمارا پہلا کنٹینر امریکہ سے پاکستان آیا تو اس کنٹینر میں کپڑے، جوتے اور دیگر سامان تھا جو غریب لوگوں میں تقسیم کی غرض سے منگوائے گئے تھے اور یہ کسی کے

خون پسینے کی کمائی میں سے تھے۔ قانون کے مطابق کسٹم حکام پورے کنٹینر کا دس فیصد کھول کے چیک کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ صباٹرسٹ کا منیجر ندیم روزانہ پورا دن ڈرائی پورٹ پہ گزارتا۔ ان کے قانونی تقاضے پورے کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا رہتا مگر وہ لوگ کنٹینر بغیر رشوت کے چھوڑنے پہ تیار نظر نہیں آتے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے ہر مرتبہ بہانہ نیا ہوتا۔ کبھی کہتے فلاں افسر کے دستخط باقی رہتے ہیں، کبھی کہتے آج فلاں افسر نہیں آیا وغیرہ۔ اس عرصے میں وہ دس فیصد کے بجائے پورا کنٹینر کھول کے کھنگال چکے تھے مگر سامان کے کاغذات میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمارا کنٹینر چھوڑنے پہ آمادہ نہ تھے۔ ان کے کئی لوگ کھلّم کھلا کہہ چکے تھے کہ اگر خرچہ پانی دیں تو آپ کا کنٹینر آپ کو فوراً مل جائے گا مگر میں نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ہم رشوت نہیں دیں گے۔

جب اس صورت حال کو کافی عرصہ گزر گیا تو میں تنگ آگیا نہ صرف ہمارے منصوبے ادھورے پڑے تھے بلکہ کنٹینر کا کرایہ بھی روزانہ بڑھتا جارہا تھا کیوں کہ اس کے اوپر ہمیں جرمانہ ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ جب تک ہم کنٹینر خالی کرکے واپس نہ بھجواتے، اس کا جرمانہ بڑھتا جاتا۔ اس صورت حال سے عاجز آکر میں خود ان کے دفتر پہنچا۔ میں نے انھیں کہا کہ آپ کو پتہ ہے کہ اس میں غریب لوگوں کے لئے کپڑے، جوتے، خوراک، ادویات اور دیگر ضروری سامان ہے جو لوگوں تک پہنچانے میں آپ رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نہیں چاہتے کہ یہ سامان پاکستان کے لوگوں تک پہنچے تو کوئی بات نہیں میں یہ سامان کسی دوسرے ضرورت مند ملک بھجوا دیتا ہوں وہاں بھی اس کی سخت ضرورت ہو گی لیکن اس سے پہلے میں وزیراعظم کے دفتر میں فون کرکے آپ لوگوں کی کارکردگی کی تعریف ضرور کروں گا کہ آپ لوگ کیسے غریب لوگوں کی مدد کر رہے ہیں.....؟

میں دل کی بھڑاس نکال کے اپنے دفتر پہنچا ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ ان لوگوں نے سامان ہمارے حوالے کر دیا ہے۔

گیس میٹر

اسی طرح کی مشکل ہمیں گیس کا کنکشن لینے میں بھی ہوئی۔ محکمے کے حکام رشوت کے بغیر میٹر لگانے سے انکار کر رہے تھے۔ جب کہ میں رشوت کے سخت خلاف تھا۔ انھیں اگر فون کرتے تو وہ کہتے اپنے منیجر کو ہمارے دفتر بھیج دیں، کام ہو جائے گا۔ ہم نے تقریباً دس سال تک گیس کا کنکشن اسی وجہ سے نہیں لگوایا اور سلنڈر کی گیس استعمال کرتے رہے۔ ہمارے آس پاس کے تمام گھروں میں انھوں نے گیس کے کنکشن دے دیئے تھے۔ بالآخر ان کو شرم آئی انھوں نے خود ہی ہمیں کنکشن لگا دیا۔ اگر وہ اس وقت بھی کنکشن نہ لگا کے دیتے تو ہم سلنڈر کی گیس استعمال کرتے رہتے مگر رشوت نہ دیتے۔

وقت کی پابندی

ایک مرتبہ پاکستان سے ہمارے ایک مہمان امریکہ تشریف لائے۔ میں ان کا نام نہیں لکھنا چاہتا کیونکہ ایک تو وہ بہت معروف شخصیت ہیں دوسرا ان کے ساتھ ابھی تک ہمارے اچھے تعلّقات ہیں۔ میں نے انھیں اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور چند دوسرے مہمانوں کو بھی مدعو کیا۔ میں نے سب مدعوئین سے مشورہ کیا اور ڈنر کا وقت آٹھ بجے رکھا۔ مقررہ وقت پہ سارے مہمان پہنچ گئے سوائے ان کے جن کے لئے محفل سجائی گئی تھی۔

سب لوگ ہی میری اس عادت سے واقف تھے کہ میں سختی سے وقت کی پابندی کا قائل ہوں۔ چونکہ اس تقریب کا میزبان میں ہی تھا تو سب لوگوں نے میری طرف دیکھا کہ دیکھیں اب کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ میں نے وہی کیا جو میں ایسے موقعوں پہ

کرتا آیا تھا۔ میں نے کھانا لگانے کی ہدایت کی۔ میرے بے تکلّف دوستوں نے مشورہ دیا کہ مہمان خصوصی کا انتظار کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ میری پیاری بیوی کی خواہش بھی یہی تھی کہ ہم ان کا انتظار کریں اور ان کے آنے پر کھانا لگایا جائے۔ میں نے کہا کہ ہم ایک فرد کے لئے ان لوگوں کو سزا نہیں دے سکتے جو وقت پر پہنچے ہیں۔

جس وقت وہ مہمان پہنچے تو ہم ڈنر شروع کر چکے تھے۔ وہ مہمان جب ساری صورتحال سے آگاہ ہوئے تو حیران رہ گئے۔ انھوں نے غالباً وقت کی پابندی کا ایسا مظاہرہ پہلی مرتبہ دیکھا تھا کیوں کہ ہمارے پیارے وطن پاکستان میں زیادہ تر لوگ وقت کی پابندی کو ایک غیر ضروری چیز تصوّر کرتے ہیں۔ ایک عام آدمی سے لے کر ہمارے حکمرانوں تک سب ہی اپنے کام وقت کے مطابق نہیں، اپنی مرضی کے مطابق سرانجام دیتے ہیں۔ حتّٰی کہ امریکہ میں رہنے والے پاکستانی بھی وقت کی پابندی کو ایک غیر ضروری عنصر خیال کرتے ہیں۔

میرے دوست صفّی قریشی

امریکہ میں ہفتے کے اختتام پر فنکشن، پارٹی اور کھانے کی دعوتیں معمول کی بات ہے۔ معاشی مسائل نہ ہونے کی وجہ سے لوگ سماجی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پہ ہم نے کافی سارے دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ ان میں ہمارے بڑے خاص دوست صفّی قریشی بھی شامل تھے۔ صفّی قریشی امریکہ کی معروف تجارتی شخصیت ہیں اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان سے ملاقات کا وقت لینا ایک دشوار کام ہے۔

ڈنر والے دن تمام لوگ وقت پہ آگئے مگر صفّی قریشی اور ان کے اہل و عیال نہ پہنچ سکے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق کھانا شروع کرنے کی ہدایت کی۔ سب دوست جو ہم دونوں کے مشترکہ دوست بھی تھے، کہنے لگے کہ صفّی قریشی کا انتظار کرلیں وہ بہت

مصروف رہتے ہیں ابھی آتے ہی ہوں گے مگر میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں کسی فرد واحد کی خاطر اتنے سارے لوگوں کی موجودگی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سب دوستوں نے پھر اصرار کیا کہ وہ ہمارے بڑے خاص دوست ہیں ان کا انتظار کر لیں۔ لیکن میں نہ مانا۔ میں نے مقررہ وقت پہ کھانا شروع کرا دیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صفّی قریشی بھی اہل خانہ کے ہمراہ پہنچ گئے۔ وہاں پہ موجود لوگوں نے مزہ لینے کیلئے صفّی قریشی کو میرے خلاف بہت کچھ کہا (مرچ مسالہ لگایا) کہ ہمارے اصرار کے باوجود صغیر اسلم نے آپ کا انتظار نہیں کیا وغیرہ۔

صفّی قریشی نے یہ کہہ کر سب کے منہ بند کر دیئے "سنو دوستو! یہی وجہ ہے کہ میں صغیر اسلم کو اتنا چاہتا ہوں اور ان کی اتنی عزّت کرتا ہوں۔"

(Listen Guys! That's why I love and respect Saghir Aslam, He is a man of principles.)

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی میٹنگ

میں پہلی مرتبہ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کا صدر بنا تو میں نے تمام عہدے داروں کی میٹنگ بلائی۔ شرکاء کو ملاقات کا وقت بتایا اور تاکید کی کہ مقررہ وقت پہ پہنچ جائیں۔ مقرّر کردہ وقت پہ صرف ڈاکٹر مزّمل صدیقی اور شکیل صدیقی پہنچے۔ میں نے ڈاکٹر مزّمل صدیقی صاحب کو کہا کہ میرا خیال ہے میٹنگ شروع کی جائے۔ ڈاکٹر مزّمل صدیقی نے کہا کہ ابھی دوسرے لوگ نہیں پہنچے، ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہیے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں اور آپ کی بے پناہ عزّت کرتا ہوں لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سب لوگوں نے متفقہ طور پر مجھے صدر منتخب کیا ہے تو میں اسلامی اصولوں کے مطابق چلوں گا۔ سب لوگوں کو میٹنگ کا وقت معلوم ہے اور اگر وہ نہیں پہنچے تو یہ ان کا قصور ہے۔"

غرضیکہ میٹنگ اپنے مقررہ وقت پہ شروع ہو کے ختم ہو گئی۔ باقی عہدیدار اس وقت پہنچے جب میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ میٹنگ کس وقت شروع ہو گی؟ انھیں جب یہ اطلاع دی گئی کہ میٹنگ ختم ہو چکی ہے تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ اس دن کے بعد زیادہ تر لوگ وقت پہ ہی میٹنگ میں آ جاتے۔

سیرت کانفرنس ﷺ

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے زیر اہتمام تقریباً ہر دوسرے سال سیرت کانفرنس ﷺ کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں پوری دنیا سے نامور مسلمان علماء کو بلایا جاتا ہے۔ امریکہ سے بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ میں اس وقت بطور صدر اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی خدمات سر انجام دے رہا تھا۔

جب سیرت کانفرنس ﷺ کیلئے دعوت نامے چھپوائے جا رہے تھے تو میں نے دعوت نامے پہ وقت کے اندراج کیلئے ڈاکٹر صدیقی صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا صبح آٹھ بجے کا وقت مناسب ہے۔ میں نے دعوت نامے پہ آٹھ بجے کا وقت درج کرنے کی ہدایت کر دی۔ جب دعوت نامے کا ڈرافٹ تیّار ہو کر آیا تو میں نے پھر پوچھا۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب نے کہا کہ صغیر بھائی! چھٹی کا دن ہو گا لوگ دیر سے اٹھیں گے ایسا کریں ساڑھے آٹھ بجے کر لیں۔ میں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں اور سیرت کانفرنس ﷺ کا وقت ساڑھے آٹھ بجے کرنے کی ہدایت کر دی۔ جب حتمی ڈرافٹ آیا تو ایک مرتبہ پھر میں ڈاکٹر صدیقی صاحب کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ جناب! اب ہم دعوت نامے چھپوانے لگے ہیں، کیا وقت رکھا جائے؟ انھوں نے کہا کہ آپ نو بجے کر لیں۔ دعوت ناموں پہ حتمی طور پر کانفرنس شروع کرنے کا وقت نو بجے لکھ دیا گیا۔

مقررہ تاریخ پہ جب ہال کی گھڑیوں نے نو بجنے کا اعلان کیا تو ہال میں صرف چند لوگ موجود تھے اور شرکاء کی بڑی تعداد ابھی نہیں پہنچی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مزمّل

صدیقی صاحب سے درخواست کی کہ کانفرنس شروع کی جائے کیونکہ وقت ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ صغیر بھائی! ابھی لوگ نہیں پہنچے، تھوڑا انتظار کر لیں۔ میں نے عرض کیا کہ محترم ڈاکٹر صاحب! ہم نے دعوت ناموں پہ وقت کا اندراج دو مرتبہ تبدیل کیا۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ سیرت کانفرنس نو بجے شروع ہو گی اس لئے ہمیں اپنے مقررّہ وقت پہ ہی سیرت کانفرنس ﷺ شروع کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب ایک ذہین و فطین انسان ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صغیر بھائی! ابھی تو ہمارے قاری عبد الباسط صاحب بھی نہیں آئے، جنھوں نے تلاوت کرنی ہے اور انھیں ہم نے مصر سے بلا رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ مسلم دنیا کی ایک اہم شخصیت ہیں، آپ تلاوت سے آغاز کر دیں۔ پھر میں بھی ایک مسلمان ہونے کے ناطے تلاوت کر سکتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سیرت کانفرنس ﷺ اپنے وقت پہ شروع کرنے کیلئے قائل کر لیا اور سیرت کانفرنس ﷺ اپنے مقررہ وقت پہ شروع کی گئی۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا چلوں کہ اس سیرت کانفرنس میں آٹھ ہزار (8000) سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وقت بھی جواباً ان کو بے توقیر کرنے پہ تلا رہتا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں بھی ایسے افراد موجود ہیں جو وقت کی پابندی کرتے ہیں مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ہم پاکستانی، امریکہ پہنچ کے بھی نہیں سدھرے۔ اگر تقریب کسی خالص امریکی کی جانب سے ہو تو اس میں پاکستانی بھی پورے وقت پر پہنچ جاتے ہیں جب کہ اگر کسی پاکستانی کی تقریب ہو تو وہی لوگ اس میں کئی گھنٹے کی تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ یہ افسوسناک بات ہے۔

نماز عید

اسی طرح کی صورتحال ایک مرتبہ عید کے موقع پر پیدا ہوئی۔ ہم نے لوگوں

کی باہمی مشاورت سے نماز عید کا وقت طے کیا لیکن عید والے دن کچھ لوگ ابھی تک عید کی نماز کیلئے نہیں آئے تھے۔ میں نے حسب عادت کہا کہ اب ہمیں نماز شروع کر دینی چاہیے۔ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اور میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا کہنے لگے "صغیر بھائی! تھوڑا انتظار کر لیں۔ باہر موجود انتظامیہ کے لوگ مجھے بتا رہے ہیں کہ ٹریفک جام ہے اور لوگ وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔" میں نے اصرار کیا اور کہا کہ مجھے افسوس ہے لیکن وقت کی پابندی لازم ہے چوں کہ مقررہ وقت ہو چکا ہے تو نماز اپنے وقت پہ ہی ادا کی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

اسلام ہمیں وقت کا پابند ہونے کا حکم دیتا ہے۔اس کی واضح مثال نماز کو اس کے مقررہ وقت پہ ادا کرنا ہے۔ اگر نماز کا وقت گزر گیا تو نماز قضا شمار ہو گی۔ ہم بہت سے معاملات میں دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے ہیں جس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہم وقت کی قدر نہیں کرتے۔ میں وقت ضائع کرنے کا سخت مخالف ہوں۔ وقت کی پابندی ایک ایسا فارمولا ہے جس پر اگر عمل کیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی انسان کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

جب لوگ ہمیں کسی دعوت میں بلاتے ہیں تو ہمیں کہتے ہیں کہ ہم نے تمام لوگوں کو اتنے بجے بلا رکھا ہے تاہم آپ اس کے دو گھنٹے بعد آ جائیں جو در حقیقت تقریب شروع کرنے کا وقت تھا۔ کیونکہ سب لوگوں کو علم تھا کہ ہم لوگ مقررہ وقت پہ پہنچ جاتے ہیں۔

میں وقت کا پابند کیسے بنا؟

میں بچپن میں باقی بچوں جیسا ہی تھا جو اٹھنے میں دیر لگاتے ہیں۔ماں جی مجھے آ کے اٹھاتیں تو میں کہتا جی ابھی اٹھتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں پھر سو جاتا۔ماں جی پھر آتیں اور مجھے اٹھاتیں میں پھر وہی حرکت کرتا۔ماں جی کو کہتا جی ابھی اٹھتا ہوں، یہ کہہ کر میں پھر سو

جاتا۔ ایسا کئی مرتبہ ہوتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ابّاجی بھی میرے اس معمول میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں لمبی تان کے سو رہا تھا۔ ماں جی حسب معمول کئی مرتبہ مجھے اٹھا چکی تھیں۔ ابّاجی نے کہا اب میں اسے اٹھاتا ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ سے صاحبزادے وقت پہ اٹھیں گے۔ وہ آئے، مجھے دونوں کانوں سے پکڑ کے کھڑا کیا اور دونوں گالوں پہ ایک ایک چانٹا رسید کیا اور پوچھا!

"کی خیال آپت" (کیا خیال ہے بیٹا)

پت کا خیال تھا کہ آئندہ مجھے وقت پہ اٹھنا چاہیے۔ اس دن کے بعد میں پہلی آواز پہ اٹھ جاتا اور ہمیشہ ہر جگہ وقت سے پہلے پہنچ جاتا۔

بلا عنوان (ایک دلچسپ واقعہ)

یہ واقعہ بہت دلچسپ ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ہماری اسلامک سوسائٹی کے ایک صاحب کافی متقّی اور پرہیز گار ہیں۔ داڑھی مجھ سے بھی لمبی رکھی ہوئی ہے اور غالباً خود کو بہت زیادہ نیک اور پارسا سمجھتے ہیں۔ (واللہ علم)

ہم ایک دن مسجد سے اکٹھّے نماز پڑھ کے باہر نکلے تو آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ انھوں نے میرے کام کے بارے میں کافی کچھ پوچھا۔ جب میں نے ان کو اپنے مختلف فلاحی منصوبوں کے بارے میں بتایا تو انھوں نے بڑی فراخ دلی سے تعریف کرنا شروع کر دی۔ انھوں نے ہمارے پاکستان کے مختلف منصوبوں کے علاوہ دوسرے ممالک (بوسنیا، چیچنیا، کشمیر، افغانستان، فلسطین، سری لنکا، انڈیا) وغیرہ کے منصوبوں کی بھی تعریف کی۔ کہنے لگے "آپ پاکستان میں سالانہ تین چار چکّر لگاتے ہیں اور اپنے منصوبوں کو دیکھتے ہیں۔ آپ نے تعلیم کے میدان میں اتنا اچھا کام کیا ہے اور صحت کے شعبے میں آپ نے فری ڈسپنسری کھولی ہے۔ مختلف ہسپتالوں میں ایمبولینسز بھی آپ نے مہیا کی

ہیں۔ یہ سب کچھ بہت متاثّر کن ہے۔ آپ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ ہمیں آپ پر بے حد فخر ہے کیوں کہ یہ کام آپ بغیر کسی ستائش کے سالہا سال سے کر رہے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے چندہ بھی نہیں مانگا۔ لگتا ہے آپ جو کچھ بھی کماتے ہیں، غریبوں پہ خرچ کر دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ نے اتنے کپڑے، خوراک اور ادویات لوگوں میں تقسیم کی ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ آپ اتنا اچھا کام کر رہے ہیں۔"

میں نے درمیان میں کئی مرتبہ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے مجھے موقع نہ دیا اور مسلسل بولتے رہے۔

"آپ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی اور اورنج کریسنٹ سکول میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ صغیر بھائی! میں تو اعلانیہ کہتا ہوں کہ آپ نے جنت میں اپنے لئے ایک بہت اچھا گھر بنا لیا ہے۔ ہمیں آپ پہ فخر ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہمیں آپ کے نقش قدم پہ چلنا چاہیے۔"

انھوں نے تھوڑی دیر توقّف کیا تو مجھے بولنے کا موقع مل گیا۔ میں نے ان کی معلومات میں اضافے کی غرض سے بیان کیا

"بھائی صاحب! ہم تو کرسمس سے پہلے عیسائیوں کیلئے خاص کیمپ لگاتے ہیں اس میں ہم انھیں تحائف کے علاوہ کپڑے، کھانا اور دوسری چیزیں دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے عیسائی بھائیوں کیلئے مختلف علاقوں میں کمپیوٹر سنٹر بھی قائم کئے ہیں۔ عیسائیوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں مثلاً ہندوؤں اور سکھّوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔"

اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وہ صاحب اچھل پڑے۔ کہنے لگے "استغفر اللہ" (Allah Forgive)، میں تے سمجھ ریا سی توں چنگا بندہ ایں۔" (میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اچھّے آدمی ہو)۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا.....۔

دلیپ کمار اور سائرہ بانو

ایک مرتبہ میرے چند دوستوں نے مجھے ایک تقریب میں شامل ہونے کیلئے اصرار کیا۔ جس میں ہندوستان سے نامی گرامی فلمی ستارے شرکت کر رہے تھے۔ میں عموماً ایسی تقاریب میں نہیں جاتا اس لئے میں نے معذرت کرلی مگر جب انھوں نے بتایا کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بوسنیا(Bosnia) کے متاثّرین جنگ کو بھیجی جائے گی تو میں فوراً تیار ہو گیا۔

جب ہم لوگ تقریب میں پہنچے تو مجھے دلیپ کمار اور سائرہ بانو کی میز پہ ان کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ دلیپ کمار کو سٹیج پر بلوا کر بوسنیا کے متاثّرین کے لئے عطیّات اکٹھّے کرنے کی اپیل کے لئے بلایا گیا تو اس وقت سائرہ بانو نے میرے ساتھ تکلفاً بات چیت شروع کر دی۔ کہنے لگیں ”آپ نے میری فلاں فلم دیکھی ہے؟“میں نے نفی میں جواب دیا تو اپنے میاں کے بارے میں پوچھا کہ ”آپ نے ان کی فلاں فلم دیکھی ہے.....؟“میں نے کہا”بات کچھ یوں ہے محترمہ کہ میں نے آپ کی اور آپ کے میاں کی کوئی فلم نہیں دیکھی۔ در حقیقت مجھے فلمیں دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں ایسی چیزوں کو وقت کا ضیاع سمجھتا ہوں۔“ سائرہ بانو نے مجھے حیرانگی سے دیکھا اسے شاید مجھ سے اس صاف گوئی کی توقّع نہ تھی۔

جب دلیپ کمار اپنی سیٹ پہ واپس آئے تو سائرہ بانو نے کہا کہ میں آپ کو ایک انتہائی دلچسپ انسان سے ملواتی ہوں، جنھوں نے ہماری ایک بھی فلم نہیں دیکھی۔ پھر انھوں نے ہمارا آپس میں تعارف کروایا۔

سائرہ بانو نے مجھے کہا کہ ”صغیر بھائی ! ہم نے کبھی آپ جیسا شخص نہیں دیکھا جس نے ہماری ایک بھی فلم نہ دیکھی ہو۔ خاص طور پر پاکستانی، کیونکہ پاکستانی لوگ ہماری خصوصاً میرے میاں کی فلموں کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ ان دونوں نے کہا کہ آپ

سے ملنا ہمارے لئے اعزاز کی بات ہے۔ ہم آپ کے بارے میں مزید جاننا چاہتے ہیں۔ آپ براہِ مہربانی ہمارے گھر ضرور تشریف لائیے گا۔ انھوں نے مجھے اپنے ذاتی فون نمبر دیئے اور انڈیا آنے کی دعوت دی۔

دراصل ایسا نہیں تھا کہ میں بن رہا تھا بلکہ میں نے واقعی ان کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں اور کام کرنا مجھے دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ مرغوب ہے ورنہ میری بیگم اور بیٹیاں فلم دیکھنے جاتی رہی ہیں میں نے ان کو کبھی منع نہیں کیا۔ ہاں میں اصرار کے باوجود ان کے ساتھ کبھی فلم دیکھنے نہیں گیا۔

صبرو تحمل

میری والدہ محترمہ انتہائی صابر خاتون تھیں۔ میں نے ان کے صبر و تحمل کی عادت کو ہوبہو اپنے مزاج کا حصہ بنایا جس نے مجھے بے حد فائدہ پہنچایا اور کامیابی کی طرف میرے سفر کو آسان بنایا۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ہم ہر دوسرے سال اسلامک سوسائٹی کی طرف سے سیرت کانفرس ﷺ کا انعقاد کراتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر سیرت کانفرنس ﷺ کو منعقد کرانے کا اہتمام ناٹس بیری فارم (Knotts Berry Farm) کے قریب واقع ایک ہوٹل، بوئنا پارک (Buena Park) میں کیا گیا۔ میں اس وقت سوسائٹی کا صدر تھا۔

کانفرنس ابھی شروع ہوئی تھی کہ ایک شخص نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ ہماری سوسائٹی کے ایک رکن تھے۔ انھوں نے بلند آواز میں پروگرام پہ کچھ اعتراضات جڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پروگرام صرف امیر لوگوں کے لئے ہے کیوں کہ اس میں بینکوئٹ ہال کا ٹکٹ اور دوپہر کے کھانے کا خرچ بہت زیادہ ہے اور ایک امیر شخص ہی یہ سارے اخراجات برداشت کر سکتا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر اس کے بعد انھوں نے مجھے

براہِ راست نازیبا کلمات کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ ایسی باتیں کر رہے تھے جو ضبط تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ میں خاموشی کے ساتھ سب سنتا اور برداشت کرتا رہا۔ انھیں خاموش کرانے کے لئے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے لیکن اتنے سارے لوگوں کی توجّہ پا کر وہ چپ ہونے کے بجائے شیر ہو گئے۔ ان کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

لوگوں نے سمجھایا کہ بھلے مانس! یہ تو دیکھو کہ آپ اتنی دیر سے صغیر اسلم کو برا بھلا کہہ رہے ہو لیکن وہ بالکل خاموش ہے۔ کچھ لوگ انھیں پکڑ کر لابی کے دوسرے کنارے پر لے گئے لیکن دور جا کے بھی انھیں چین نہ آیا اور وہ پہلے سے بھی اونچی آواز میں شور و غل کرنے لگے۔ وہ جیسے جیسے میرے خلاف شدّت سے بولتے گئے میں نے اتنی ہی شدّت سے قرآن پاک پڑھنا جاری رکھا اور دعائیں کرتا رہا کہ غصہ مجھ پر غالب نہ آئے۔ جب میری برداشت ختم ہونے لگی تو میں وہاں سے اٹھ کے باہر آ گیا لیکن انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ حالاں کہ اگر میں چاہتا تو اسی وقت نو سو گیارہ (911) پہ کال کر کے پولیس بلا سکتا تھا مگر میں ضبط کر گیا۔

کچھ دن کے بعد مجھے ان صاحب نے فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت ضروری کام ہے اور یہ کہ میں انھیں سوسائٹی کے دفتر کے بجائے گھر پہ ہی ملوں۔ میں نے ان کی حسب خواہش انھیں گھر پہ بلا لیا۔ وہ شرمندہ سے لگتے تھے۔ میں نے انھیں چائے پلائی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگے

”صغیر بھائی! میں اس دن کے اپنے رویے پہ سخت نادم ہوں۔ میری وجہ سے اس دن سیرت کانفرنس ﷺ میں بدمزگی ہوئی۔ آپ براہ مہربانی مجھے معاف کر دیں۔“ میں نے کہا ”آپ پریشان نہ ہوں میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا ہے۔“ انھوں نے کہا کہ ”اس دن میں نے آپ کو برا بھلا کہا آپ کو گالیاں دیں لیکن آپ آگے سے بالکل

خاموش رہے۔ آپ نے اتنا صبر کیسے کیا؟ “

میں یہ سوال سن کے حیران رہ گیا۔ کیا وہ نہ جانتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے آقا حضور نبی کریم ﷺ نے پوری زندگی کیسے گزاری۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی زندگی صبر و تحمل کا شاندار نمونہ رہی اور بحیثیت مسلمان کیا یہ ہمارا فرض نہیں کہ ہم اس قابل فخر انسان ﷺ کے اسوہ حسنہ پہ عمل کریں۔

میں نے کہا: ”کیوں کہ میں نے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے بارے میں پڑھا ہے کہ انھوں نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا اور میں ایک مسلمان کی طرح اس پہ عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ “

ایثار کی کوشش

ایک مرتبہ میں امریکہ سے پاکستان اپنے منصوبے دیکھنے آ رہا تھا۔ امریکی طیارے کی فلائٹ بنکاک تک تھی جہاں سے میں نے پاکستان کے لئے فلائٹ پکڑنی تھی کیونکہ یہ ایک رابطہ فلائٹ تھی۔ عام طور پر اگر اگلی فلائٹ نے دیر سے جانا ہو تو ہوائی کمپنیاں مسافروں کو رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کر کے دیتی ہیں تاہم میرا معاملہ کچھ مختلف تھا اور مجھے خود اپنی رہائش اور کھانے پینے کا بندوبست کرنا تھا۔

جب میں بنکاک ائرپورٹ پر اترا تو پتہ چلا کہ پاکستان کے لئے جانے والی فلائٹ اٹھّارہ (18) گھنٹے بعد جائے گی۔ اب مجھے اگلے اٹھارہ گھنٹے بنکاک میں ہی گزارنا تھے۔ اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ میں ائرپورٹ سے ٹیکسی لے کے ہوٹل چلا جاتا اور وہاں پہ آرام کرنے کے بعد دوبارہ ائرپورٹ آ جاتا۔ میں نے اس پہ اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگایا تو یہ تین سو (300) ڈالر بنتے تھے۔ پاکستانی روپوں میں یہ اچھّی خاصی رقم تھی۔ میں نے سوچا بجائے اس کے کہ میں یہ رقم اپنے اوپر خرچ کروں اس سے پاکستان میں کسی غریب آدمی کا بھلا ہو جائے گا۔ اتنی رقم میں کسی غریب بچّی کے جہیز یا ولیمہ کا خرچ پورا کیا جا

سکتا تھا یا کم از کم تین ایکڑ زمین کے لئے گندم اور کھاد کا بندوبست کیا جاسکتا تھا یا تین خاندانوں کا مہینے بھر کا راشن خریدا جاسکتا تھا۔

میں نے وہ اٹھّارہ (18) گھنٹے ائرپورٹ پہ ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جس طرح وہ اٹھّارہ گھنٹے گزرے، میں ہی جانتا ہوں۔ کام کرتے، سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اونگھتے، سوتے، جاگتے، ادھر ادھر گھومتے پھرتے، غرض وہ وقت سخت بے آرامی اور تکلیف میں گزرا لیکن میں خوش تھا کہ میں نے وہ تکلیف کسی اچھے مقصد کی خاطر برداشت کی۔

بعد میں جب ایک صاحب کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اسے میری بے وقوفی قرار دیا۔ کہنے لگے

''آپ کی عمر ستّر سال (اُس وقت) ہے اور آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ نے اگر اتنا کمایا ہے تو کس لئے۔ آپ کو اپنے آرام کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔''

انھیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ میں ایسی چھوٹی موٹی تکالیف بآسانی برداشت کر سکتا ہوں کیونکہ اللہ پاک نے مجھے ایسا کرنے کی ہمّت دے رکھی ہے اور یہ تکلیف تو ایک خاص مقصد کی خاطر برداشت کی گئی تھی۔

صبر و تحمل کی انوکھی مثال

میں ایک انوکھا واقعہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ پائے جاتے ہیں اور اللہ پاک کے پاک پیغمبر ﷺ کے رستے پر چلنے سے ہم کتنی تکالیف اور مصائب سے بچ سکتے ہیں۔ آپ یقین کریں واقعہ پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خون خرابہ ہو جاتا۔ میں نے محض اس وجہ سے صبر کیا کیوں کہ سرکار ﷺ نے ایسا کیا۔

میری عادت ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں تو کسی کے گھر نہیں بلکہ ہوٹل میں

قیام کرتا ہوں کیوں کہ میں کسی کے لئے زحمت یا تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ میں اپنی مرضی سے سوتا جاگتا ہوں۔ کسی کے گھر میں رہنے سے میرے اور میزبان کے معمولات متاثر ہوتے ہیں۔

مجھے پاکستان سے ایک آدمی (فرض کریں) چوہدری صاحب نے امریکہ میں اپنے دوست کا رابطہ نمبر دیا اور بے حد تاکید کی کہ میں انھیں جا کے ملوں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا دوست بے حد مخیر ہے اور اس کے اپنے علاقے میں وسیع تعلّقات ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے میں اسے مل لوں گا۔ انھوں نے اپنے دوست کو بھی میرا رابطہ نمبر دے دیا۔ ہم اس دوست کا نام میاں صاحب فرض کر لیتے ہیں۔ اب میاں صاحب نے لمبی فون کالز کرنا شروع کیں۔ وہ تقریباً ہر روز مجھے فون کرتے اور اتنی لمبی بات کرتے کہ میں عاجز آ جاتا۔ وہ مجھے بتاتے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ میاں صاحب کے شہر صبا ہومز کے کام کے سلسلے میں گیا اور میریٹ ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں جب اپنے کام سے فارغ ہوا تو میں نے میاں صاحب کو کال کی۔ انھیں بتایا کہ میں میریٹ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ فون پہ ہی خفا ہونے لگے کہ جب میرا گھر حاضر ہے تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال وہ آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انھوں نے چند لوگوں سے میری ملاقات کروائی۔ جن سے ہم نے صبا ہومز کے بارے میں بات کی۔ واپسی پہ ائرپورٹ چھوڑنے تک وہ بھائیوں کی مانند ناراض تھے کہ میں ان کے پاس ٹھہرنے کے بجائے ہوٹل میں کیوں ٹھہرا۔ میں نے کہا کہ اگلی مرتبہ میں خاص طور پہ آپ کے پاس آؤں گا۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے اسی طرح ناراضگی ختم ہو سکتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بہت سے غیر مسلم میرے قریبی دوست ہیں۔ میں ان سے لاکھوں ڈالر اکٹھّے کر سکتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے مسلمانوں سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ آپ میرے پاس ضرور آیئے گا۔ میں نے ان کے پاس آنے کا وعدہ کر لیا۔

تقریباً ایک سال بعد مجھے کچھ وقت ملا تو میں میاں صاحب کے شہر پہنچا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس علاقے میں ایک بھرپور فنڈ ریزنگ مہم شروع کی جائے۔ میں نے اپنے دوست ٹاڈ شیہ (Todd Shea) اور ان کے بیٹے جیسن (Jaison) کو بھی دعوت دی کہ وہ آئیں اور اس نیک کام کا حصّہ بنیں۔ ٹاڈ مشہور امریکی سنگر (گلوکار) ہے جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان کے بیٹے جیسن ابھی تک غیر مسلم ہیں۔ ٹاڈ اور جیسن نے بذریعہ کار وہاں پہنچنا تھا۔ مجھے میاں صاحب ائرپورٹ سے اپنے گھر لے گئے۔ کچھ دیر بعد ٹاڈ اور جیسن بھی آ گئے۔

دوسرے دن ہمارا پروگرام تھا کہ ہم نے فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ ہم اپنے پروگرام کے مطابق نکل گئے۔ میں میزبان کی گاڑی میں تھا جب کہ ٹاڈ اور جیسن پیچھے اپنی گاڑی میں آ رہے تھے۔ ہمارے میزبان کی گاڑی کے دونوں اشارے مسلسل چل رہے تھے۔ امریکہ میں انھیں ہیزرڈ لائٹس (Hazard Lights) کہا جاتا ہے۔ اب راستے کا چوں کہ ہمارے میزبان کو ہی پتہ تھا اس لئے جیسن اور ٹاڈ ہمارے پیچھے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمیں پچھلی گاڑی سے رکنے کا اشارہ ملا۔ ہم نے گاڑی روکی تو جیسن نے آ کے درخواست کی کہ براہ مہربانی دونوں اشارے بند کریں کیوں کہ جب آپ کسی طرف مڑتے ہیں تو ہمیں بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ اس طرف مڑیں گے۔ یوں ہمیں ایمرجنسی میں مڑنا پڑتا ہے۔ اس سے حادثے کا خطرہ ہے۔" اس کی بات معقول تھی مگر ہمارے میزبان کا ردّ عمل ہمارے لئے غیر متوقّع تھا۔

"بکواس مت کرو اور اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ غرّا کے بولے

"کیا مطلب، آپ پاگل ہو گئے ہیں"؟ جیسن نے حیران ہو کے کہا

میاں صاحب نے جیسن کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ٹاڈ، جیسن اور میں اس کے طرزِ عمل سے ہکّا بکّا کھڑے تھے۔ میں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی مگر ان کا پارہ آسمان پہ

تھا۔ گالیوں کا جواب تلخ جملوں سے دیا گیا۔

"تم لوگ میرے گھر سے اپنا سامان اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔" میاں صاحب چیخ کے بولے۔

ٹاڈ اور جیسن اسی وقت گھر واپس چلے گئے۔

اب میاں صاحب نے مجھ پہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ ٹاڈ اور جیسن سے کہو مجھ سے معافی مانگیں۔ میں نے گھر پہنچ کے ٹاڈ کو کہا کہ یار آپ اسے سوری کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے میزبان نے غلطی کی ہے مگر آپ معافی مانگو گے تو اس سے آپ کی عزّت بڑھے گی۔ ہم یہاں جس مقصد کی خاطر آئے ہیں وہ بخیر و خوبی پورا ہو گا۔

ٹاڈ نے میرے کہنے پہ بادل نخواستہ معافی مانگ لی۔ جیسن نے مجھے کہا کہ آپ کو پتہ ہے ہمارا میزبان زبردست شرابی ہے اس نے مجھے بھی شراب پینے کی دعوت دی تھی۔ اس کی ایک الماری شراب کی بوتلوں سے بھری ہے۔ پچھلی رات یہ بہت دیر تک پیتا رہا۔

اس کی بات میرے لئے ایک شاک تھا۔ میں میاں صاحب کے بارے ایسا نہیں سوچتا تھا۔

ٹاڈ اور جیسن اپنا سامان اٹھا کے ہوٹل چلے گئے۔ میں میاں صاحب کے پاس ہی رہ گیا۔ مجھے اپنے میزبان کی مزید خوبیوں کا پتہ چلا۔ وہ باہر جا کے کسی بے گھر کو پکڑ لاتے۔ اسے کھانا کھلاتے، چند ڈالر دیتے اور مجھے کہتے کہ میں بھی ایسا کروں۔ شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہ رہے تھے کہ وہ کیسے رحم دل اور سخی ہیں۔

اس رات میں کمرے میں جا کے بمشکل سویا ہی تھا کہ اچانک میاں صاحب کمرے میں آ دھمکے۔ مجھے جگا کے کہنے لگے کہ پاکستان میں فلاں بندے سے بات کرو۔ میں نے درخواست کی کہ مجھے اس وقت معاف ہی کیجیے کیوں کہ مجھے صبح جلد اٹھنا ہے۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا اور مجھے صبح جلدی جاگنے کی عادت ہے مگر وہ نہ مانے اور کافی دیر اپنا

شغل جاری رکھا۔ بالآخر وہ کمرے سے باہر گئے تو میں نے سکھ کا سانس لیا مگر یہ سکون عارضی تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ اب کی بار فون پہ ہمارا مشترکہ دوست تھا۔ وہ اسے فخر سے بتا رہے تھے کہ صغیر صاحب میرے ساتھ ہیں اور ہم مل کے یہاں بڑے بڑے پروگرام منعقد کروا رہے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کی یہ بدتہذیبی برداشت کی اور نرمی سے کہا براہ مہربانی مجھے سونے دیں میں نے صبح کام کرنا ہے۔

اگلے دن میں نے ٹاڈ کے ساتھ کچھ لوگوں سے ملنا تھا۔ میں نے اپنے میزبان کو کہا وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں مگر وہ ناراض بیوی کی مانند منہ پھلائے بیٹھے رہے اور انکار کر دیا۔ میں نے بارہا درخواست کی کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں مگر ہر بار انھوں نے رد کی۔ بالآخر ہم لوگ چلے گئے۔ ہم جن لوگوں سے ملے انھوں نے بہت اچھا سلوک کیا اور کہا کہ یہ تعارفی ملاقات ہے۔ اگلی مرتبہ ہم آپ کے لئے عطیّات اکٹھّے کریں گے۔ جب میں گھر واپس پہنچا تو میاں صاحب گویا میرے انتظار میں تھے اور غصے سے بھرّے بیٹھے تھے۔ اب انھوں نے مجھ سے انکوائری شروع کر دی۔ کہنے لگے کہ مجھے بتاؤ تمہیں کتنے پیسے ملے ہیں میں نے کہا کہ جناب ابھی یہ محض تعارفی ملاقات تھی۔ عطیّات بعد میں اکٹھّے کیے جائیں گے۔

وہ کہنے لگے ”جھوٹ مت بولو۔“

میں نے کہا” جناب! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”اچھّا تم اس سے پہلے کبھی ٹاڈ کی بیوی سے ملے ہو؟“

میں بھونچکارہ گیا

”نہیں، میں اس سے کبھی نہیں ملا۔“

فرمانے لگے: ”مجھے کیوں ساتھ لے کر نہ گئے۔“

"میں نے آپ کو کہا تھا مگر ساتھ چلنے پہ آپ تیار نہ تھے۔"

وہ منہ بنا کے بولے "کیوں کہ مجھے اچھے لفظوں میں دعوت نہیں دی گئی تھی۔"

میں نے ان سے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس مرتبہ میں نے احتیاطاً کمرے کو اندر سے بند کر دیا تاکہ کوئی بغیر اجازت اندر نہ آسکے۔

آدھی رات کے بعد اچانک دروازے پہ دستک شروع ہو گئی۔ میں ہڑبڑا کے بیدار ہوا۔ باہر میاں صاحب تھے جو دروازہ کھولنے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔ انھوں نے گالیاں بکنا شروع کر دیں اور کہا کہ دروازہ کھولو۔ اب میں گالیوں کا کیا جواب دیتا۔ میں نے کہا "جناب! میں تھکا ہوا ہوں، مجھے آپ سونے دیں۔" انھوں نے دستک دینا بند نہ کیا اور زور زور سے دروازہ بجانے لگے، ساتھ مغلّظات بکتے رہے۔ میرے اندر آندھیاں چلتی رہیں مگر میں صبر کر کے لیٹا رہا۔ کافی دیر دروازہ پیٹنے کے بعد انھوں نے کہا "اگر دروازہ نہیں کھولو گے تو میں پولیس بلوا لوں گا۔"

میں نے تنگ آ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی انھوں نے گالیاں بکنا اور شور کرنا شروع کر دیا۔ گالیاں دیتے اور پوچھتے کہ مجھے بتاؤ کس کس سے ملے ہو اور کتنے پیسے لیے ہیں؟ ان کی گالیاں ایسی تھیں کہ قلم لکھتے ہوئے شرما جائے۔

میرا دل چاہا کہ میں ان کا سر پھوڑ دوں یا اپنا۔ ذلت کے احساس نے میرا چہرہ سرخ کر دیا۔ ایسا ناروا سلوک میرے ساتھ کبھی نہ ہوا تھا۔ قریب تھا کہ میں برداشت ہاتھ سے کھو بیٹھتا..... معاً مجھے ایک خیال آیا اور صبر دھیرے دھیرے میرے اندر اترا اور آہستگی سے میرے پورے وجود کو ڈھانپ لیا۔

اسی اثناء میں میاں صاحب پاکستان میں کسی کا فون ملا چکے تھے۔ دوسری طرف چوہدری صاحب تھے۔ چوہدری صاحب کو کہا "دیکھو یہ جھوٹا مکّار، فریبی میرے سامنے

بیٹھا ہے اور بالکل خاموش ہے۔ یہ جھوٹا ہے اس لئے خاموش ہے۔"

وہ ان کے سامنے مجھے گالیاں دینے لگے۔

اور میں واقعی خاموش تھا۔ خاموشی کی وجہ وہ خیال تھا جو میرے اندر در آیا تھا اور جس نے میری پلکیں بھگو دی تھیں۔ اب میں ایک مختلف صغیر اسلم تھا جو کسی بھی قسم کی زیادتی برداشت کرنے پہ تیار ہو چکا تھا۔ میں نے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ جو سورتیں مجھے یاد تھیں، وہ پڑھنا شروع کر دیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں یہ وار بھی سہہ گیا تو وہ یکدم بولے "چلو ابھی میرے گھر سے دفع ہو جاؤ۔"

میں نے بے بسی سے کہا "اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ یہاں سے کوئی بس ملے گی نہ ٹیکسی۔ میں یہاں سے کیسے جاؤں گا؟"

انھوں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" انھوں نے پھر سے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

بالآخر میں نے ٹاڈ کو فون کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے یہاں سے لے جائے۔ ٹاڈ کا ماتھا ٹھنکا، کیوں کہ اتنی رات گئے اسے فون کرنا غیر معمولی بات تھی۔ نتیجتاً جب ٹاڈ آیا تو اس کے ساتھ پولیس کی تین گاڑیاں بھی تھیں۔

اب پولیس اور ٹاڈ نے مجھ پہ زور ڈالنا شروع کیا کہ میں میاں صاحب کے خلاف رپورٹ درج کراؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔ امریکہ میں قانون ہے کہ آپ کسی کی بے عزّتی کرنے پر جیل جا سکتے ہیں۔ میں بڑی آسانی سے اپنی بے عزّتی، ناروا سلوک اور دی گئی گالیوں کا بدلہ چکا سکتا تھا مگر میں تو اس خیال کے زیر اثر تھا جو مجھ پہ وارد ہوا۔ میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ آنسو بہتے رہے مگر لب خاموش رہے۔ ہم اسی حال میں وہاں سے روانہ ہوئے۔

اللہ اپنے سب بندوں سے بے حد پیار کرتا ہے۔ جب بات خدا کی ہو تو عقل کے

بجائے ایمان زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ خدا ہماری عقل میں نہیں سما سکتا۔ اسے انسانی پیمانوں سے ناپنے سے محدودیت کا تصوّر آ جاتا ہے۔ وہ کتنا بڑا ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اسے بیان کرنے کو الفاظ کہاں سے لائے جائیں؟

خدا تو انسانی تصور سے بے پناہ ماورا ہے۔ اس کی بنائی گئی کائنات کا احاطہ کرنے سے عقل عاجز ہے جو اس کی ایک خلق شمار ہوتی ہے۔ ذرا کسی صاحب علم مثلاً سائنسدان سے پوچھئے کہ کائنات کتنی بڑی ہے۔ اس کا جواب ذرا غور سے سنیے گا اور خود سے پوچھئے گا کہ کیا سمجھے؟ اللہ اپنے سب بندوں سے بے حد پیار کرتا ہے مگر کسی ایک سے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ انھیں اپنا محبوب ﷺ قرار دیتا ہے۔ وہ اتنے عظیم خدا کو محبوب کیوں ہیں.....؟

اللہ کے اجلے محبوب پہ ایک عورت باقاعدگی سے کوڑا پھینکا کرتی۔ یہ اس عورت کا معمول تھا۔ آپ کے اوپر جب کوڑا پھینکا جاتا تو آپ مسکراتے اور جواباً اس عورت کو کچھ نہ کہتے۔ یہ آپ کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ لگاتار چند دن وہ عورت کوڑا پھینکنے نہ آئی تو اللہ کے محبوب نے معلوم کیا، پتہ چلا کہ وہ بیمار پڑی ہے۔ آپ اس خاتون کی تیمارداری کو تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کے عورت خوفزدہ ہوئی کہ شاید بدلہ لینے آئے ہیں۔ آپ نے نرمی سے فرمایا کہ میں آپ کی عیادت کو آیا ہوں۔ اللہ نے مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ بیمار کی عیادت کو جائے۔ پھر سرکار نے شفقت سے دریافت فرمایا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ وہ بوڑھی عورت نہال ہو گئی اور اسلام قبول کر لیا۔ تو کسی کو بات سمجھ آئی کہ سرکار ﷺ، اللہ کو اتنے محبوب کیوں ہیں.....؟

مجھے یہی خیال آیا کہ میں جن کو مانتا ہوں، جو میرے سرکار ﷺ ہیں ان کے ساتھ اتنا برا سلوک ہوا مگر انھوں نے جواب میں کیسا ہی اعلیٰ اخلاق اپنایا تو کیا میں ان کا ایک خطاکار امتی ہونے کے ناطے ان کے اسوۂ حسنہ پہ عمل نہیں کر سکتا۔ اس خیال نے

مجھے پاکیزہ کر دیا۔ میرے اندر سے غصّہ، احساس ذلت اور بے چینی جاتی رہی۔ میں بدلہ لینے سے باز رہا اور بالکل شانت ہو گیا۔

ٹاڈ شیہ کا موقّف

اتفاق سے ٹاڈ شیہ کا صباٹرسٹ آنا ہوا۔ ان سے جب مندرجہ بالا واقعے کے بارے میں پوچھا گیا تو یوں لگا جیسے ان کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا ہو۔ انھوں نے کہا کہ جب رات گئے صغیر صاحب کا فون آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ میں میاں صاحب کے بارے پہلے ہی تحفظات رکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ بہتر ہے اپنے ساتھ پولیس لیتا جاؤں تا کہ کسی ممکنہ خطرے سے نمٹا جا سکے۔ میں جب پولیس کے ہمراہ ان کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ صغیر صاحب اپنے سامان کے ساتھ سڑک پہ کھڑے ہیں۔ میاں صاحب ساتھ کھڑے ان پر چلّا رہے ہیں۔

ٹاڈ شیہ نے مزید کہا کہ وہ صغیر احمد اسلم صاحب کی بے پناہ عزت کرتے ہیں کیوں کہ یہ میرے ہیرو ہیں۔ ایک مرتبہ امریکہ میں ہم اکٹھے تھے۔ کھانے کا وقت ہوا تو ہم نے صغیر صاحب کو کہا کہ چلیں کھانا کھانے ریسٹورنٹ چلتے ہیں تو انھوں نے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے خشک میوہ جات نکالے اور کہا ”میں اپنا کھانا ہمراہ لے کے چلتا ہوں۔ میں فضول خرچی کا قائل نہیں۔“

ٹاڈ کا کہنا تھا کہ یہ ایسے شخص کا طرز عمل ہے جو اگر چاہے تو امریکہ کا کوئی بھی ریسٹورنٹ خرید سکتا ہے۔

شاہی مہمان کی حیثیت سے حج

مختلف لوگ مختلف قسم کے انعام حاصل کر کے خوش ہوتے ہیں۔ کوئی دولت پا کے خوش ہوتا ہے۔ کوئی اپنی پسند کی شادی کر کے خود کو خوش قسمت تصوّر کرتا ہے۔ کوئی

دنیاوی منصب پانے کو ہی سب کچھ مانتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک میری چاہت کا تعلق ہے تو میں جب طواف کرتا ہوں اور روضۂ رسول ﷺ پہ حاضر ہوتا ہوں تو خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ بات محبت کی ہے۔ دراصل مکّہ مدینہ اور پاک سرزمین کا تصوّر مجھے دیوانہ بنانے کو کافی ہے۔

میں اس سے پہلے بھی اپنے ایک عمرہ کا ذکر کر چکا ہوں جو پہلا عمرہ تھا نہ ہی آخری۔ اللہ پاک کے فضل سے میں کئی مرتبہ عمرہ اور حج کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ وہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر کوئی بھی مسلمان کبھی بھی جانے کے لئے تیاّر رہتا ہے۔ کئی مسلمان ایسے ہیں جو حج اور عمرہ کی تمنّا دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کروڑوں اربوں کے مالک ہونے کے باوجود انھیں حج و عمرہ کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جو خانۂ خدا اور دیارِ رسول ﷺ پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کو اپنی زندگی سنوارنے کا موقع دیا جاتا ہے اور جو وہاں سے واپس آ کے بھی اللہ کی نہیں مانتے۔ ان پر حسرت..... ان کے لئے خود کو سوگوار ہی کیا جا سکتا ہے۔

یہ نوّے کی دہائی کی بات ہے کہ سعودی عرب سے ایک وفد تبلیغی مقاصد کی غرض سے امریکہ پہنچا۔ انھوں نے اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی مسجد میں ایک پروگرام ترتیب دیا۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب اس پروگرام کو ترتیب دینے والی کمیٹی کا نمایاں حصّہ تھے۔ پروگرام کی تاریخ مقرر کی گئی اور متوقّع شرکاء کو دعوت نامے ارسال کر دیئے گئے جنھیں امریکہ کی مختلف ریاستوں سے اس پروگرام میں شرکت کرنا تھی۔ اس پروگرام پہ اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ دولاکھ پچاس ہزار ڈالر ($250,000.00) تھا جو وفد کو سعودی حکومت کی طرف سے ایک چیک کی صورت میں دیئے گئے تھے۔

پروگرام کی آرگنائزنگ کمیٹی کو اچانک غیر متوقّع صورت حال کا سامنا کرنا

پڑا۔ کسی بھی بینک نے وہ چیک فوری طور پر کیش کرنے سے انکار کر دیا۔ سب لوگ سخت پریشانی سے دوچار ہو گئے۔ ڈاکٹر مزّمل صدیقی صاحب کا شمار اسلامی دنیا کے اہم اور قابل احترام اسلامی مفکر اور عالم کے طور پر ہوتا ہے اور ان کے تعلّقات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے سر توڑ کوشش کی لیکن کسی بھی بینک نے دو ہفتے سے قبل وہ چیک کیش کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے پروگرام میں چند دن رہتے تھے ظاہر ہے وہ اتنا انتظار کرنے کے متحمّل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پروگرام کا انعقاد خطرے میں پڑ گیا۔

ڈاکٹر مزّمل صدیقی صاحب نے بالآخر مجھ سے رابطہ کیا اور وفد کی مشکل سے آگاہ کیا۔ میں نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ لوگ نیشنل بینک آف سدرن کیلیفورنیا (National Bank of Southern California) میں بینک منیجر سے رابطہ کریں وہاں سے چیک کیش ہو جائے گا۔

وہ لوگ بینک پہنچے اور بینک منیجر بل جیکوبی (Bill Jacobi) سے ملے اور آنے کا مدّعا بیان کیا۔ اس بینک کے منیجر نے بھی وہی بات کی کہ یہ چیک دو ہفتے سے قبل کیش نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ چیک ایک دوسرے ملک سے جاری کیا گیا ہے۔ اس کی سعودی عرب سے تصدیق کرانی پڑے گی تب کہیں جا کے یہ چیک کیش ہو گا۔ وفد کے لوگوں نے بینک سے مجھے فون کیا۔ میں نے کہا کہ میری بینک منیجر سے بات کروائیں۔ بل جیکوبی مجھے بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا کیونکہ ہمارے اکاؤنٹ اس بینک میں ایک طویل عرصے سے تھے۔

بل جیکوبی نے مجھے بتایا کہ غیر ملکی چیک میں اتنا وقت لگنا بالکل عام بات ہے۔ سعودی عرب میں موجود بینک سے اس کی تصدیق ہونے کے بعد ہی یہ چیک کیش ہونے کے قابل ہو گا۔ میں نے کہا "بل! آپ بے فکر ہو کے چیک ابھی کیش کر دیں، میری

گارنٹی ہے کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے کہا "جناب! رقم کافی بڑی ہے بعد میں اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میری نوکری چلی جائے گی۔" میں نے کہا "دیکھو بل! ہم اتنے لمبے عرصے سے ایک دوسرے کے ساتھ پیسوں کا لین دین کر رہے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میری وجہ سے آپ کسی مشکل میں پھنسے ہوں۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہو کہ اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے تو ایسا کرو کہ آپ یہ چیک کیش کر دو اور اگر بعد میں کوئی مسئلہ ہوا تو آپ میری کریڈٹ لائن سے اتنے ہی پیسے لے سکتے ہو۔ یہ میں آپ کو لکھ کر دے دیتا ہوں۔"

بہر حال بڑی ہی ردّوقدح کے بعد وہ میری بات مان گیا اور اس نے وہ چیک کیش کر کے ڈھائی لاکھ ڈالر کی رقم ان کے حوالے کر دی۔ یوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پروگرام اپنی مقررہ تاریخ کو بڑے اچھے انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔

کچھ عرصہ بعد کی بات ہے میں اپنے روزمرہ کے معمول کے مطابق کاروبارِ زندگی میں مصروف تھا۔ امریکہ میں اس وقت حج کیلئے درخواستیں بند ہو چکی تھیں اور میں کسی حد تک پژمردہ تھا کہ اس مرتبہ حج کی سعادت سے محروم رہا۔ اچانک ہی میرے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے بولنے والے شخص نے تصدیق چاہی کہ آیا میں صغیر اسلم ہی بول رہا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں! میں صغیر اسلم ہی ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ کو شاہ فہد بن عبدالعزیز کی طرف سے حج کی دعوت ہے۔ آپ اس مرتبہ سرکاری طور پر شاہی مہمان کی حیثیت سے حج کریں گے۔

یہ ایک ایسی خبر تھی کہ جسے سن کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ میں اپنی طرف سے سمجھ بیٹھا تھا کہ اس مرتبہ حج پہ نہیں جاسکوں گا لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ بے پایاں مسرّت نے تھوڑی دیر کو میرے حواس معطّل کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان صاحب کو بتانے کی کوشش کی کہ جناب حج کیلئے درخواستیں بند ہو چکی ہیں اور میرے پاس تو ویزا بھی نہیں۔ اس نے ادب سے کہا کہ جناب! آپ اس کی فکر نہ کریں۔

سارا انتظام کرنا ہمارے ذمّہ ہے۔

ایک شخص آ کے میرے سفری دستاویزات ساتھ لے گیا۔ میں سفر کرنے کے لئے تیار تھا مگر یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں میں جا بھی سکوں گا یا نہیں؟

میں جب لاس اینجلس ائیر پورٹ میں امریکن ائیر لائن کے کاؤنٹر پہ پہنچا تو وہاں ایک عربی شخص کو موجود پایا جو کسی کا منتظر لگتا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ اس نے اپنے بیگ سے میری سفری دستاویزات میرے حوالے کیں۔ مجھے یقین ہو گیا..... حاضری کا بلاوا آ چکا ہے.....۔

میں وہاں سے امریکی ائر لائن کے طیّارے میں سوار ہوا جو نیویارک لے گیا۔ وہاں چار(4) گھنٹے انتظار کے بعد ایک دوسرے ٹرمینل سے سعودی ائرلائن کے ذریعے جدّہ پہنچا۔ حاضری کا بلاوا آ چکا تھا..... یہ تو یقین تھا..... مگر ایسی عزّت افزائی کی توقّع مجھے ہر گز نہ تھی۔

جب ہمارا جہاز جدہ کے ہوائی اڈّے پہ جا کے رکا تو مسافروں نے جہاز سے باہر نکلنے کی تیاّری شروع کر دی۔ کچھ لوگ اپنی سیٹوں سے اٹھ چکے تھے اور کچھ اٹھنے کی تیاّری میں تھے جب جہاز کے عملے کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ براہِ مہربانی تمام مسافر اپنی اپنی سیٹ پہ تشریف فرما رہیں۔ یہ ایک غیر معمولی اعلان تھا جس نے لوگوں کو چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ اعلان کیا جا رہا ہے؟ اسی اثناء میں جہاز کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک عربی شخص بر آمد ہوا اور اعلان کیا "مسٹر صغیر اسلم میرے ساتھ آ جائیں پلیز۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سب لوگ گردن موڑ موڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ کچھ اپنی سیٹ سے اوپر اٹھ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دراصل یہ سعودی حکومت کا اپنے خاص مہمان کا استقبال کرنے اور اسے عزّت دینے کا ایک

مخصوص طریقہ تھا۔ میں گویاعالم خواب میں چلتا اس کے پاس پہنچا۔ اس نے بڑے ادب و احترام سے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ میں نے اپنے سامان کے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر اس نے کہا آپ سامان کی فکر نہ کریں۔ میرے ساتھ آئیں پلیز۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

جو لوگ حج پہ جاتے ہیں ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب وہ حاجیوں کے مخصوص ٹرمینل پہ پہنچتے ہیں تو وہاں انھیں کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میں ان صاحب کی رہنمائی میں ائرپورٹ سے باہر آگیا۔ کسی نے ہمیں روکا، کچھ پوچھا اور نہ ہی تلاشی لی۔ باہر ایک گاڑی پہلے سے ہمارے انتظار میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرا سامان بھی آگیا۔ مجھے وہاں سے سیدھا حرم شریف کے قریب واقع شاہی محل (Royal Palace) میں پہنچا دیا گیا۔

وہاں کئی مہمان موجود تھے جن کو شاہی مہمان کی حیثیت سے حج کے لئے بلایا گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر مختلف ممالک کے سربراہ مملکت یا چوٹی کے مسلمان علماء شامل تھے جو دنیا کے مختلف حصّوں مثلاً مصر، ایران، افریقہ، اردن اور امریکہ سے آئے تھے۔ تمام لوگ اپنے اپنے شعبوں میں انتہائی اعلیٰ حیثیت کے حامل تھے۔

پورے حج کے دوران تمام شاہی مہمانوں کو خاص پروٹوکول دیا گیا۔ منیٰ میں قیام کے دوران انھیں خیموں میں نہیں بلکہ حکومت کے ایک مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔ عرفات کے میدان میں کوئی خیمہ وغیرہ نہیں لگایا جاتا مگر شاہی مہمانوں کے لئے ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا جو اندر سے پانچ ستارہ ہوٹل دکھائی دیتا تھا، ویسی ہی سہولیات اور انواع واقسام کے کھانے..... تمام زائرین میدان میں مغرب کے وقت عرفات سے نکلے اور مزدلفہ میں رات کھلے آسمان تلے گزاری۔ جب شیطان کو کنکریاں مارنے کا وقت آیا تو ہمارے لئے خاص انتظام کیا گیا اور ایک خصوصی بس میں وہاں لایا گیا۔

حج کے بعد ایک مخصوص دن ہماری ملاقات سعودی فرمانروا شاہ فہد بن

عبد العزیز سے کرائی گئی۔ انھوں نے پہلے سب کے ساتھ فرداً فرداً تعارف حاصل کیا اور پھر اکٹھّے رات کا کھانا کھایا۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو انھوں نے ہمیں قرآن پاک اور دیگر کتب بطور تحفہ دیں۔ یہ تمام لمحات میرے لئے ناقابل فراموش ہیں اور رہیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا کہ اس نے مجھے اپنے گھر میں اتنی عزّت عطا فرمائی۔

سعودی حکومت کی طرف سے اس کے بعد بھی مجھے بطور شاہی مہمان حج کیلئے دعوت دی جاتی رہی۔ اگلی مرتبہ میں اپنی بیگم کے ہمراہ حج کرنے گیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ میں نے اپنے پورے خاندان کے ہمراہ شاہی مہمان کی حیثیت سے حج کیا۔ دو مرتبہ میں نے اکیلے مذکورہ بالا حیثیت سے حج ادا کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور احسان کے صدقے ممکن ہوا ورنہ بندہ اس قابل کہاں تھا؟

عجیب واقعہ

صبا ہومز کی تعمیر کے دوران میں امریکہ میں تھا۔ میرے پاکستان میں موجود عملے نے ایک حیرت انگیز واقعے کی خبر مجھے دی۔ آپ یہ واقعہ ہمارے منیجر کی زبانی سنیے۔

صبا ہومز کا لینٹر (Lenter) ڈالنے کا کام بھرپور رفتار سے جاری تھا کہ اسی دوران بادل گھر آئے اور سارا آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے کیونکہ اگر بارش ہو جاتی تو ساری محنت پہ پانی پھر جاتا۔ نہ صرف کام روکنا پڑتا بلکہ جو میٹریل ہم لگا چکے تھے وہ سارے کا سارا ضائع ہو جاتا اور بڑے پیمانے پہ نقصان ہوتا۔ سب اسی افراتفری میں تھے کہ بارش ابھی شروع ہو جائے گی لیکن خدا نے ہمارا ساتھ دیا اور ایسا معجزہ رونما ہوا کہ یقین نہیں ہوتا تھا کیونکہ بارش نہ ہوئی اور ہم نے اپنا کام جاری رکھا، یہاں تک کہ کام مکمل ہو گیا۔ اس بات کا ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے گلریز کے چند سو میٹر کے علاقے کو چھوڑ کر آس پاس کے تمام علاقوں میں موسلا دھار بارش ہوئی حتّٰی کہ جل تھل ہو گیا۔ کار چوک، ہائی کورٹ کے علاقے میں اور ادھر سے بحریہ ٹاؤن

تک بارش ہوئی لیکن معجزانہ طور پر ہمارے صباہومز کے آس پاس بارش نہ ہوئی اور اگلے دن جب چھت کو پانی دینا تھا تو ہر طرف سے بادل اڑ اڑ کر آئے اور گلریز میں بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ یوں قدرت نے ہمارا کام آسان کر دیا اور ہمیں چھت کو پانی لگانے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی۔

اللہ سبحان تعالیٰ کا خاص کرم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا جو کہ بہت بڑا کرشمہ ہے، اس لئے جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی کام خدا کے بندوں کی بھلائی کے لئے خالص نیّت کے ساتھ شروع کیا جائے اور وہ تکمیل کو نہ پہنچے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی بندہ خدا کے بندوں کے کام میں لگ جاتا ہے تو ادھر خدا بھی اس بندے کے کام آسان کرنے میں لگ جاتا ہے اور صباہومز کے معاملے میں بھی خدا ہر وقت ہمارے ساتھ رہا۔

مقام عبرت

نوشہرہ میں 2014ء میں آنے والا سیلاب بے حد تباہ کن تھا۔ اس نے لوگوں کو مالی لحاظ سے جتنا نقصان پہنچایا اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ یہ اسی سیلاب کے دوران کی بات ہے۔ ہم راولپنڈی سے کھانا، کپڑے، جوتے، کمبل اور ضروریات کا دیگر سامان متاثّرین تک باقاعدگی سے پہنچاتے۔ اس مقصد کے لئے میں خود اپنے عملے کے ہمراہ جاتا۔

ایک مرتبہ ہم متاثرین میں کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ میں نے ایک شخص کے سامنے کھانا رکھا۔ وہ چہرے مہرے سے دوسروں سے الگ نظر آتا تھا۔ ابھی میں کھانا رکھ کے سیدھا ہی ہوا تھا کہ ساتھ کھڑے شخص نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا اور میرے کان میں بولا کیا آپ جانتے ہیں، جس شخص کے سامنے آپ نے کھانا رکھا ہے یہ ہمارے علاقے کے امیر ترین افراد میں سے ایک ہے۔ اس کے پاس بے شمار دودھ دینے والی گائیں اور بھینسیں تھیں۔ کئی گاڑیاں جس میں مرسڈیز جیسی گاڑی بھی شامل تھی۔

سیلاب نے سب تباہ کر دیا۔ اب یہ دربدر ہو چکا ہے۔

میرے مخبر کی آواز عبرت سے کانپی..... کل لکھ پتی..... آج ککھ پتی.....۔

عمرہ 2014ء

اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم کے طفیل بے شمار مرتبہ حج اور عمرہ کی سعادت عطا فرمائی مگر اپریل 2014ء میں ادا ہونے والا عمرہ بہت خاص تھا۔ اس میں ہم سب گھر والوں نے مل کے عمرہ ادا کیا تھا۔ میں پاکستان سے سعودی عرب پہنچا جب کہ باقی خاندان امریکہ سے آیا۔ ان میں میری بیگم بشریٰ، میری بیٹی عائشہ اور اس کے میاں احمد المطوع، ان کی بیٹیاں اصیل اور عاصمہ، میرا نواسہ جہاد اور نواسی زینب شامل تھے۔ جہاد اور زینب کے والدین نہ آسکے۔ بچوں اور خاندان کے ہمراہ عمرہ کرنا ایک پر لطف اور یادگار تجربہ تھا۔ تمام لوگوں نے ہر لمحہ روحانی تسکین حاصل کی جو اپنے پیاروں کی موجودگی میں دوچند ہو گئی۔

ہم جب مدینہ شریف پہنچے تو میں نے احمد اور جہاد سے کہا کہ روضۂ رسول پاک ﷺ پہ اکٹھے چلتے ہیں۔ احمد نے کہا کہ وہ اور جہاد اکٹھے جائیں گے۔ احمد اور جہاد کی آپس میں خوب بنتی ہے۔ میں نے انھیں اکٹھے جانے دیا اور اکیلا روضۂ رسول پاک ﷺ کی جانب چلا۔

دنیا کے کونے کونے سے مدعوئین مدینہ پہنچے ہوئے تھے۔ جی ہاں! وہی آئے تھے جو مدعو کئے گئے تھے۔ پروانوں کا شمار نہ تھا۔ شمع ایک تھی۔ پروانے پوری کائنات سے پہنچے تھے۔ بہت ارمان دل میں لئے پہنچے تھے۔ بے شمار عرضیاں ان کے پاس تھیں۔ متعدّد درخواستیں انھوں نے اپنے سرکار کو پیش کرنی تھیں۔ کچھ اپنے دل میں طلب لئے پہنچے تھے۔ کچھ محض عشق و محبّت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وارفتگی سے درود و سلام پیش کرتے، جوشِ محبت سے تمتماتے چہرے، سر جھکائے چلتے جاتے۔ تل دھرنے کو جگہ نہ

تھی۔ لوگ بے تابی سے جگہ تلاش کرتے جہاں سے وہ ایک نظر، شمع جمال رسالت کی جانب کر سکیں۔ کوئی ایک جگہ..... جہاں قدموں کو تھوڑا قرار ہو، مگر ہر لحظہ پیچھے سے امڈتے پروانوں کی وجہ سے، نہ چاہتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے۔ جبیں بے قرار تھی کہ ایسے مقام پہ اپنے ربّ کے حضور زمین پہ لگے مگر جہاں قدم دھرنے کو جگہ بڑی مشکل سے ملی تھی، وہاں یہ بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔

میں بھی انھی میں شامل ایک عاجز پروانہ تھا جو سر جھکائے انکساری کے ساتھ، آگے کی جانب کھسکتا جاتا تھا۔ چہار جانب لوگ ہی لوگ تھے۔ مؤدّب دل لئے، رکتی چلتی سانسوں کے ساتھ، دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہوئے، سب کی کوشش تھی کہ کسی جگہ ٹھہر جائیں اور جی بھر کے روضۂ مبارک کو دیکھیں، اصحابؓ صفّہ کے چبوترے اور صراط الجنّتہ میں نفل ادا کر سکیں۔ میں اپنے آس پاس ایسی ہی جگہ ڈھونڈتا جاتا، مگر ہر جگہ لوگ بھرے تھے۔ اپنے آپ میں گم..... کسی کو کسی کا ہوش کہاں تھا.....؟

"بھائی! ادھر آیئے۔ یہاں آپ کے لئے جگہ ہے۔" یہ آواز اصحابؓ صفّہ کے چبوترے کی جانب سے آئی تھی۔ مخاطب یقیناً میں ہی تھا۔ میں نے حیرت اور خوشی سے آواز کی جانب دیکھا۔ ایک شخص میرے لئے اصحابؓ صفّہ کے چبوترے کے نزدیک جگہ بنا کے بیٹھا تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا، درود وسلام کا ورد کرتا بڑھتا گیا۔ وہاں پہنچ کے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خدا کا شکر ادا کر کے بیٹھ گیا اور ٹکٹکی باندھ کے روضۂ مبارک کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں تشکّر کے جذبات اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ بہت دیر تک روضۂ مبارک کو دیکھ کے خوش ہوتا رہا کیوں کہ اسے ان سے نسبت تھی۔ تھوڑی سی جگہ بنا کے میں نے وہیں پہ نفل ادا کئے۔

اب مجھے صراط الجنّتہ کی جانب جانا تھا۔ جتنے عشّاق رسول ﷺ آگے بڑھ

جاتے تھے، اتنے ہی پیچھے سے مزید آجاتے۔ یوں لگتا کہ متعدّد پاکیزہ آوازیں تیز و مدّ ہم لہجوں میں کوئی لامکانی لے الاپ رہی ہیں۔ میں دل ہی دل میں سرکار کو یاد کرتا آہستگی سے آگے بڑھا۔ میں ایک ذرۂ خاک اور اپنی کم مائیگی سے خوب واقف تھا۔ جان لیجئے کہ ہمارے صاحب بڑے ہی رحم دل ہیں۔ کسی بھی آنے والے، یا کائنات کے کسی بھی حصے سے انھیں دل سے یاد کرنے والے کو مایوس نہیں ہونا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم سے اُسے ضرور نوازا جاتا ہے۔ تمام اختیار اللہ کریم وحدہٗ لاشریک کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے مشرف فرماتا ہے۔ محمد بن عبد اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں (مفہوم) ۔ اس میں کمال آنے والے یا دل سے یاد کرنے والے کا کہاں، کمال تو نوازنے والے کا ہے۔ تبھی تو وہ محبوب رب ٹھہرے۔ ان پر، ان کی آل اولادؑ پر اور ان کے ساتھیوںؓ پر ریت کے ذرّوں، درختوں کے پتوں، پانی کے قطروں، کائنات کے تمام ایٹموں، تمام ملائکہ اور اللہ کی رحمت برابر درود و سلام اور اللہ کی رحمتیں.....۔

صراط الجنّتہ پہ بھی بے پناہ رش تھا۔ میں نے کافی دیر ادھر ادھر دیکھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ مجھے اگر جگہ مل جائے تو میں نفل ادا کرلوں مگر ہر طرف عاشق صادق موجود تھے۔ کوئی نفل پڑھ رہا تھا۔ کوئی درود و سلام پڑھنے میں مصروف تھا۔ کوئی تلاوت قرآن پاک میں منہمک تھا۔ میں کسی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا نہ ہی کسی کے رازو نیاز میں مخل ہونا چاہتا تھا۔ صراط الجنّتہ نے اگر بہت سارے لوگوں کے لئے بانہیں وا کرر کھی تھیں اور فی الوقت میر المحۂ رازونیاز نہ آیا تھا تو میں بخوشی انتظار کرسکتا تھا اور یہ کوئی اداسی کی بات نہ تھی۔ میں دوبارہ سے کوشش کرسکتا تھا۔ میرا دل کسی بھی خوش فہمی سے خالی تھا۔ میں واپس پلٹا ہی تھا کہ اسی اثناء میں کسی نے پیچھے سے میرے کندھے کو تھپکا۔

"آپ میری جگہ لے سکتے ہیں۔"

میرا دل لحظہ بھر کو دھڑکنا بھولا۔ غیر متوقع پیش آئے تو کچھ یوں ہی ہوتا ہے۔

میں بے حد خوش ہو گیا۔ ایک الوہی لطف و سرور نے میرے تمام حواس کو اپنی نرم ملائم گرفت میں لے لیا۔ یہ میرے لئے بہت بڑی سعادت تھی۔ یہ کسی کے لئے بھی بہت بڑی سعادت ہو سکتی ہے۔ خوشی خوشی میں نے وہاں نوافل ادا کیے۔ درود و سلام کے نذرانے سرکار کی خدمت میں عاجزی سے پیش کئے۔

یہ محض اللہ کا فضل اور سرکار ﷺ کی نگاہ کرم تھی ورنہ بندہ کس شمار میں تھا؟ میں نے سکون سے نوافل ادا کئے۔ اس کے بعد باہر روضۂ مبارک کی جانب بڑھا۔ درود شریف میں پڑھتا جا رہا تھا۔ میں قطار میں لگا ہوا تھا۔ روضۂ مبارک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک آدمی نے مجھے آواز دی اور میرا بازو پکڑ کے مجھے اندرونی قطار میں کھینچ لیا۔ میں اب روضۂ مبارک سے اتنا قریب ہو گیا کہ جتنا ممکن تھا۔ میں آقائے کریم ﷺ پر درود و صلوٰۃ پڑھتا رہا۔ اپنے پیارے سرکار ﷺ کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرامؓ کے مزارات مبارک سے قربت کا تصور سرشاری میں مبتلا کر رہا تھا۔ درود شریف کا ورد مسلسل میری زبان پہ جاری رہا۔ جہاد اور احمد نے کہا کہ وہ کل دوبارہ کوشش کریں گے۔ آج انھیں موقع نہ ملا تھا کہ وہ کسی جگہ نوافل ادا کر سکتے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا کہ سعودی عرب کے ائرپورٹ پہ طویل انتظار کرنا پڑتا ہے تب جا کے کسٹم اور سیکیورٹی کلیئرنس ملتی ہے۔ اس عمل میں گھنٹوں لگنا عام بات ہے۔ لمبی لمبی قطاریں اور انتہائی صبر آزما انتظار سعودی ائرپورٹ کا خاصّہ ہیں۔ میں نے مدینہ شریف سے جدّہ جانا تھا جہاں سے میں نے پاکستان واپسی کے لئے فلائٹ لینی تھی۔ میرے خاندان کے باقی لوگ واپس امریکہ سدھار چکے تھے اور میں مدینہ ائرپورٹ پہ قطار میں لگا تھا۔ انتظار کرنا ہمیشہ سے میرے لئے بے حد صبر آزما رہا ہے۔ مجھے کسی کا انتظار کرتے یوں لگتا ہے جیسے میرا وقت ضائع ہو رہا ہو اور وقت ضائع کرنا مجھے کسی طور قبول نہیں۔

مجھے قطار میں کھڑے ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسٹم کا ایک باوردی اہلکار میری جانب آیا۔ اس نے مجھے باقی لوگوں سے الگ کیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے کسٹم اور سیکیورٹی کے مراحل سے گزارا جس میں چند منٹ لگے۔ اس کے بعد مجھے مسکراتے ہوئے کہا "دعا ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار اور محفوظ ہو۔ آئندہ بھی تشریف لایئے گا۔" میں حیرت میں گم تھا۔ کوئی تو ہے جسے ایک ذرّے کا اتنا خیال رہتا ہے۔ بے شک یہ میرے بے حد مہربان، وضع دار اور رحیم و کریم صاحب کا کرم ہے کہ ذرّے کا خیال کرتے ہیں۔

خدا جو بزرگ و برتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں، اپنے قریبی فرشتوں سے تذکرہ فرمایا۔ یہ خدا کی ذرّہ نوازی تھی۔ ورنہ اتنے عظیم الشان، تصور کی حدوں سے ماورا بادشاہ کو، خود اپنی تخلیق سے کیا ڈر تھا۔ جبکہ وہ بے نیاز ہے۔ اب فرشتوں نے عرض کی اے مالک! آپ جانتے ہو کہ انسان زمین پر خون ریزی کرے گا۔ فرشتے بھی اپنے مالک کے وفادار ہیں۔ وہ جانتے تھے اور ہیں کہ ان کا رب کیسا رحمدل بادشاہ ہے۔ شہنشاہِ کائنات کے علم میں محمد بن عبد اللہ ﷺ تھے۔ بزرگ و برتر خدا نے فرمایا جو میرے علم میں ہے وہ آپ نہیں جانتے۔

ہم جیسے محمد بن عبد اللہ ﷺ کے طفیل وجود پا گئے۔

چند دلچسپ حقائق

☆ میں جب پاکستان سے امریکہ پہلی مرتبہ گیا اس وقت ڈالر تین روپے کا تھا۔
☆ پاکستان میں ڈیزل کی قیمت صرف تین روپے فی لیٹر تھی۔
☆ امریکہ میں پٹرول انیس سینٹ فی گیلن تھا۔
☆ امریکہ میں ڈاک کا خرچ محض تین سینٹ تھا۔
☆ امریکہ میں ڈزنی لینڈ کا ٹکٹ محض تین ڈالر کا تھا۔ اب بچوں کا ٹکٹ دو سو چھیانوے ڈالر ($296.00) اور بڑوں کا تین سو انتالیس ڈالر ($339.00) کا ہے۔(2017ء میں)
☆ امریکہ میں عام گھر کی قیمت تقریباً چودہ ہزار ڈالر ($14000) تھی جبکہ آج کل ساڑھے تین سے چار لاکھ ڈالر کے درمیان ہے۔

1965ء میں جب میں پہلی مرتبہ عمرہ کرنے گیا تو اس وقت:

☆ دونوں حرم شریف کا سائز بہت چھوٹا تھا۔
☆ آبِ زم زم کا کنواں آپ دیکھ سکتے تھے حتّٰی کہ آپ یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ اس میں کتنا پانی ہے۔
☆ ایک آدمی مشک اٹھائے آتا اور سب کو پانی پلاتا، وہ محمود و ایاز کے لئے ایک ہی گلاس استعمال کرتا۔ آج کل جگہ جگہ ٹھنڈا پانی وافر مقدار میں موجود ہے، جو آبِ زم زم ہی ہوتا ہے اس کے ساتھ ڈسپوزایبل گلاس رکھے ہوتے ہیں۔
☆ ان دنوں فلش سسٹم کا تصوّر تک نہ تھا۔ آج کل ہر جگہ واش روم ہیں جو چوبیس گھنٹے صاف ستھرے رکھے جاتے ہیں۔
☆ 1965ء کے سال مکّہ شریف میں جب میں نے ہوٹل منیجر سے کمرے کی چابی طلب کی تو اس نے کہا چابی کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اگر باہر جانا ہو تو آپ کمرے کے سامنے لگا ربن کھول کے لگا دیں۔ دروازہ بھی بند کرنے کی ضرورت نہیں۔

☆ لوگ کہتے ہیں کہ غائب سے مدد نہیں آتی اس خاکسار کا تجربہ ہے کہ غائب سے مدد بار بار آتی ہے۔ کم از کم تین مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں بالکل قلاش ہو گیا اور میں نے صفر کام سے شروع کیا اور اللہ پاک نے اپنے فضل و کرم کے طفیل مجھے غنی کیا۔ میں پھر اپنی بات دہراؤں گا کہ اس میں میرا کمال بالکل نہیں بلکہ محض اللہ پاک کی مہربانی ہے۔

شیطان صراطِ مستقیم پر ہے۔

شیطان دونوں اعتبار سے صراطِ مستقیم پہ بیٹھا ہے۔ اُس کا مقدر ہے کہ جہنم میں پہ پہنچے۔ لہٰذا وہ دل سے اپنا پورا زور لگا رہا ہے کہ وہ جتنی جلد ہو سکے اپنی منزل کو پہنچے۔ اس لحاظ سے وہ ہر وہ کام کرتا ہے جو اسے جہنم میں لے جائے۔ ظاہر ہے اگر اسے جنت جانا ہوتا تو وہ نیک کام کرتا۔

چلو اگر وہ اپنے راستے پر رہتا تو ٹھیک ہی تھا مگر وہ جنت کی طرف جانے والے راستے کے درمیان بھی بیٹھا ہے۔ وہاں اس کا کام یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے والے افراد کو دھیرے سے، غیر محسوس طریقے سے دائیں بائیں ہٹاتا رہتا ہے۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔

اچھی صحت کا راز

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پہ ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے کیونکہ یہ میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ لوگ اکثر مجھ سے میری اچھی صحت کا راز پوچھتے ہیں۔ اسی(80) برس کا ہونے کے باوجود میں الحمدللہ پوری طرح صحت مند اور چاک و چوبند ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے شوگر، بلڈ پریشر یا دل کا کوئی عارضہ لاحق نہیں اور مجھے پیٹ یا سر میں کبھی درد نہیں ہوا۔

عمر کے بارے میں بھی میرا اپنا ہی ایک نظریہ ہے۔ کئی خواتین اور مرد اپنی عمر کو چھپاتے ہیں جبکہ میں اپنی عمر کو بڑے فخر اور سچائی کے ساتھ بتاتا ہوں۔ میرے نزدیک عمر تو محض ایک عدد ہے۔ آپ اتنے جوان ہیں جتنا آپ محسوس کرتے ہیں۔ آپ جتنے زیادہ متحرک ہوں گے اتنا ہی خود کو تروتازہ اور جوان محسوس کریں گے۔ جب لوگ مجھ سے میری عمر کے بارے پوچھتے ہیں تو میں کہتا ہوں میں اسی(80) سال کا ایک نوجوان آدمی ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ بہت عرصہ پہلے امریکہ میں، میرے سر میں درد ہوا تھا۔ میری بیگم سر درد کی گولی اور پانی لے کر آئی۔ میں نے وہ دوا لینے کے بجائے ٹریک سوٹ پہنا اور واک پہ نکل گیا۔ میں اتنا چلا اور اتنا تیز چلا کہ میرے سر کا درد غائب ہو گیا اور اس کے بعد اللہ پاک کی رحمت سے آج تک نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری قوّت برداشت بے پناہ ہے۔ امریکہ میں ہفتہ اتوار کو چھٹی والے دن میں ٹینس کھیلنے جاتا تھا۔ صبح کے چھ(6:00) بجے میں ایک کھلاڑی کے ساتھ سنگل گیم شروع کرتا جو کہ نو(9:00) بجے تک چلتی اس کے بعد وہ کھلاڑی گھر چلا جاتا اور میں ایک دوسرے کھلاڑی کے ساتھ سنگل گیم کھیلتا جو کہ دوپہر کے بارہ(12:00) بجے تک چلتی۔ اس کے بعد زیادہ کھلاڑی آ جاتے تو میں آرام کرنے کے

بجائے ان کے ساتھ ڈبلز کھیلتا۔ سب کھلاڑی مجھ سے پوچھتے کہ آپ کو تھکن محسوس نہیں ہوتی؟ آپ مسلسل اتنی لمبی گیم کیسے کھیل لیتے ہیں؟ میرا جواب ہوتا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ میں اپنی صحت کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری اچھی صحت کا راز کیا ہے؟ اس کیلئے میں آپ کو اپنے معمولات سے آگاہ کرتا ہوں۔

میں رات کو جلدی سو جاتا ہوں اور علی الصبح تین، ساڑھے تین بجے بیدار ہوتا ہوں۔ سوتے وقت جو دعائیں اور قرآن پاک میرے حافظے میں محفوظ ہے، وہ پڑھتا رہتا ہوں، پھر اسی طرح پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں۔ صبح جلد بیدار ہونے سے آپ اپنی عبادات جیسے کہ تہجّد اور فجر کی نماز وقت پہ ادا کر سکتے ہیں۔ صبح کو تہجّد اور تلاوت قرآن پاک سے دل کو جو سکون ملتا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس سے پورا دن راحت اور خوشی کا احساس ہوتا رہتا ہے اور جسم ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ اگر آپ کا تعلق کسی اور مذہب سے ہے، تو بھی بہت ضروری ہے کہ آپ صبح سویرے بیدار ہو کر اپنے خدا کو یاد کریں۔ اس نے ہمیں جو زندگی بخشی اور نعمتیں عطا کیں ان کا شکر ادا کریں۔ خدا تو ایک ہی ہے اور وہ ہم سب کا مشترکہ خدا ہے جس نے ہم سب انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

میں صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ صبح دکھائی۔ اس کے بعد جاگنے کی دعا پڑھتا ہوں

"الحمد اللّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور"

پھر میں آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہوں۔ دوبارہ سے اللہ پاک کا شکر ادا کرتا ہوں۔ "الحمد اللہ! میرے معبود، یہ تیرا احسان عظیم ہے کہ تو نے مجھے دوسروں کی مدد کرنے کے لئے چنا ہے پھر میں مسکراتا ہوں اور خود سے کہتا ہوں میں آج کا دن بھرپور انداز میں گزاروں گا۔"

واک اور ورزش

میں علی الصبح، منہ اندھیرے واک کرنے ضرور جاتا ہوں۔ صبح سویرے ماحول انتہائی پر سکون ہوتا ہے، کوئی ٹریفک یا شوروغل نہیں ہوتا۔ ہوا بالکل صاف، تازہ اورآلودگی سے پاک ہوتی ہے۔ صاف ہوا پھیپھڑوں اور دیگر اعضاء کے لئے فرحت اور لطافت کا باعث بنتی ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ٹولیوں میں سیر کرنے نکلتے ہیں۔ لوگ مجھے بھی دعوت دیتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں مگر میں اکیلا سیر کرنے کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اکیلا چلتے ہوئے مجھے موقع ملتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی حمد و ثناء کر سکوں۔ مجھے جتنا قرآن مجید زبانی یاد ہے وہ پڑھتا ہوں، مختلف تسبیحات اور دعائیں پڑھتا ہوں۔ اس سے نہ صرف دل کو راحت ہوتی ہے بلکہ وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ میں اپنے لئے واک کو عبادت کا ایک ذریعہ تصّور کرتا ہوں۔

گھر سے نکلنے سے پہلے میں یہ طے کرلیتا ہوں کہ آج فجر کی نماز کس مسجد میں پڑھنی ہے بحریہ ٹاؤن، پی ڈبلیوڈی یا کسی اور جگہ؟ آج کل عموماً میں راولپنڈی گالف کلب کی مسجد میں نماز ادا کرتا ہوں اور وہیں پہ واک اور ورزش کرتا ہوں۔ میں کلب میں سب سے پہلے جا پہنچتا ہوں۔ اس وقت پارکنگ میں ایک گاڑی بھی نہیں ہوتی اور جب میں واپس آتا ہوں تو پارکنگ لاٹ گاڑیوں سے بھری ہوتی ہے۔

صبح کا منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ فطری حسن ہر طرف پھیلا ہوتا ہے جس میں اکثر میں کھو جاتا ہوں۔ خاص طور پر ہفتہ اور اتوار کو صبح کی سیر اتنا لطف دیتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا کیوں کہ مجھے دفتر کی فکر نہیں ہوتی۔ جب گھر آ کے میں اپنا سپیڈو میٹر چیک کرتا ہوں تو کبھی بارہ میل اور کبھی پندرہ میل کا سفر طے کیا ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ موسم اچھا تھا اور پھول کھلے تھے تو

میں اس دلفریب منظر میں ایسا کھویا کہ بیس (20) میل کے لگ بھگ پیدل چل لیا اور مجھے احساس تک نہ ہوا۔

صبح کی سیر کے بعد میں ہلکی پھلکی ورزش کرتا ہوں جس میں سٹریچنگ (Stretching) اور لائٹ ویٹ لفٹنگ (Light Weight Lifting) شامل ہے اور اگر آپ کے پاس سوانا باتھ اور بھاپ کے غسل (Steam Bath) کی سہولت ہو تو یہ صحت کے لئے نہایت عمدہ چیز ہے۔ میں سوانا باتھ میں زیتون کے تیل کی مالش کرنے کے بعد وہاں یوگا بھی کرتا ہوں۔

میں امریکہ میں لاس اینجلس فٹنس کلب (L.A Fitness Club) کا ممبر ہوں۔ وہاں پہ ہر کلب میں بڑے بڑے سوئمنگ پول ہیں۔ میں وہاں تیراکی کرتا ہوں اور کبھی پول میں اتنا تیز چلتا ہوں جتنا میں چل سکتا ہوں۔ ہر کلب میں اکوا کلاسز (Aqua Classes) بھی ہوتی ہیں جن میں سوئمنگ پول میں مختلف ایروبکس (Aerobics) ایکسر سائز کرنا ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پہ پانی میں کی گئی ورزش خشکی کی نسبت بہت فائدہ مند ہوتی ہیں۔ اس سے آپ کے جوڑوں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ کم ہو جاتا ہے۔ مجھے باسکٹ بال کھیلنا بھی اچھا لگتا ہے۔ کورٹ کی مختلف جگہوں سے تھری پوائنٹر پھینکنا مجھے بے حد پسند ہے۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ باسکٹ بال کھیلتا ہوں جس سے نہ صرف بازوؤں اور گردن بلکہ جسم کے دیگر حصّوں کی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔

امریکہ میں اپنے قیام کے دوران ساحل سمندر پہ جانا میرا معمول ہے۔ میں صبح سویرے بیدار ہوتا ہوں۔ تہجّد کی نماز ادا کرتا اور قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہوں اس کے بعد سیر کرنے ساحل کی جانب نکل جاتا ہوں۔ وہیں مناسب مقام تلاش کرکے فجر کی نماز ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں 5 سے 7 میل واک کرتا ہوں۔ واک کا آخری حصّہ یہ ہوتا ہے کہ میں جوتے اتار کر کمر پہ بندھے بیگ میں ڈالتا ہوں اور ننگے پاؤں ساحل کی گیلی

ریت پہ چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ گھر واپسی پہ ساحل سے تازہ مچھلی خرید لیتا ہوں۔ مچھلی ایک ایسی غذا ہے جس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔

کئی ایسی ورزشیں ہیں جو آپ چلنے کے دوران بھی کر سکتے ہیں مثلاً آپ سیدھ میں چلیں، پھر الٹا چلیں، سیدھے رہتے ہوئے دائیں کو چلیں، پھر اسی طریقے سے اس کے الٹ یعنی بائیں کو چلیں۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے وہ پٹھّے بھی استعمال ہونا شروع ہو جائیں گے جو پہلے کم استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بازوؤں کی ورزش بھی کی جاسکتی ہے۔ آپ بازوؤں کو نیم دائرے کی شکل میں گھما سکتے ہیں۔ آپ گہرے سانس لینے کی مشق بھی چلنے کے دوران کر سکتے ہیں یا اگر آپ لمبی قطار میں لگے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں تو آپ اس مشق کے ذریعے اپنے وقت کا بہترین استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ ایک گہرا سانس لیں۔ اسے آپ تب تک اپنے اندر رکھیں جب تک آپ برداشت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آہستگی سے باہر نکالیں۔ کبھی کبھار آپ اسے تیزی کے ساتھ بھی خارج کر سکتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازے سے کہیں زیادہ توانائی مہیّا ہو گی اور قوّت برداشت میں اضافہ ہو گا۔

اگر کیلی فورنیا کا موسم اچھا نہ ہو تو میں ساحل کے بجائے جم کا رخ کرتا ہوں۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں ساحل کی واک کے بعد جم پہنچ جاتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ آپ سیر یا ورزش باقاعدگی سے کریں۔ باقاعدگی اختیار کرنے سے اصل فائدہ ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ ہفتے میں ایک یا دو دن ورزش کرتے ہیں یہ اگرچہ بالکل نہ کرنے سے بہتر ہے مگر روزانہ ورزش کرنے کے مقابل کچھ بھی نہیں۔ کئی مرتبہ ایسے ہوتا ہے کہ میں رات کو دیر سے سوتا ہوں۔ مثال کے طور پہ آدھی رات کے بعد مگر اس کے باوجود میں صبح تین بجے بیدار ہو کے بعض مرتبہ جم کھلنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتا ہوں۔

راولپنڈی، اسلام آباد میں دسمبر اور جنوری میں سردی عروج پر ہوتی ہے۔

صبح کے وقت ہر طرف زمین پہ کہرا جما نظر آتا ہے۔ اس بلا کی سردی کے باوجود میں صبح ساڑھے چار (4:30) بجے گالف کلب پہنچ جاتا ہوں۔ ان دنوں یہاں فجر کی اذان صبح چھ (6) بجے کے آس پاس ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر موسم کی شدّت کی وجہ سے میں نے کوئی ناغہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ناغہ بہت لمبا ہو جائے۔

کیلی فورنیا میں واقع گھر سے لے کر صباہومز پہنچنے تک مجھے چالیس گھنٹے سے زائد وقت لگتا تھا (آج کل امریکہ سے دبئی تک براہ راست فلائٹ کی وجہ سے وقت کم لگتا ہے) ۔ میں عموماً فجر کے آس پاس یا اس سے کچھ دیر پہلے صباہومز پہنچتا ہوں، مگر بجائے اس کے کہ میں تقریباً دو دن کے سفر کے بعد آرام کروں، میں اپنا ٹریک سوٹ اور جوگر پہن کے لمبی واک پہ نکل جاتا ہوں کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میں کوئی ناغہ کروں اور سستی مجھ پہ غالب آ جائے۔

میں اور میری گولف

جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میں واک کرنے عموماً گولف کلب راولپنڈی جاتا ہوں۔ باقی لوگوں کی طرح میں بھی جاگنگ ٹریک پہ واک کرتا تھا۔ آئے روز میرا یہ احساس پختہ ہونے لگا کہ سخت زمین کا دباؤ میرے جوڑوں کے لئے خوشگوار نہیں۔ کچھ عرصہ تک میں صبر سے کام لیتا رہا پھر ایک دن میں گالف کے لئے بنے نرم گھاس کے میدان میں اتر گیا اور خوب واک کی۔ میں نے خاص طور پہ اس بات کا دھیان رکھا کہ میں گالف کھیلنے والوں کے لئے کسی پریشانی کا باعث نہ بنوں۔ پھر بھی کئی افراد نے مجھے روکا اور راہنمائی کی کہ واک کرنے کی جگہ ادھر نہیں، ادھر ہے۔ کچھ دیر بعد انتظامیہ کے افراد نے مجھے آ لیا۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ گھاس کا یہ میدان گالف کھیلنے کے لئے ہے، واک کرنے کے لئے نہیں۔

مخمل مانند گھاس کو چھوڑنا اور انتہائی سخت زمین پہ واک کرنے کا تصور ہی میرے لئے روح فرسا تھا۔ دوسرا واک کرنا میرے لئے اتنا ضروری تھا جتنا کھانا..... لہٰذا میں فکر مند ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ میں مسلسل سوچتا رہا۔ مجھے گھبرانا نہیں چاہیے..... میں خود کو سمجھاتا رہا..... مصیبت میں گھبرانا، مصیبت سے بڑی مصیبت ہوتی ہے۔

امریکہ میں میرے کچھ دوست گالف کھیلا کرتے تھے۔ انھی کے کہنے پہ میں نے ایک گالف سیٹ خرید رکھا تھا۔ میں ایک گالف انسٹرکٹر سے اس کی باقاعدہ کلاسز بھی لے چکا تھا مگر ابھی تک میں گالف کھیلنے پہ خود کو آمادہ نہ کر پایا تھا۔ میں نے سٹور روم سے گالف سیٹ نکالا، اسے جھاڑا اور اگلے دن ساتھ لے کر گالف کلب پہنچ گیا۔ اب مجھے نرم گھاس پہ چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

میں نے گالف تھوڑی ہی کھیلنی تھی۔ مجھے تو واک کرنی تھی۔ اب میرا گالف کھیلنے کا طریقۂ کار یہ تھا کہ میں بال کو ایک زوردار ہٹ لگاتا۔ پھر اس کے پیچھے چل پڑتا۔ بال کے قریب پہنچ کے پھر ایک زوردار ہٹ لگاتا۔ اگر راستے میں کوئی ناہموار جگہ آ جاتی یا بال کہیں پھنس جاتی تو میں اسے ہاتھ سے اٹھا کے ہموار جگہ پہ لے آتا، پھر وہاں سے ہٹ لگاتا۔ جبکہ باقی گالفرز اسے گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ وہ ایک تکنیک کے ذریعے بال وہاں سے نکالتے ہیں۔

ایک مرتبہ گالفرز کے ایک گروپ نے مجھے آ لیا۔ کہنے لگے کہ جس طریقے سے آپ گالف کھیلتے ہیں اس طرح تو آپ پورے اٹھّارہ ہول کھیلتے ہوں گے۔ میں ہنسا۔

"یقیناً، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی کہیں زیادہ۔"

زیادہ تر لوگ ایک گروپ کی شکل میں گالف کھیلتے ہیں۔ وہ تین یا پانچ لوگوں کا

گروپ بنا کے کھیلتے ہیں۔ ان میں سے ایک کھلاڑی بال کو ہٹ کرتا جب کہ باقی اسے دیکھتے ہیں۔ اس طرح بے پناہ انتظار کرنا پڑتا ہے اور بہت سا وقت ضائع ہوتا ہے۔ باری آنے پہ ہر کھلاڑی اپنی شاٹ کھیلتا ہے۔ اس دوران دیگر کوئی واک یا ورزش نہیں کر سکتے۔ اگلے ہول میں بال ڈالنے کے لئے یہ عمل پھر سے دہرایا جاتا ہے۔ جب یہ لوگ اس طرح کی گالف کھیل رہے ہوتے ہیں تو میں اپنی مخصوص نان سٹاپ گالف کھیل رہا ہوتا ہوں۔ میں ان سے زیادہ مرتبہ بال کو ہٹ لگاتا ہوں۔ اسی اعتبار سے ورزش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ میں زیادہ تر اس علاقے میں رہنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں زیادہ کھلاڑی نہ ہوں تاکہ میں ان کے کھیل میں رکاوٹ کا باعث نہ بنوں۔ میں کسی بھی عام گالفر کے مقابلے میں 4 سے 7 گنا زیادہ چلتا ہوں۔ اس دوران اپنے ہر منٹ کا لطف اٹھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ جب میں نے اپنے سپیڈو میٹر کو چیک کیا تو یہ تقریباً 14.7 میل بنتے تھے۔

ایک مرتبہ میرا آمنا سامنا چند گالفرز سے ہو گیا۔ میں نے ان سے بچنے کی خاطر تیزی سے بال کو ہٹ کیا۔ داد و تحسین کا غلغلہ بلند ہوا۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا جب دیکھا کہ بال سیدھی ہول کے اندر چلی گئی۔ یہ ناقابل یقین اتفاق یا خوش قسمتی تھی۔

جب انتظامیہ کے افراد نے مجھے یوں، بے پناہ گالف کھیلتے دیکھا تو بھونچکے رہ گئے۔ میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا میرے پاس گالف کی ممبر شپ ہے۔ میں نے کہا جی بالکل! کیا آپ دیکھنا چاہیں گے؟

اب باقی گالفرز میرے پاس آتے اور میری غیر روایتی گالف کی تعریف کرتے ہیں۔ پہلے میں ان کی بال سے بچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اب وہ مجھے دیکھتے ہیں تو میرا خیال کرتے ہیں اور بال کو تب تک ہٹ کرنے سے گریز کرتے ہیں جب تک میں گزر نہ جاؤں۔

میں سوا گھنٹے سے ڈیڑھ گھنٹے میں پورے اٹھارہ ہول مکمل کر لیتا ہوں جب کہ باقی

گالفرز ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں نو ہول کھیلتے ہیں اور میں آپ کو بتاؤں واک کے بجائے میں چلتی پھرتی گالف کھیلتا ہوں۔ یہ واک سے ملتی جلتی چیز ہے جس میں بے پناہ لطف ہے۔

اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ایک ہی کام کو کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ میں اگر دل چھوڑ کے بیٹھ جاتا تو اپنا نقصان کرتا۔ اگر سخت اور ناہموار زمین پہ واک کرتا تو میرے گھٹنے اور جوڑوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ مجھے کلب کے اصولوں کی بھی پاسداری کرنا تھی۔ لہٰذا میں نے اللہ پاک کی عطا فرمائی گئی عقل استعمال کی اور اپنا کام سیدھا کر لیا۔

خوراک

میں ہمیشہ اچھا ناشتہ کرتا ہوں۔ چکنائی کے بغیر دودھ اور بغیر زردی کے انڈے میرے ناشتے کا لازمی جزو ہوتے ہیں یا پھر سوکھی روٹی اور گھر کا بنا ہوا تازہ جوس لیتا ہوں۔ دوپہر اور رات کے کھانے کیلئے دال یا سبزی، جو زیتون یا سرسوں کے تیل میں بنی ہوتی ہے، استعمال کرتا ہوں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ قدرتی طور پر کاشت کردہ اپنی سبزیاں استعمال کروں۔ ان سبزیوں کے لئے ہم یوریا کھاد کے بجائے گوبر سے تیار کردہ قدرتی کھاد استعمال کرتے ہیں۔ یہ کھاد ہم خود تیار کرتے ہیں۔ میں نے امریکہ میں اپنے گھر کے پچھلے صحن میں سبزیاں اگا رکھی ہیں اور پاکستان میں بھی۔ پاکستان میں ہم نے دیسی مرغیاں پال رکھی ہیں جب کہ دودھ کے لئے ایک بکری بھی رکھی ہوئی ہے۔

پچھلے تقریباً پینتیس (35) سال سے میں نے گھی کا استعمال چھوڑ رکھا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ زیتون یا سرسوں کے تیل میں بنے کھانے استعمال کروں۔ میں عموماً روایتی پاکستانی کھانے، جو بلاشبہ انتہائی لذیذ ہوتے ہیں، استعمال نہیں کرتا۔ اگر کسی شادی بیاہ یا دیگر تقریبات میں ایسے کھانوں سے آمنا سامنا ہو تو کفران نعمت کرنے کے

بجائے میں کھالیتاہوں مگر اس دوران یہ کوشش کرتا ہوں کہ سلاد پہ زیادہ انحصار کروں۔ اگر سادہ غذا کو اپنے معمول کا حصّہ بنالیا جائے تو بہت اچھا ہے۔ کبھی کبھار مرغّن غذا کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر روزانہ استعمال سے گریز کیا جائے۔

مندرجہ ذیل چیزیں بھی صحت برقرار رکھنے میں میری مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

i) صبح سویرے خالی پیٹ دو بڑے گلاس پانی اور دن بھر میں کم از کم آٹھ گلاس پانی کا استعمال۔

ii) ہفتہ میں چند مرتبہ سونف، دار چینی، الائچی، ادرک اور پودینہ (Mint) کو پانی میں اچھی طرح ابال کر اس میں شہد ڈال کر قہوے کی صورت میں استعمال کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ادرک اور پودینہ کو باقی چیزوں کے قہوے میں ڈال کر اوپر سے دم دے دیتا ہوں۔

میری اچھی صحت کا ایک راز وقت سے پہلے منصوبہ بندی ہے۔ اس سے انسان کا ذہنی دباؤ ختم ہو جاتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام اپنے مقرّرہ وقت سے پہلے سرانجام دوں۔ براڈوے میں میری نوکری بہت مشکل تھی۔ اپنے باس کو رپورٹ پیش کرنا بائر / منیجر (Buyer/Manager) کے عہدوں کا سب سے مشکل کام تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہدے پہ موجود میرے دیگر ساتھیوں کا اس بارے میں کہنا تھا کہ ان کو یہ رپورٹ تیار کرتے وقت دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ کچھ منیجر کہتے کہ یار اس رپورٹ نے تو میرا پیٹ خراب کرر کھا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے کہ جس صبح انھیں رپورٹ پیش کرنی ہو اس سے پہلی رات انھیں نیند نہیں آتی وغیرہ لیکن میں چونکہ اس کے لئے پہلے سے ہی تیار ہوتا تھا اور اپنا کام مکمل کر چکا ہوتا تو مجھے یہ مشکل مرحلہ سرانجام دینے میں کبھی مشکل پیش نہ

آتی۔ میں اس موقع کا انتظار کرتا کہ کب مجھے اپنی رپورٹ پیش کرنی ہے۔ یہ میرے لئے خوشی اور فخر کا باعث ہوتا تھا۔

صحت کے اصول

اچھی صحت کا ایک راز یہ ہے کہ میں نے کبھی خود سے اوپر کے لوگوں کو نہیں دیکھا (I always lived below my means) میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر میرے پڑوسی کے پاس مرسڈیز ہے تو میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ میں ہمیشہ اپنے سے نچلے طبقے کے لوگوں کو دیکھتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت سے لوگوں سے اچھی حالت میں رکھا ہوا ہے۔

درج ذیل نکات اپنانے سے آپ کی صحت قابل رشک حد تک اچھی ہو سکتی ہے۔

☆ مثبت سوچ رکھی جائے، دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

☆ ہمیشہ مثبت انداز فکر اپنایا جائے۔

☆ اپنے خالق کا ہر دم شکر ادا کیا جائے۔

☆ صبح سویرے بیدار ہو کے اپنے عقیدے کے مطابق خدا کی حمد و ثناء کی جائے (چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم)۔

☆ اچھی اور متوازن خوراک استعمال کی جائے۔ سادہ اور قدرتی غذا پہ انحصار کیا جائے۔

☆ اچھی صحبت اپنائی جائے۔ اس سے آپ کی زندگی اور آپ کی صحت پہ ناقابل یقین حد تک اچھے اثرات پڑیں گے۔

☆ غیبت یا چغلی سے سختی سے پرہیز کیا جائے۔
☆ دوسروں کے اچھے کاموں کی تعریف کی جائے (خوشامد نہیں) ۔
☆ تعریف کی توقع یا خواہش نہ رکھیں۔
☆ بے لوث سخاوت پہ توجہ مرکوز رکھیں۔ آقا صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا! اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ دینے والا اور نیچے والا ہاتھ لینے والا ہے (مفہوم) ۔
☆ فضول بحث سے بچیں۔ بہت سے لوگ فضول بحث میں پڑ جاتے ہیں جو کئی مرتبہ حالات کو انتہائی ناخوشگوار بنا دیتی ہے۔
☆ غریب کی مدد ایسے انداز میں کریں کہ اسے شرمندگی نہ ہو بلکہ یہ احساس ہو کہ آپ اس کو اس کا حق دے رہے ہیں۔
☆ غریب طلباء کی ضرور مدد کریں۔
☆ نوجوانوں کو خاص طور پہ آگے لائیں۔
☆ اپنے اصولوں کا کسی قیمت پہ سودا نہ کریں۔
☆ بلاضرورت کسی مقابلہ بازی یا جھگڑے کا حصّہ نہ بنیں۔
☆ سخت محنت کریں۔ اپنی طرف سے بہترین کوشش کریں۔
☆ جو معاملات آپ کے اختیار میں نہ ہوں۔ ان کے بارے پریشان نہ ہوں۔
☆ سادہ اور مثبت طرز زندگی اختیار کریں۔
☆ کیفین خصوصاً کوک یا پیپسی سے پرہیز کریں۔

جب موت مجھے چھو گزری

اپنی صحت کا چاہے جیسا ہی خیال رکھا جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم ہر وقت

موت کے نشانے پہ رہتے ہیں۔ انسان ہمیشہ موت سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جب جان پہ بنتی ہے تو موت سے بچنے کے لئے اندھا دھند بھاگتا ہے۔ اپنے تیئں جائے امن پہنچتا ہے تو موت کو سامنے پاتا ہے۔ موت مسکراتی اور اسے گلے لگاتی ہے۔

کھربوں انسان دنیا میں آئے۔ کیا اپنی مرضی سے آئے.....؟ جب آ گئے تو دنیا میں زندگی اپنی مرضی سے گزاری۔ بھول گئے کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آئے تھے اور یہ بھی کہ زندگی جس نے دی ہے اس کی مرضی کو فوقیت دینی تھی۔ یہ بھی بھولے کہ ان سے پہلے کے انتہائی دانا اور بے حد طاقتور لوگ کہاں گئے؟ پھر بھی انھوں نے خود کو اور اپنی عقل کو برتر جانا۔ دل میں جو خواہش پیدا ہوئی، پورا کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ ایسے مصروف ہوئے گویا گہری نیند میں چلے گئے۔ آنکھ کھلی تو اس وقت جب موت کو سامنے پایا..... موت، جو مسکراتی اور گلے لگاتی ہے۔ نادان..... جب وجۂ کائنات نہ رہے..... تو کون رہے گا.....؟..... کل نفس ذائقة الموت..... ہر ایک..... ماسوا ایک.....۔

ہاں اگر آپ کی زندگی باقی ہے تو موت آپ کو چھو کے گزر جاتی ہے۔ ہلکا سا اشارہ دیتی..... جھلک دکھلاتی..... اور یہ کہتی..... پھر ملتے ہیں۔

(1) میں آٹھ سال کا تھا جب سخت بیمار ہو گیا۔ شروع میں مجھے ملیریا ہوا۔ اس کے بعد ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ آرام نہ کرنے اور بھرپور علاج نہ ہونے کی وجہ سے نمونیا کی شکایت ہو گئی۔ اس وقت ہم لوگ انڈیا میں تھے۔ یہ تقسیم سے تھوڑا عرصہ قبل کی بات ہے۔ وہاں علاج کی سہولیات اتنی عام نہ تھیں۔ حکیم سے علاج ہوتا رہا۔ میری حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ماں بے تابی سے پوچھتی "کیا یہ بچ جائے گا۔" اور ابا جی انھیں تسلّی دیتے رہتے۔ نہ جانے کیسے میں بچ گیا اور بالکل صحت مند ہو گیا۔ اللہ میاں نے اپنی رحمت سے شفاء عطا

فرمائی۔

(2) سعودی عرب میں اتنا بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ اس بیماری نے میری زندگی بدل دی۔ اس کی تفصیل علیحدہ بیان کر دی ہے۔

(3) جے۔ ایف۔ کینیڈی ائرپورٹ پر پی۔ آئی۔ اے کے جہاز کو حادثہ پیش آیا۔ جہاز نے ابھی اڑان بھری تھی کہ اس کے انجن میں آگ لگ گئی۔ اس وقت جہاز سمندر کے اوپر تھا۔ پائلٹ نے فوراً ہی جہاز کا فیول یعنی پٹرول سمندر میں گرا دیا ورنہ آگ مزید بھڑکنے کا اندیشہ تھا۔ کنٹرول ٹاور نے ہدایت کی کہ وہ جہاز کو فوراً واپس لے آئے۔ جب ہمارا جہاز واپس ائرپورٹ پہنچا تو وہاں ایمرجنسی نافذ تھی۔ ہر طرف ایمبولینسز اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں تھیں۔ مسافروں نے بڑی تیزی سے جہاز خالی کیا اور جہاز کی آگ بجھائی گئی۔ اس واقعے میں بھی اللہ پاک نے ہم سب کی جان بچائی۔ اگر جہاز سمندر کے درمیان ہوتا تو ہم سب کا بچنا مشکل تھا۔

(4) راولپنڈی سے میانوالی جاتے ہوئے ہماری کار کو ایک ٹرک نے ٹکر ماردی۔ ہم لوگ ایک تعلیمی منصوبے Development in Literacy (DIL) کو دیکھنے میانوالی جارہے تھے۔ یہ پروگرام میری بیگم نے اپنی دوستوں کے ساتھ مل کے شروع کیا تھا۔ وہ اس پروگرام کے بانی ممبران میں شامل ہیں۔ ہم لوگ تلہ گنگ سے کچھ آگے ہی پہنچے تھے کہ ہمارے سامنے سے ایک بس اور ٹرک ریس لگاتے ہوئے آگئے۔ ہمارے ڈرائیور نے بچنے کی پوری کوشش کی اور گاڑی کو ممکنہ حد تک بائیں جانب لے گیا مگر ٹرک نے تاک کے زوردار ٹکّر ماری۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو پتہ چلا میں بری طرح زخمی ہوں اور سر سے خون فوّارے کی مانند رواں ہے۔ جلد ہی لوگ اکٹھّے ہو گئے۔ ہماری گاڑی بری

طرح تباہ ہو چکی تھی۔ میں امریکی ماحول کا عادی تھا..... اس لیے زور سے چلاّیا
"ایمبولینس کو فون کرو جلدی۔"
آس پاس کھڑے لوگ چونکے اور میری طرف سے مشکوک نظر آئے۔ انھیں لگا جیسے میں دیوانہ ہوں یا شاید اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں..... صحرا میں پانی کھوجتا ہوں..... امریکہ میں اگر میں ہوتا تو پانچ منٹ کے اندر ایمبولینس آجاتی۔ چاہے میں شہر سے جتنا بھی دور ہوتا۔ میں اپنی جگہ ٹھیک تھا اور وہ اپنی جگہ..... وہاں ایمبولینس تو کیا، ایسی گاڑی تک نہ تھی جو مجھے ہسپتال لے جاتی۔
مجھے کھینچ کھانچ کے گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ اب کوئی گاڑی روکنے کی کوشش ہونے لگی تا کہ مجھے ہسپتال پہنچایا جاسکے۔ لوگ مختلف گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کرتے۔ زیادہ تر لوگوں نے گاڑی نہ روکی۔ اگر روکی بھی، تو معاملے کا پتہ چلنے پر معذرت کر لی۔ بڑی مشکل سے ایک گاڑی رکی مگر اس میں جگہ ناکافی تھی۔ بہر حال مجھے اس میں ٹھونس دیا گیا اور ساتھ ایک بندہ اور بھی بیٹھ گیا..... یوں ہم پیک ہو گئے..... مریض کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ یہ تلہ گنگ کا ایک سرکاری ہسپتال تھا۔ وہاں جو حال میرا ہوا وہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔
اگر چہ وہاں کے ڈاکٹرز نے اپنی طرف سے بہترین کوشش کی تاہم سر کے زخم پہ ایسے ٹانکے لگائے جو کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہ آسکے کہ یہ کیسے لگائے گئے اور ان میں کون سا دھاگہ استعمال ہوا۔ ابتدائی طبی امداد لینے کے بعد میں جب اسلام آباد واپس پہنچا تو سیدھا شفاء ہسپتال گیا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر یٰسین ڈیوٹی پہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے میرے زخم کا معائنہ کیا اور حیران ہو گئے۔ کہنے لگے
"ایسا دھاگہ تو ہم کالج میں سیکھنے کے دوران بھی استعمال نہ کرتے تھے۔ یہ تو پٹ

سن کے دھاگے کی مانند لگتا ہے۔ اب اگر اسے کھولنے اور نئے ٹانکے لگانے کی کوشش کی جائے تو یہ خطرناک ہو گا کیوں کہ یہ سر کا زخم ہے۔“ انھوں نے وہ ٹانکے ویسے ہی رہنے دیئے۔

میں جب امریکہ گیا تو ٹانکے کھلوانے ہسپتال گیا۔ نرس نے آہستگی سے ٹانکے کھولنے کی کوشش کی۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ یہ میرے لئے تکلیف دہ ہے تو اس نے دوسری نرس کو بلایا اور اس سے مدد مانگی۔ تھوڑی دیر بعد انھیں پتہ چلا کہ یہ ان کے بس کا کام نہیں تو انھوں نے اپنی سپروائزر کو بلا لیا۔ اس نے تھوڑی دیر کوشش کی مگر جلد ہی کہنے لگی کہ مجھے ڈاکٹر کو بلانا ہو گا۔ یوں ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ ان چاروں نے مل کر بڑی مشکل سے میرے ٹانکے کھولے۔ یہ ایسا حادثہ تھا جو مجھے ہمیشہ یاد رہا اور رہے گا۔

5) راولپنڈی سے مظفر آباد جاتے ہوئے حادثہ پیش آیا۔ ہم لوگ ڈرائیور کو بار بار سمجھاتے رہے کہ وہ گاڑی آہستہ چلائے لیکن اسے شاید حادثہ کرنے کی جلدی تھی۔ اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ انتہائی لاپروائی اور تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا یہاں تک کہ حادثہ کر کے ہی دم لیا اور تمام مسافروں سمیت خود کو مجروح کیا۔ میرے سر اور جسم کے دیگر حصوں پر زخم آئے۔ باقی مسافروں کو بھی چوٹیں آئیں۔ اب کی بار ہمارے ساتھ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر بھی تھے۔ وہ فوری طور پر مجھے فوجی فاؤنڈیشن ہسپتال لے گئے۔ جہاں پہ مجھے ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ شکر ہے یہ کوئی روایتی سرکاری ہسپتال نہ تھا۔ میرا بہت اچھا علاج کیا گیا۔

حضور پاک ﷺ نے فرمایا (مفہوم)

میں آپ کو حضور پاک ﷺ کی صحت کے بارے میں ایک حدیث کا مفہوم

سناتا ہوں تا کہ اس میں بیان کئے گئے نکات کو آپ یاد رکھیں اور ان پر عمل کریں۔ اگر پریشانی آپ سے دور رہے گی تو آپ یقیناً صحت مند اور خوش باش رہیں گے۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سنہری اصولوں کو آگے پھیلائیں۔

☆	**چار چیزیں آپ کو پریشان یا بیمار کرتی ہیں**			
	زیادہ باتیں کرنا	زیادہ سونا	زیادہ کھانا	زیادہ لوگوں سے میل جول
☆	**چار چیزیں آپ کو ختم کرتی ہیں**			
	پریشانی	غم	بھوک	دیر سے سونا
☆	**چار چیزوں سے چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے اور خوشیاں چلی جاتی ہیں**			
	جھوٹ بولنا	عزّت نہ کرنا یا کسی غلط چیز کے لئے اصرار کرنا	بغیر معلومات اور بغیر جانتے ہوئے بحث کرنا	کسی غلط چیز کو بے باکی سے، بغیر کسی خوف کے کرنا
☆	**چار چیزوں سے چہرے کی رونق بڑھ جاتی ہے**			
	پرہیز گاری	وفاداری	رحم دلی	دوسرے کے کہے بغیر اس کی مدد کرنا
☆	**چار چیزوں سے رزق کی فراوانی رک جاتی ہے**			
	صبح فجر سے طلوع آفتاب تک سونا	نماز نہ پڑھنا یا پابندی سے نہ پڑھنا	سستی کرنا	دھوکہ دینا
☆	**چار چیزوں سے رزق بڑھتا ہے**			
	راتوں کو اٹھ کر عبادت کرنا	اپنے گناہوں پہ بہت زیادہ پشیمان ہونا	مستقل خیرات کرنا	اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا

آپ ﷺ نے فرمایا "بلغو عنی ولو ایتہ"
(میری طرف سے دوسروں تک پہنچاؤ، چاہے ایک چھوٹی سی بات ہی کیوں نہ ہو) ۔(مفہوم)

پاکستان اور ادب و احترام

وقت آ گیا ہے کہ ملک کے نوجوان کو بھی فیصلہ اور حکومت سازی میں شریک کیا جائے۔ انھیں ادب اور احترام دیں۔ خصوصاً پاکستان میں نوجوانوں نے نجی سطح پر معجزات بپا کر رکھے ہیں۔ ان میں ہمارے حکمران طبقے کی نوجوان اولاد بھی شامل ہے۔ سب نوجوانوں کی پاکستان سے محبت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ نوجوان نسل ادب و محبت سے اپنے بزرگوں سے پوچھ سکتی ہے۔ کیا میں آپ کی مدد کروں؟۔ اب اس عمر میں مدد کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔

آپ دیکھیے کہ پاکستان کے نوجوانوں نے خاموشی کے ساتھ بتا دیا کہ وہ ایسے اپنی تہذیبی اقدار کے خلاف نہیں جائیں گے۔ ان کے بزرگوں نے انھیں دیگر بزرگوں کا احترام سکھایا ہے۔ اب آپ کیا سمجھتے ہیں اگر آپ پاکستان کی سیاست میں مخالف کی تضحیک نہ کریں تب تک آپ کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام تو کجا اپنے والدین کے اصول و ضابطے کی پروانہ کی۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے پاکستان کے مسلمان چاہے اسلام سے کیسے ہی دور ہوں انھوں نے اپنے والدین سے بزرگوں کا ادب و احترام ہی سیکھا۔ اب سیکھے پہ عمل کتنا ہوتا ہے یہ علیحدہ بات ہے۔

آپ یقین کریں نوجوانوں کو موقع دے کر دیکھیں وہ کبھی مایوس نہیں کریں گے۔

باب ہفتم

خلق خدا غائبانہ کیا کہتی ہے

مولانا وحید الدین صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ اسلامی مرکز دہلی کے صدر ہونے کے علاوہ بے شمار تصانیف کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا انداز فکر' ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ ان کی زیر سرپرستی اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والے ماہنامہ الرسالہ کے نومبر 2003ء کے ایڈیشن میں خاکسار کے بارے میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس کے منتخب اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

مولانا وحید الدین ماہنامہ الرسالہ نومبر (2003)

27 اگست 1957ء کو ایک مسلم نوجوان پاکستان سے امریکہ آیا۔ اس وقت اس کی عمر اکیس سال تھی۔ اس نے پاکستان میں بی۔ اے (B.A) کا کورس کیا تھا اور اب وہ امریکہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا مگر امریکہ Sacramento پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی B.A کی سند یہاں قابل قبول نہیں۔ چنانچہ اس کو دوبارہ پہلے Sacramento کے اسٹیٹ کالج میں دو سال رہ کر B.A کی ڈگری حاصل کرنی پڑی۔ اس کے بعد مسئلہ روزگار کا تھا۔ مگر مختلف کمپنیوں میں کوشش کرنے کے باوجود اسے روزگار نہیں ملا۔ مشکل سے 1961ء میں ایک کمپنی براڈوے ہیل میں ایک معمولی ملازمت ملی۔ جس کو امریکہ کی اصطلاح میں اسٹاک بوائے Stock Boy کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے تقریباً دس سال بعد 1970ء میں تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے کہ امریکہ کی ایک بڑی کمپنی Wanahmakers in Philadelphia اور Marshal Field in Chicago کو اپنی کمپنی میں خرید و فروخت کیلئے ایک بائیر Buyer کی

ضرورت تھی۔ ایک ایسا بائیر جو ممتاز طور پر لائق اور دیانت دار ہو۔ یہ کمپنی کی بے حد اہم پوسٹ تھی۔ جس کے ہاتھ میں 20 ملین ڈالر سالانہ سے زیادہ کا کاروبار ہوتا تھا۔ امریکی طریقہ کے مطابق ایک ایگزیکٹو ریکروٹر Executive Recruiter کمپنی کو یہ ٹھیکہ دیا گیا کہ وہ اس کیلئے مطلوبہ بائیر تلاش کر کے بتائے۔ اس کمپنی نے اپنے ذرائع کے مطابق پورے امریکہ کا سروے کیا، جس میں چند مہینے لگے۔ اس کے بعد اس نے مذکورہ کمپنی کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ پورے امریکہ میں سب سے زیادہ موزوں نوجوان جو اس کام کے لئے ملا ہے وہ صرف ایک ہے اور یہ نوجوان وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

یہ جناب صغیر احمد اسلم (پیدائش 1936ء) تھے جو اب لاس اینجلس میں رہتے ہیں۔ ان کو مذکورہ کمپنی کی طرف سے بائر کے اس عہدہ کی پیشکش کی گئی، جس کو وہ منظور نہ کر سکے کیونکہ اب وہ خود اپنے کاروبار میں اتنے مشغول ہو چکے تھے کہ انھیں کسی کمپنی میں ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ امریکہ میں آباد مسلمانوں کے درمیان ان محدود افراد میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے زیرو کے مقام سے آغاز کر کے یہاں ایسی ترقی حاصل کی جو بہت سے لوگوں کیلئے قابل رشک ہے۔ ترقی کا یہ سفر انھوں نے کیسے طے کیا۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں ہے۔ محنت اور دیانتداری۔

ان کی یہ داستان بہت لمبی ہے۔ انھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر آدمی بڑی سے بڑی ترقی کر سکتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ اس ترقی کی مطلوبہ قیمت ادا کرنے کیلئے تیار ہو۔ مثلاً 1961ء میں انھوں نے مختلف دفتروں اور کمپنیوں میں کام حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی انھیں کام دینے کیلئے تیار نہ ہوا۔ اس کا سبب غالباً وہی چیز تھی جس کو عام طور پر تعصب کہا جاتا ہے۔ کمپنی والوں کو پاکستان وغیرہ کے لوگ بیرون امریکی Foreigner دکھائی دیتے تھے جبکہ ان کا خیال تھا کہ کوئی امریکی ان کیلئے زیادہ مفید ہو سکتا ہے نہ کہ غیر امریکی آدمی۔

صغیر اسلم صاحب نے اپنی محنت اور دیانت داری کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ کمپنی کیلئے ایک نہایت مفید کارکن ہیں چنانچہ ان کو کام پر ایک ہفتہ گزرا تھا کہ کمپنی والوں نے ان کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کر دی۔ صغیر اسلم صاحب اس کمپنی میں 11 سال (1961-1972) رہے۔ کمپنی والوں نے ان کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک کیا۔ ہر سال ان کی تنخواہ بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انھوں نے خود اپنی مرضی سے کام چھوڑا تو انھیں کمپنی سے ملنے والی ماہانہ رقم پہلے سال کے مقابلہ میں پچیس گناہ زیادہ ہو چکی تھی۔ میں نے صغیر اسلم صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میرا احساس یہ ہے کہ وہ اس ہندی مقولہ کے مصداق ہیں کہ "سادھاڑن گنوں سے اسادھاڑن" بنتے ہیں۔

صغیر اسلم صاحب کی شخصیت جس بناء پر مجھے قابل تذکرہ نظر آئی وہ یہ کہ ان کی زندگی میں ہر انسان کیلئے سبق ہے۔ ان کی زندگی فطرت کے سادہ اصولوں پر عمل کر کے بنی ہے۔ ان کی زندگی کے اصول اتنے زیادہ سادہ ہیں کہ کوئی بھی شخص ان پر عمل کر سکتا ہے۔ جس طرح خود انھوں نے ان پر عمل کیا اور پھر ترقی کی۔ مثال کے طور پر ان کی زندگی کا ایک سادہ فارمولا ہے جس کو میں پازیٹو ایڈ جسٹمنٹ کہتا ہوں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ کسی سے کوئی معاملہ کر رہے ہوں گے اور پھر درمیان میں وہ آدمی ایک مختلف بات کہہ دے گا، ایسی حالت میں صغیر اسلم صاحب اس سے الجھنے کے بجائے یہ کہیں گے کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے اور پھر ایک لمحے میں بات ختم ہو جائے گی۔

چلو یہ بھی ٹھیک ہے کا یہ فارمولا ان کیلئے بے حد مفید ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ ذہنی ٹینشن سے پوری طرح بچے رہتے ہیں۔ جس میں بیشتر لوگ مبتلا نظر آتے ہیں۔ اپنے اس فارمولے کی بناء پر غصہ اور جھنجھلاہٹ، مایوسی اور بزدلی جیسی منفی چیزیں ان کے دل میں جگہ نہیں پاتیں۔ ان کو وہ نعمت پوری طرح حاصل ہے جس کو ذہنی سکون (Mental Peace) کہا جاتا ہے۔ مثلاً شعبان کی آخری تاریخ کی شام کو میں ان کے

یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ درمیان میں انھوں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی سی نیند لے لوں۔ اس کے بعد وہ گئے اور تھوڑی دیر سو کر ٹھیک مقرّرہ وقت پر واپس آ گئے۔ اپنے ذہن کو غیر ضروری باتوں سے خالی رکھنے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ رات کو سکون کی نیند سوتے ہیں۔ ان کا ہاضمہ ٹھیک کام کرتا ہے وہ اعصابی تناؤ سے بالکل محفوظ ہیں۔ 67 سال کی عمر ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی طرح کام کرتے ہیں اور یہ سب اس سادہ فارمولے کا نتیجہ ہے کہ چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ میرے نزدیک صغیر اسلم صاحب جیسے غیر لیڈر افراد ہی اس قابل ہیں کہ انھیں حقیقی لیڈری کا کریڈٹ دیا جائے۔ صغیر اسلم نے اپنی زندگی کی تعمیر کر کے دوسروں کو تعمیر کا راستہ دکھایا۔ اس کے برعکس، لوگ شہرت پانے کے مستحق ہیں کیونکہ بااعتبار نتیجہ انھوں نے اس کے سوا کوئی اور کارنامہ سر انجام نہیں دیا۔

امریکہ میں رہنے والے مسلمان عام طور پر یہاں کے کلچر کے مطابق، کوٹ پتلون کا لباس اختیار کر لیتے ہیں مگر صغیر اسلم صاحب یہاں بھی زیادہ تر کرتہ اور شلوار پہنتے ہیں۔ یہاں اکثر ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کی طرف سے (Entertainment) کے پروگرام ہوتے ہیں جن میں قوّالی، مشاعرہ، رقص و سرور جیسے تفریحی آئٹم ہوتے ہیں مگر صغیر اسلم صاحب ایسے پروگرام میں شرکت نہیں کرتے۔ حتّٰی کہ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ٹکٹ لا کر انھیں دے، تب بھی وہاں نہیں جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ اپنی بااصول شخصیت کو محفوظ رکھنے کیلئے ضروری ہے۔ مگر یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بے اصولی سے بچے ہوئے ہیں۔

1987 کی بات ہے کہ صغیر اسلم صاحب کی بڑی صاحبزادی صائمہ پروین اسلم امریکن نرسری سکول سے پڑھ کر آئی۔ گھر واپس آ کر بچّی کی زبان سے ایک لفظ نکلا۔ یہ ایک گندا لفظ تھا جس کو اس نے سکول میں سنا تھا۔ صغیر اسلم صاحب نے جوں ہی بچّی کی

زبان سے یہ لفظ سنا تو فوراًان کو احساس ہوا کہ ہماری قوم کے چھوٹے بچّے جو سیکولر اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں وہ وہاں نہایت غلط تربیت پا رہے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم کو ایک ابتدائی سکول کھولنا ہے۔ جہاں ہمارے بچے بھی پڑھیں اور دوسرے مسلمانوں کے بھی۔

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی اس وقت صرف ایک مسجد پر مشتمل تھی جو کہ پہلے ایک مسیحی چرچ تھا۔ اس کو خرید کر مسجد کی صورت دے دی گئی۔ صغیر اسلم صاحب سوسائٹی کے ذمہ داروں سے ملے اور کہا کہ ہمیں یہاں اپنے بچوں کیلئے ایک سکول کھولنا ہے۔ اس وقت لوگوں نے اس کو ایک خیالی بات سمجھا کیونکہ ظاہری حالات کے اعتبار سے سوسائٹی اس پوزیشن میں نہ تھی کہ وہ ایک سکول کھول سکے۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ یہ مسئلہ وسائل کا نہیں ہے بلکہ ہمارے لئے یہاں دوسرا کوئی انتخاب ہی نہیں۔

We don't have any other choice, we must have a school.

صغیر اسلم صاحب کئی ماہ تک سوسائٹی کے ذمہ داروں کے پاس جاتے رہے اور وہ لوگ ہر میٹنگ میں اسکول کے مسئلے کو ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ کئی ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ صغیر اسلم صاحب اپنا اصرار جاری رکھے ہوئے ہیں۔

He will not give up, he is persistent.

انھوں نے کہا کہ اچھا اگلے سال ہم سکول کھول دیں گے۔ اس کے بعد صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ آپ میں سے کتنے لوگ گارنٹی دیتے ہیں کہ آپ اگلے سال تک زندہ رہیں گے۔ یہ سن کر تمام لوگ چپ ہو گئے اور پھر کہا کہ ہم سکول کھولنے کیلئے تیار ہیں مگر ہمارے پاس زمین ہے نہ بلڈنگ اور نہ ہی استاد۔ صغیر صاحب نے کہا جہاں تک ٹیچر کا سوال ہے تو میں اور میری بیوی رضاکارانہ طور پر ٹیچر بننے کیلئے تیار ہیں۔

اس کے بعد 1988ء میں مسجد کے ساتھ ہی ایک کمرے میں اسکول کا آغاز کر

دیا گیا۔ صغیر اسلم صاحب نے نہ صرف خود بلکہ اپنے احباب کے ذریعے مسلسل اس سکول کیلئے ہر قسم کا تعاون فراہم کیا۔ یہاں تک کہ آج وہ ایک معیاری سکول کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی اپنی مستقل بڑی عمارت ہے۔ آٹھویں کلاس تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں 600 سے زیادہ اسٹوڈنٹ ہیں اور 21 ٹیچر (2003ء میں) کام کر رہے ہیں۔ اب صغیر اسلم صاحب کا اگلا خواب یہ ہے کہ وہ اس ادارہ کو ایک معیاری اسلامک یونیورسٹی بنا دیں اور حالات جس طرح ترقی کر رہے ہیں بظاہر ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔

صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پچھلے تقریباً 50 سال کے دوران مسلسل ان کی ڈیلنگ یہاں کے سفید فام اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رہی ہے۔ اس دوران انھیں سفید فام لوگوں کو بہت قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے سفید فام لوگ بہت دیانتدار ہیں۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، وہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام دیتے ہیں۔ وہ کسی کو دھوکہ نہیں دیتے، وہ اپنی غلطی کو فوراً مان لیتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ان کی رائے پوچھی جائے تو ہمیشہ سنجیدگی کے ساتھ بات سنیں گے اور سنجیدگی کے ساتھ اس کا جواب دیں گے۔

1972 کی بات ہے کہ صغیر اسلم صاحب ایک سفر کے دوران لاس اینجلس ائر پورٹ پر تھے۔ ان کو سان فرانسسکو جانا تھا۔ کہر (Fog) کی وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا۔ ائرپورٹ پر جہاں وہ بیٹھے تھے، پاس کی کرسی پر ایک اور مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ تعارف کے دوران اس نے بتایا کہ وہ ڈیرل لیمونکا (Daryl Lamonica) ہے جو کہ کوارٹر بیگ فار ڈاکلینڈ رائڈرز (Quarter Back For Dakland Raiders) کا کھلاڑی ہے۔ امریکن فٹ بال کی دنیا کا بہت بڑا اور مشہور کھلاڑی ہے۔ ائرپورٹ اور بعد میں ہوائی جہاز کے اندر لوگ اس کے پاس آتے رہے اور جھک کر اس سے ملتے رہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت سمجھتے تھے کہ وہ ایک بڑے مشہور فٹ

بال کھلاڑی سے مل رہے ہیں مگر صغیر اسلم صاحب اس سے ایک عام انسان کی حیثیت سے ملے۔ اس نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ آپ میری زندگی میں پہلے انسان ہیں جو اس طرح مجھے مل رہے ہیں جیسے کہ ایک عام آدمی سے مل رہے ہیں ورنہ میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ مجھے ہیرو کے انداز میں دیکھتے ہیں اور میرا والہانہ استقبال کرتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب اور ڈیرل لیمونکا کا جہاز جب سان فرانسکو پہنچا تو ڈیرل لیمونکا نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ یہ میرا بزنس کارڈ ہے اور گھر کا فون نمبر اس پر لکھا ہے۔ بڑے لوگ عام طور پر گھر کا نمبر کسی کو نہیں دیتے اور کہا کہ جب بھی آپ سان فرانسکو آئیں تو میرے یہاں ضرور آئیں۔ میں آپ کو فٹ بال گیم دیکھنے کیلئے پہلی صف میں سیٹ لیکر دوں گا۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ مجھے فٹ بال میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ صغیر اسلم صاحب کی شخصیت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کار میں بٹھا کر ان کو ائرپورٹ سے ہوٹل تک پہنچایا، پھر وہ اپنے گھر گیا۔ آخر میں رخصت ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ کہا کہ اگر آپ کو فٹ بال سے انٹرسٹ نہیں ہے تب بھی آپ میرے گھر پر آئیں اور کم سے کم ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔

اس طرح کے واقعات صغیر اسلم صاحب کے ساتھ بار بار پیش آئے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک بڑا آدمی ان لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا جو اس کی بڑائی کا اعتراف کر کے اس کو زبردست عزت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس صغیر اسلم صاحب جیسا آدمی جو سرے سے اس کی بڑائی کا اعتراف ہی نہیں کرتا اس کو وہ اتنا زیادہ قابل توجہ سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ استثنائی طور پر خلوص کا معاملہ کرتا ہے۔

امریکہ کے موجودہ سفر میں میرا قیام زیادہ تر صغیر اسلم صاحب کے گھر پر رہا۔ ان کی باتیں اور کام مجھے عام لوگوں کے مقابلہ میں بہت مختلف نظر آئے۔ ان میں ایک انوکھی صفت میں نے یہ پائی کہ ان کے خلاف اگر کوئی سخت بات کہی جائے یا ان پر تنقید

کی جائے تو وہ اس پر ناراض نہیں ہوتے بلکہ نہایت معقول انداز میں سنتے ہیں۔ ان کے اس مختلف مزاج کا راز کیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے ایک واقعہ سے ہوا۔

امریکی ریستوران میں یہ رواج ہے کہ ان کے ہاں ایک ڈاگی بیگ(Doggy Bag) ہوتا ہے۔ یعنی کتے کا پیکٹ۔ جو لوگ ریسٹورنٹ میں کھانے کیلئے آتے ہیں۔ جب ان کا کھانا بچ جاتا ہے تو ان کو یہ بیگ دیا جاتا ہے کہ اپنا کھانا اس میں رکھ لیں تاکہ کھانا ضائع نہ ہو۔ تقریباً 25سال پہلے کا واقعہ ہے۔ صغیر اسلم صاحب نے نیو یارک کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ کھانا بچ گیا تو حسب قاعدہ ہوٹل کے ویٹر نے انھیں ایک خالی ڈاگی بیگ دیا اور کہا کہ اپنا بچا ہوا کھانا اس میں رکھ لیں اور واپس جا کر اپنے کتے کو کھلا دیں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ یہ میرے لئے انسانی بیگ ہے نہ کہ ڈاگی بیگ، میں جا کر اس کو خود ہی کھاؤں گا۔

یہ واقعہ میں نے سنا تو فوراً میری زبان سے نکلا کہ آپ بلاشبہ ایک بہادر آدمی ہیں۔ ایک بہادر آدمی ہی اس قسم کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس کے بعد میری سمجھ میں آگیا کہ صغیر اسلم صاحب کے اندر جو غیر معمولی صفات ہیں ان کا راز کیا ہے۔ ان کا راز یہ ہے کہ وہ ایک بہادر آدمی ہیں۔ بزدل انسان بے برداشت ہوتا ہے، وہ ہر بات کو اپنی عزت کا سوال بنالیتا ہے۔ اس کے برعکس بہادر انسان برداشت والا انسان ہوتا ہے، وہ عزت اور بے عزتی کی اصطلاح میں نہیں سوچتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کوئی بات از روئے واقعہ کیا ہے، نہ یہ کہ اس کی شخصیت سے اس کا کیا تعلق ہے۔

جے سالک (سابق وفاقی وزیر، چیف آرگنائزر پاکستان ہیومن رائٹس پارٹی)

صبا ٹرسٹ کے چیئرمین صغیر اسلم صاحب کو میں بہت اچھے طریقے سے جانتا ہوں، وہ تعلیم، صحت، آسان قرضہ جات کی فراہمی اور غربت کے خاتمے کیلئے کام کر رہے ہیں۔ جہاں پہ ضرورت ہو وہاں کپڑے، غذا اور دواؤں کی ترسیل یقینی بناتے ہیں اور

وہ پچھلے چالیس سال سے یہ خدمت باوقار انداز میں سرانجام دیتے آرہے ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں مختلف مذاہب خصوصاً عیسائیت کے ساتھ امن، محبت اور ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے مختلف سیمینار منعقد کروائے اور اس کیلئے انھوں نے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مدعو کیا۔ انھوں نے اپنے اچھے کردار کی بدولت اسلام کی خدمت کی ہے۔ مجھے ہمیشہ ان کے ساتھ کام کرکے اور ان کے پروگرام میں شرکت کرکے اچھا لگا۔ میں ان کی کامیابی کیلئے دعاگو ہوں۔

حمید اللہ جان آفریدی (سابق وفاقی وزیر برائے ماحولیات)

میں خود کو صباٹرسٹ کے لئے وقف کرتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ مجھے صباٹرسٹ کا حصہ بنایا جائے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میں صباٹرسٹ کے لئے کسی بھی طرح کچھ کرسکوں۔ میں صغیر اسلم صاحب سے بے حد متاثر ہوں۔ میں نے اس قسم کا ادارہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اللہ پاک کی بے پایاں رحمت ہے۔ اللہ پاک ان سب کے اوپر دنیا اور آخرت میں اپنا کرم فرمائے جو لوگوں کے لئے اچھا کام کررہے ہیں۔ پاکستان کا مستقبل بے حد روشن ہے۔

ابرار الحق (سنگر، چیئرمین سہارا ٹرسٹ)

مجھے خوشی ہے کہ ٹرسٹ کی جانب سے غیر معمولی جذبے سے فلاحی خدمت کا کام کیا جارہا ہے۔ یہ بے حد متاثر کن اور سوچنے پہ مجبور کرتا ہے۔ میں خود ایسا ہی کام کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ اللہ پاک ان سب کے اوپر دنیا و آخرت میں اپنا رحم فرمائیں جو ایسا اچھا کام کررہے ہیں۔ پاکستان کا مستقبل بے حد روشن ہے۔ (ابرار الحق کے تاثرات صباہومز کے بارے میں ہیں)۔

ڈاکٹر ریوفن جولیس (سابق ایم۔این۔اے)

مسٹر صغیر اسلم اور ان کے ادارے کی غیر معمولی فلاحی خدمات پہ ان کو سراہا جانا چاہیے۔ ضرورت مند لوگوں کی مدد کیلئے ان کے ادارے نے چالیس سال پہلے اپنے کام کا آغاز کیا اور آج ان کے ادارے نے لاکھوں ضرورت مند افراد کو نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہمسایہ ممالک میں بھی اپنی خدمات سے مستفید کیا ہے۔ مسٹر صغیر اسلم اور ان کے ادارے نے بنیادی ضروریات زندگی سے محروم لوگوں کو، خوراک، لباس، دواؤں اور تعلیم کے شعبوں میں خدمات مہیا کی ہیں۔ ان کے ادارے نے بلا رنگ و نسل لوگوں کی خدمت کی۔ انھوں نے اپنی فلاحی خدمات بلا تفریق کا دائرہ کسی مخصوص فرقے تک محدود نہ رکھا اور مختلف مذہب، فرقے اور عقیدے کے لوگوں کو ان کی فلاحی خدمات سے فائدہ پہنچا۔ انھوں نے محروم طبقے کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اپنے ذاتی مفادات کو پیش نظر نہ رکھا۔

پیٹر ای سیکلے (علاقائی صدر۔ دی چرچ آف جیسس کرائسٹ آف لیٹر ڈے سینٹس)

آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے میرے اور میری شریک حیات کے بارے مہربانی سے سوچا۔ ہم بہت سارے فلاحی منصوبوں میں مصروف عمل رہے ہیں مگر اس قسم کا ادارہ پہلے نہیں دیکھا۔ آپ کی ذاتی لگن بے مثال ہے۔ زیادہ تر لوگ عطیّات میں سے اپنے ذاتی خرچ کے لئے پیسے نکالتے ہیں۔ آپ نہ صرف ایسا نہیں کرتے بلکہ آپ اپنا سو فیصد وقت، صلاحیت اور ذرائع دوسروں کے لئے وقف کرتے ہیں۔ میں نے اتنی توجہّ سے کسی کو ایسا کام کرتے نہیں دیکھا، جس میں آپ نہ صرف غریب لوگوں کی مدد کرتے ہیں بلکہ بچیّوں کی صلاحیتوں کو بڑھانے میں بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں جس سے یہ بچیّاں باقی لوگوں کے لئے راہنمائی کا ذریعہ بنیں گی۔ میں انتہائی متاثر ہوا ہوں۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ نہ صرف بہت خاص ہے بلکہ ایک عظیم منزل آپ کے سامنے ہے۔ آپ جو

کچھ کر رہے ہیں اس کے لئے آپ کا شکریہ۔

نٹ سویٹ (امریکی تاجر۔517 ایل۔ سٹینلے۔لاس اینجلس امریکہ 7 جولائی 1976ء)

میں صغیر اسلم کو 1965 سے جانتا ہوں اور ان کے ساتھ کاروباری لین دین رکھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ انھیں کھرا اور قابل اعتماد گاہک پایا۔ انھوں نے مجھے اپنے الفاظ یا دوسرے معاملات میں شک کرنے کا موقع نہیں دیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم سالوں تک اچھے دوست رہیں گے۔

فرینک۔ ایل۔ بلیک (منیجر براڈوے۔ نیویارک)

میں پچھلے دس سال سے صغیر اسلم کو جانتا ہوں۔ انھوں نے براڈوے میں میرے ساتھ بائر کی حیثیت سے کام کیا ہے اور گولڈن نیڈل کے مالک کی حیثیت سے میں نے ان کو قابل، ایماندار اور قابل اعتماد پایا۔ صغیر اسلم نہ صرف یہ کہ ایک بہترین تاجر ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے اور مہربان انسان بھی ہیں۔

جیک لین (پریزیڈنٹ۔ ہیڈ ہنٹرز)

میں پچھلے انتالیس (39) سال سے کمپنیوں کے لئے بہترین ملازم ڈھونڈنے کا کام کر رہا ہوں۔ مجھے کبھی کسی کے بارے میں ایسے غیر معمولی حوالے نہیں ملے جیسے آپ کے بارے میں ملے ہیں۔ مسٹر صغیر !یہ ناقابل یقین لگتا ہے۔ مجھے آپ پہ فخر ہے۔

(جیک لین کی کمپنی ہیڈ ہنٹرز کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے بائر، منیجر تلاش کرنے کا کام سونپا گیا۔ جس کے لئے انھوں نے پورے امریکہ میں سے متعلقہ لوگوں کے انٹرویو کئے ان کے بارے میں دوسرے لوگوں کی رائے لی۔ اس کے بعد صغیر اسلم کو مندرجہ بالا تاثرات لکھے)۔

ڈاکٹر احمد سکر (صدر فاؤنڈیشن فار اسلامک کالج۔ امریکہ)

صغیر اسلم نہ صرف کیلی فورنیا اور امریکہ بلکہ بہت سے دوسرے مسلمان ممالک میں بھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ایک نرم خو اور مہربان شخصیت ہیں۔ انھوں نے مسلم و غیر مسلم لوگوں تک اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کیلئے بہت سی مساجد، مدارس اور دوسرے تعلیمی اداروں کی بھرپور مدد کی۔ وہ یتیموں کی مدد بھی کرتے ہیں اور یتیموں کیلئے ایک تعلیمی ادارے کو جلد از جلد بنانے کیلئے کوشاں ہیں۔ (صبا ہومز اس وقت زیر تعمیر تھا)۔ ہم ان سب کیلئے دعا کرتے ہیں جو یتیموں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر یحیٰی عبدالرحمن (سابق چیئرمین شوریٰ کونسل آف ساؤتھ کیلیفورنیا، چیئرمین بورڈ، صدر لاریبہ بینک آف وٹیئر۔ شمالی امریکہ)

میں اور صغیر اسلم 1978ء سے ایک ساتھ مختلف نوعیت کے فلاحی کام کرنے میں مصروف ہیں۔ نیشنل ایسوسی ایشن اور وٹیئر بینک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے مسٹر صغیر اسلم کے فلاحی اور کاروبار کے وسیع تجربات سے استفادہ حاصل کیا۔

مسٹر صغیر اسلم نے اپنی کوشش سے ساؤتھ کیلی فورنیا کی مسلم کمیونٹی کو معاشرے میں باعزّت اور متاثر کن کردار ادا کرنے کیلئے تیار کیا۔ انھوں نے ساؤتھ کیلیفورنیا کی سیاسی قیادت، قانون نافذ کرنے والے اداروں، تاجر برادری اور مذہبی ہم آہنگی کیلئے کام کرنے والے افراد کے ساتھ شاندار تعلّقات قائم کیے۔

ابو بکر وکیل (امریکہ)

صبا ٹرسٹ کے چیرمین صغیر احمد اسلم میرے بڑے اچھے دوست ہیں۔ جب میں

حالیہ سال فروری کے مہینے پاکستان جانے کا پروگرام بنا رہا تھا تو مجھے انھوں نے مذہبی ہم آہنگی کانفرنس کا بتایا جو 24 اپریل کو اسلام آباد میں ہونے جا رہی تھی۔ "آپ برائے مہربانی اس میں شرکت کریں۔ میں آپ کو دیگر جگہوں پر بھی لے جاؤں گا جہاں پر صباٹرسٹ دوسرے لوگوں کی جاں فشانی سے مدد کر رہا ہے۔" انھوں نے مجھے کہا اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے ان کی بات مانی۔

میں نے ہر جگہ دوستانہ ماحول دیکھا۔ وہ مجھے صباٹرسٹ کے صدر دفتر بھی لے گئے جہاں میں نے صباٹرسٹ کی جانب سے ضرورت مندوں میں خوبصورت تحائف تقسیم کئے۔ صغیر اسلم صاحب نے مجھے ضرورت مند خاندانوں کے لئے رکھا گیا جہیز بھی دکھایا۔ میں انھیں تنہا اتنے سارے کام کرتے دیکھ کر حیران ہوا اور اس میں وہ اپنے ذاتی معاملات سے بھی ناانصافی نہیں کرتے۔ اگرچہ انھیں اپنے خاندان اور دوسرے چند لوگوں کی بھی مدد حاصل ہے تاہم بہت سے لوگ مل کے بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو وہ تن تنہا کر رہے ہیں۔ ان کی تمام کاوشوں کو نہ صرف تسلیم کیا جانا چاہیے بلکہ ان کی ہر ممکن مدد بھی کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر مزمّل۔ ایچ صدیقی (کیلیفورنیا، امریکہ)

میں صغیر اسلم صاحب کو پچھلے پچّیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ ایک متّحرک اور خود کو دوسروں کیلئے وقف کر دینے والے انسان ہیں۔ انھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ساؤتھ کیلیفورنیا کی مسلم کمیونٹی کی خدمت کی۔ وہ اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے بانی ممبران میں شامل ہیں اور بڑی فیاضی سے تنظیم کی مدد کرتے ہیں۔ انھوں نے تنظیم کے چیئرمین بورڈ آف ٹرسٹیز، صدر، بورڈ آف ڈائریکٹرز اور دوسرے اہم عہدوں پر خدمات سرانجام دیں اس کے علاوہ اورنج کریسنٹ سکول بلڈنگ کمیٹی اور مسجد الرحمن کی بلڈنگ کمیٹی کے چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ انھوں نے اسلامک

سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے زیر اہتمام دو بین الاقوامی سیرت کانفرنسز کی صدارت بھی کی۔ انھوں نے متعدّد تعلیمی اور خیراتی ادارے پاکستان اور امریکہ میں قائم کئے۔

مسٹر صغیر اسلم متحّرک، نظم وضبط اور وقت کے پابند ہیں۔ وہ مسلم کمیونٹی کے علاوہ بلا تفریق رنگ و نسل خدمت خلق میں مصروف رہتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ صغیر اسلم صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ موجودہ اور آنے والی زندگی میں ان پر اپنی رحمت اور برکت نازل فرمائے۔ (آمین)

انور احمد خان (جنرل منیجر۔ اسلامی ریلیف۔ امریکہ)

صبا ٹرسٹ کے چیئر مین صغیر اسلم اور ان کی دختر عائشہ اسلم نے بہت سال اسلامک ریلیف کے مختلف شعبوں میں کام کیا۔ انھوں نے اسلامک ریلیف کے پلیٹ فارم سے کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلسطین اور ڈارفر میں خدمات سرانجام دیں۔ زلزلہ زدگان کیلئے گراں قدر کام سرانجام دیئے۔

2005 میں آنے والے تباہ کن زلزلے میں صبا ٹرسٹ اور انٹرنیشنل ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے کپڑوں کے علاوہ دوسرا سامان زلزلے سے متاثّرہ علاقوں تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ جہاں پہ بھی ان کی ضرورت پڑی، وہاں فوراً مدد کیلئے پہنچے اور اپنے دوستوں کو بھی عطیاّت دینے کیلئے متحّرک کیا۔ ہم اسلامک ریلیف کا حصہ ہونے کے ناطے صغیر اسلم اور عائشہ اسلم کو اپنا بہترین مددگار اور دوست تصور کرتے ہیں اور یہ بات بہت سارے لوگوں کے علم میں ہے کہ وہ نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ بہت سی تنظیموں مثلاً (Ummah Clinic, NIDAC, CAIR) اوراورنج کریسنٹ سکول (Orange Crescent School) کی مدد بھی کرتے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے پر فخر ہے۔ میں ان کو ایک لیڈر کے طور پر دیکھتا ہوں جو دوسروں کو خود پہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی دختر عائشہ اسلم نوجوانوں کیلئے مشعل راہ ہیں جو اس دنیا کو رہنے کیلئے

ایک اچھی جگہ بنانے میں مصروف عمل ہیں۔

سوخی کینگ (میئر پروٹم، اروائن سٹی۔امریکہ)

میں آپ کی فلاحی خدمات کی تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتا جو آپ پاکستان میں سرانجام دے رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اس حقیقت کا اعتراف متاثر کن ہے۔ پچھلے دنوں مجھے آپ کے ایک شاندار منصوبے کا پتہ چلا، جو آپ راولپنڈی میں یتیم بچّیوں کے لئے شروع کر رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اس عظیم کارنامے نے مجھے قلم اٹھانے اورآپ کی تعریف کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے کسی تعصّب کے بنا باہر کے لوگوں کی مدد کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ آپ کی کام کے ساتھ لگن اور آپ کی روشن ضمیری کی واضح دلیل ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ روز مرّہ بنیادوں پر فلاحی کاموں میں حصہ نہیں لیتے۔اس کے برعکس آپ اپنے گھر (Irvine USA) کو بھی اس اعلیٰ مقصد کیلئے چھوڑ کر دور دراز علاقے میں گئے۔

میں پچھلے تیرہ سالوں سے اروائن میں رہ رہا ہوں اور مجھے یہ جان کر فخر ہوا کہ میرا ہم وطن بے آسرا اور غریب لوگوں کی اس طریقہ سے مدد کرکے تاریخ رقم کر رہا ہے۔ آپ لوگوں کیلئے نعمت خداوندی ہیں اور آپ کی اس کاوش سے راولپنڈی شہر کی بچیوں کی زندگی میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ میں آپ کے ان کارناموں سے بہت متاّثر ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ جس عظیم مقصد کیلئے کام کر رہے ہیں اس میں آپ کو کامیابی حاصل ہو۔

رچرڈ جے کوہن۔ سیلز منیجر (کے۔اے سان فیبر کس۔ کیلی فورنیا)

کاروباری دنیا میں میری شناسائی صغیر اسلم صاحب کے ساتھ بہت عرصے سے ہے۔ میں ان کے الفاظ کو ان کا عہد تصوّر کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے الفاظ کا پاس کرتے ہیں اور کاروباری دنیا میں صغیر اسلم صاحب کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ٹم جانسن (امریکی سینیٹر)

پچھلے ہفتے عطیّات اکٹھّے کرنے کی تقریب کی میزبانی کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اس تقریب میں بڑا لطف آیا۔ پاکستانی نژاد امریکیوں کے لئے آپ کی مدد اور تعاون قابل ستائش ہے۔ ہمارے عطیّات اکٹھے کرنے کی مہم کے دوران آپ کے فیاّضی سے تعاون کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ جیسا کہ الیکشن کے دن قریب ہیں تو میں اور باب اس مدد اور آپ کی دوستی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کی مدد سے یہ ممکن ہو گا کہ میں ساؤتھ ڈاکوٹا کے لئے ایک مہم شروع کروں۔ ایک ایسی مہم جس میں ساؤتھ ڈاکوٹا اور اس سے متعلّقہ تمام مسائل پر توجہ دی گئی ہو جو ہم سب کے لئے اہم ہیں۔

مقابلہ یقیناً سخت ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے مدد گاروں کے تعاون سے ہم اس نومبر میں جیت جائیں گے۔ میں آنے والے مشکل حالات کے ساتھ آئندہ مہینوں میں آپ کے ساتھ کام کرنے کی توقّع رکھتا ہوں۔

ڈینا رہرابیکر (کانگریس ممبر)

صبا ٹرسٹ کے پاکستان میں چلنے والے منصوبوں، مثلاً نوجوانوں کے تعلیمی مراکز، مذہبی ہم آہنگی کی کانفرنسیں اور چھوٹے قرضوں کی فراہمی کے ذریعے معاشی ترقّی، کی ضرورت جتنی اب ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ میں صغیر احمد اسلم کو پچھلے پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ میں جب بھی ان سے ملتا ہوں تو ان کے کارناموں کے بارے میں سن کر حیران رہ جاتا ہوں۔ میں اورنج کاؤنٹی رجسٹر میں چھپنے والے آرٹیکل سے حقیقت میں بہت متاثر ہوں۔ آپ پوری دنیا میں غریب اور ضرورت مند افراد کی مدد کرتے نہیں تھکتے۔ آپ کے کارنامے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔

کرسٹوفر کاکس (ممبر آف کانگریس)

میں بڑے ہی خلوص سے آپ کی سالہا سال کی دوستی اور مدد کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دل سے اس کی قدر کرتا ہوں۔ یہ میرے لئے بڑے ہی اعزاز کی بات ہے۔ آپ کی دوستی اور مدد کا ایک مرتبہ پھر شکریہ!۔ میرے نزدیک اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر عطا (چیئرمین سوسائٹی فار انٹرنیشنل ہیلپ)

صبا ٹرسٹ کی عمارت اندر اور باہر ہر دو طرف سے شاندار ہے۔ میں اپنا پہلا دورہ آپ کی عطیہ کی گئی ایمبولینس کے حوالے سے کرنا چاہ رہا ہوں۔ امید ہے کہ ہم اسے "شفا کمیونٹی ہیلتھ سنٹر" تحصیل فتح جنگ کی طرف لے جائیں گے اور مہینے میں دو مرتبہ اس (موبائل ہسپتال) کو وہاں لے جانا مستقل بنا دیا جائے۔ صغیر! آپ کو علم ہے لوگ اسے "موبائل ہسپتال" کا نام دیتے ہیں۔

شکیل سیّد (ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ اسلامک شوریٰ کونسل)

مجھے صغیر اسلم، صبا ٹرسٹ اور انٹرنیشنل ایجوکیشن کی عوام کے لئے لاتعداد اور بڑے پیمانے پر کی گئی کوششوں کو متعارف کراتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے۔ ان کا کام عقیدے، رنگ، نسل، صنفی اور طبقاتی امتیاز سے بے حد بالاتر کوششیں، انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ میں ان کی تمام کوششوں کو سراہتا اور ان کی تائید کرتا ہوں۔

ڈاکٹر یاسمین قاسم (دوست)

میں صبا ٹرسٹ کے بارے میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ پاکستان میں نادار اور ضرورت مند لوگوں کے لئے عظیم کام کر رہا ہے۔ میں جب اسلام آباد آئی تو میں نے وہاں پر ضرورت مند اور غریب لوگوں میں کپڑے تقسیم کئے۔ ہم نے گیارہ (11) بجے

کپڑے تقسیم کرنے تھے مگر صبح کے چھ (6) بجے سے ہی مرد، عورتیں اور بچّے اکٹھّے ہو گئے تھے۔ اس منظر نے میرے دل پہ عجیب اثر کیا۔ میرا خیال ہے اگر لوگ کپڑے عطیہ کرتے ہیں اور خصوصاً بچیوں کی شادی کے لئے بھاری کام والے کپڑے، تو یقیناً اس کے صلے میں اللہ پاک انھیں ضرور نوازے گا۔

تھامس ایل تھار کلسن (بشپ، کیلی فورنیا، امریکہ)

مجھے آپ کو بتانا ہے کہ صغیر اسلم انتہائی عظیم انسان ہے جو اپنی زندگی اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر چکا ہے۔ ہم نے انھیں جو ایمبولینسز عطیہ کی ہیں انھوں نے ان کا استعمال بھرپور مثالی انداز میں کیا ہے۔ ہمیں ان کے استعمال بارے جو رپورٹس موصول ہوئی ہیں وہ بہت متاثر کن ہیں۔ میں نے پورے پاکستان میں صحت اور تعلیم کے موضوع پر بڑے بڑے راہنماؤں سے ملاقات کی ہے حتّٰی کہ میں وزیر اعظم اور دیگر اعلیٰ درجے کے حکّام سے ملا، مگر صغیر اسلم کے ارادے اور منصوبے سب سے جدا اور اچھے ہیں۔ خصوصاً انھوں نے برادر جیکسن کے ساتھ مل کے جو کام کیا ہے، وہ افسانوی لگتا ہے۔ وہ ایمانداری اور دیانت میں سب سے بڑھ کے ہیں۔ جو بھی انھیں ملتا ہے ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ وہ سب کی حوصلہ افزائی کرنے والے اور مثالی ہیں۔ ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہ سب سے بہترین ہیں۔

ڈاکٹر ولیم جیکسن (ڈیزرٹ انٹرنیشنل)

ڈیزرٹ انٹرنیشنل کی سترہ 17 سالہ تاریخ میں ہم نے سیکھا ہے کہ کسی بھی کامیاب پروگرام کے لئے پوری دنیا میں اہم ترین عنصر وہ شخص ہوتا ہے جس کے ساتھ آپ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے آپ ایک متحرّک، مضبوط رائے کا حامل، دیانت دار اور قابل بھروسہ ساتھی دیں، اور ہم مل کے آپ کو بہترین نتائج دیں گے۔ صغیر اسلم اس

تمام کسوٹی پہ پورے اترتے ہیں۔

صدیق کنڈان گل (نیو اپوسٹولک چرچ۔ پاکستان)

صغیر اسلم صاحب اور ان کے ادارے نے غریب مردوں، عورتوں، بچّوں، بوڑھوں اور محروم افراد کی زندگی پہ بے حد مثبت اثرات مرتّب کئے ہیں۔ صبا ٹرسٹ نے ہر میدان اور ہر عقیدے کے ضرورت مند لوگوں کے لئے کام کیا ہے۔ غربت زدہ افراد میں تعلیم، کپڑے، کھلونے، دوائیں اور خوراک تقسیم کی۔ صبا ٹرسٹ مذہبی ہم آہنگی کے ضمن میں بہت اعلیٰ کام کر رہا ہے۔ جس کے ذریعے وہ مختلف فرقوں خصوصاً عیسائی جو پاکستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، کے ساتھ امن و آشتی اور ہم آہنگی کے لئے کوششیں کر رہا ہے۔

جارج گڈمین (سپروائزر، براڈوے)

آپ نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ آپ نے اپنی سخت محنت، کام کے ساتھ لگن، اور قابلیت کے بل پہ حاصل کیا ہے اور آپ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کے ہیں جتنا آپ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بات کہنے والا میں فردِ واحد نہیں۔ قدرتی طور پر میں سٹور میں آپ کی کمی محسوس کرتا ہوں نہ صرف سٹور کے معاملات کو چلانے بلکہ آپ کی کمی مجھے انفرادی طور پر بھی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی موجودگی کی بنا پر میں خود کو زیادہ مضبوط خیال کرتا تھا۔ سٹور میں آپ کی موجودگی کا خیال کر کے میں اطمینان محسوس کرتا تھا اور دوسرے معاملات پر توجہ دینے میں آزاد ہو جاتا تھا۔ میں نے ہمیشہ آپ پہ اعتماد کیا اور مجھے یقین ہوتا تھا کہ آپ اپنی قابلیت کا بھرپور استعمال کریں گے۔

آپ کے والدین یقیناً آپ پہ فخر کرتے ہوں گے اور ان کو کرنا بھی چاہیے۔

پہلے نمبر پہ آپ ان کو پیار اور توجہ دیتے ہیں اور آپ کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے کیوں کہ یہ ان کا حق ہے۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے ان تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ دوسرے نمبر پہ ان کو اس لئے آپ پہ فخر کرنا چاہیے کہ آپ نے مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتے ہوئے کامیابی حاصل کی ہے۔ مجھے یقین ہے انھوں نے اس کا تصوّر بھی نہ کیا ہو گا۔ سب سے بڑھ کے آپ کا مضبوط کردار اس بات کی علامت ہے کہ انھوں نے آپ کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے انداز میں کی ہے۔

سسٹر خدیجہ (اللہ پاک کے کرم سے انھوں نے ہمارے گھر میں اسلام قبول کیا)

محض کارڈ آپ کی مہربانی اور گرم جوشی اس کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ میں اپنے تاثّرات بیان کرنے کی ماہر نہیں، لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا قدم آپ کے گھر میں اٹھایا (الحمدللہ) ۔میں ہر وقت آپ اور آپ کے گھر والوں کے لئے دعا کرتی ہوں۔ میں آپ کی احسان مند ہوں۔ اس کا صلہ میں اس انداز میں دے سکتی ہوں کہ میں اسلام کے اوپر پورے طریقے سے عمل کروں۔ میں بہت خوش ہوں کہ میں اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں کہ میں ایسا کر سکوں۔ شاید آپ کو پتہ نہ ہو کہ میں کئی مرتبہ یہ قدم اٹھانے لگی لیکن اپنے اوپر چند پابندیوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ آپ کے گھر کی دہلیز پر میں نے اللہ کی رحمت اور نیکی محسوس کی۔ آپ کے دوستوں کا ساتھ بھی میرے ہمراہ تھا۔ آپ تمام لوگوں کا ساتھ میرے لئے رحمت ثابت ہوا (الحمدللہ) ۔ شاید میرے یہ الفاظ میری خوشی اور احسان کے جذبات کو کسی حد تک بیان کر سکیں۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے قید سے آزاد ہونے میں میری مدد کی اور مجھے آزادی سے کچھ کہنے کی ہمّت دی۔

مجھے لگتا ہے کہ شروع سے ہی میرے اندر اللہ پہ گہرے یقین کا پودا لگا تھا جو

وقت کے ساتھ بڑھتا رہا مگر اس کا پھل میں کبھی نہ حاصل کر پائی۔ ادھر ادھر سے اس پودے کو خوراک اور روشنی کسی حد تک حاصل ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں پہ رحم فرمایا اور آخر کار مجھے سرخرو فرمایا..... مجھے پھر سے رونا آرہا ہے..... اللہ پاک آپ اور آپ کے گھر والوں پہ اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے(آمین) ۔

خالد یحییٰ بلیک ان شپ (پروفیسر لی ہائے ایونیو، فلاڈلفیا)

مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس عالم میں اپنے بھائی نذیر خواجہ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ میں کہیں سے قرض حسنہ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ چند دن بعد مجھے ڈاک کے ذریعے پانچ ہزار ڈالر ($5000) کا چیک ملا۔ جس کے بارے میں مجھے اتنا ہی پتہ چل سکا کہ یہ آپ کی جانب سے تھا۔ میں آپ سے کبھی ملا نہ ہی آپ سے براہ راست اس قرض کے بارے بات کی۔ میں نے اس قرض کو لوٹانے کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود مجھے اس قرض کا بوجھ خود پہ محسوس ہوتا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔

آپ کی خود سے اوپر اٹھ کر دوسروں کی مدد کرنے کی اعلیٰ مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے کونسل آف اسلامک ایجوکیشن میں شبیر منصوری کے ساتھ کام کرنے کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ اس تنظیم کی اعلیٰ کارکردگی کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ مجھے علم ہے کہ آپ کی اس کے منصوبوں میں گہری دلچسپی ہے اس لئے میں ان منصوبوں کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔

نعیم شاہ جونئیر (نیشنل ڈائریکٹر۔ علم فاؤنڈیشن)

علم فاؤنڈیشن کا قیام 1998 میں عمل میں آیا۔ بنیادی طور پر یہ ضرورت مند طبقات کی مدد کے لئے بنائی گئی تاکہ انھیں تعلیم، اصلاحی و تربیتی پروگرام، خوراک اور

بے گھروں کے لئے چھت فراہم کرنے جیسی سہولیات فراہم کی جائیں۔ رمضان میں علم فاؤنڈیشن امریکی مسلمانوں کے تعاون سے سب سے بڑا خیراتی پروگرام منعقد کرتی ہے جسے "فلاحی دن" کا نام دیا گیا ہے۔

صبا ٹرسٹ اور اسلامک ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے اس پروگرام کے لئے ہر سال باقاعدگی سے مدد کی۔ پچھلے نو سال میں پچاس ہزار سے زائد بے گھر افراد کو تازہ گرم کھانا، پانی، صفائی کے لئے ضروری چیزیں، نئے کپڑے، کمبل اور کھلونے مہیا کئے گئے۔ ایفروامریکن (Afro-American) مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہونے کے ناطے ہمارا زیادہ انحصار مخیّر حضرات پہ رہا۔

انھوں نے علم فاؤنڈیشن کو کپڑے اور گھریلو سجاوٹ کا سٹور عطّیہ کیا جس میں نہ صرف عورتوں اور مردوں کے کپڑوں کی مکمل ورائٹی شامل تھی بلکہ گھریلو سجاوٹ کی چیزیں، ایسیسریز، نمونے، نوشنز، ٹرمز اور فکسچرز غرض ایک مکمّل سٹور علم فاؤنڈیشن کے حوالے کیا۔

افضل بٹ (صدر، راولپنڈی، اسلام آباد پریس کلب)

صبا ٹرسٹ اور اس کے چیئرمین صغیر اسلم صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ کسی بھی آفت میں ان کی بھرپور فلاحی خدمات ان کی اچھی شہرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایک صحافی ہونے کی حیثیت سے ہم نے ان کی فلاحی سرگرمیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا جو انھوں نے سونامی (2004)، ایران زلزلہ (2003)، پاکستان میں طوفانی بارشوں سے پیدا ہونے والے سیلاب اور تباہ کن زلزلے (2005) کے دوران سرانجام دیں۔ متاثرین کے ریلیف کیلئے ان کی ذاتی دلچسپی اور خود کو وقف کر دینے کی حد تک مسلسل کام تعجب انگیز تھا۔

اوپر بیان کی گئی خدمات کے علاوہ، وہ تعلیم، صحت کی سہولیات، ووکیشنل ٹریننگ

اور آسان قرضہ جات کی فراہمی جیسے پروگرام ان کا روز مرہ کا کام ہے تاکہ غربت میں پھنسے افراد کی حالت زار میں مثبت تبدیلی لائی جاسکے۔ صبا ٹرسٹ ضرورت مند لوگوں تک، کپڑے، کمبل، لحاف اور جرسیوں وغیرہ کی فراہمی یقینی بنانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کئی سال سے دلہنوں کیلئے سامان اور شادی کی عمر کی بچیوں کی شادی کیلئے بھی امداد مہیا کر رہے ہیں۔ صبا ٹرسٹ مختلف جگہوں پر قومی سطح کے آئی سرجن کی زیر نگرانی فری آئی کیمپ لگانے کا اہتمام بھی کر چکا ہے۔

محمود الحسن صاحب (سابق زونل انچارج ایدھی فاونڈیشن لاہور تا پشاور)

ایدھی صاحب کہا کرتے ہیں کہ حقوق العباد سب سے بڑی عبادت ہے۔ انھوں نے فلاحی کام شروع کرنے کے لئے چندہ لینا شروع کیا۔ صغیر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فلاحی کام اپنے پیسوں سے شروع کیا۔ کمالیہ میں مسجد بنائی، لڑکیوں کے لئے ہائی سکول بنایا۔ جس پہ کروڑوں روپے خرچہ آیا۔ صغیر احمد اسلم صاحب ہمارے ادارے کو بہت عطیات دیتے رہے۔ صغیر احمد اسلم صاحب نے زلزلہ اور سیلاب میں متاثرین کی بہت مدد کی۔ انھیں خوراک، راشن، کمبل، کپڑے اور دیگر سامان بھجوایا۔ فیصل آباد، مانسہرہ اور اسلام آباد میں آئی ہسپتال بنائے۔ یتیم بچیوں کے لئے صبا ہومز بنایا۔ جہاں بچیّوں کو اپنی اولاد کی مانند تعلیم وتربیت دی جارہی ہے۔ ان کے کھانے پینے اور رہائش کا انتہائی عمدہ انتظام کیا گیا ہے۔ اس ادارے کی کوشش ہے کہ ان بچیّوں کو اعلیٰ کردار کا حامل بنایا جائے۔

فرحت الکبریٰ (سابقہ ایڈمنسٹریٹر صبا ہومز)

میرا نام فرحت الکبریٰ ہے، میری تعلیم ڈبل ایم ایس سی (M.Sc) ہے۔ میں نے بہت سی جگہوں پہ نوکری کیلئے درخواست دی، میں نے صبا ٹرسٹ کو اس لئے ترجیح دی

کیوں کہ وہاں عورت کو وہ عزّت دی جاتی ہے جو کہیں اور نہیں دی جاتی۔ میں جب انٹرویو کیلئے گئی تو میں حیران رہ گئی، کیونکہ وہاں میں نے وہ دیکھا جو صرف خواب و خیال میں ہوتا تھا۔ ہمارے چیئرمین صغیر صاحب جنھوں نے مجھے بہت عزت دی۔ میں نے ہمیشہ انھیں باپ کے روپ میں دیکھا۔ خدا نے انھیں بہت سی صفات سے نوازا ہے۔ صغیر صاحب نے مجھے بہت متاثر کیا کہ وہ بہت سادہ، رحم دل اور نیک سیرت انسان ہیں۔

میں جب جاب کیلئے آئی تو بہت بوکھلائی ہوئی تھی کیونکہ میں پہلی بار زندگی میں انٹرویو دینے لگی تھی۔ خیر میں کمرے کے اندر داخل ہوئی تو داخل ہوتے ہی دیکھا کہ دفتر نہایت صاف ستھرا، پر کشش اور روشن تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک بڑی عمر کا ایک آدمی نہایت معمولی، سادہ کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوئی، وہ نہایت عاجزی اور مسکراتے ہوئے چہرے کیساتھ کھڑے ہو گئے اور فوراً کہا السّلام وعلیکم !Welcome۔

ان کے اس انداز سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ یہ عورت کو عزّت دینا جانتے ہیں۔ ان کا نرم لہجہ اور مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی، ان کے چہرے پہ ایک عجیب سی طمانیت تھی حالانکہ لوگ اس عمر میں چڑ چڑے ہو جاتے ہیں۔ بہت غصہ کرنے والے، لڑائی جھگڑا کرنے والے، لیکن ان میں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس عمر میں اپنے آپ کو سنبھال کر (Maintain) رکھنا بہت بڑی بات ہے۔ مجھے ان کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ ویسے بھی کہتے ہیں نا "First Impression is the Last Impression" اور جس انداز میں وہ مجھ عام سی لڑکی کے لئے کھڑے ہوئے تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد میں باہر خوشی خوشی آئی اور اپنے والد صاحب کو کہا کہ مجھے یہ نوکری ملے یا نہ ملے مگر وہ انسان بہت اچھے ہیں۔ باہر بیٹھے آدمی نے بتایا کہ وہ

ہمارے ”چیئرمین“ ہیں۔ میں یہ سن کر حیران رہ گئی اور واپس گھر آنے تک مسلسل خاموش تھی۔ مجھے ایک اور جگہ سے بھی نوکری کی آفر آئی، گھر آ کر میں دونوں نوکریوں کا موازنہ کرتی رہی۔

صبا ٹرسٹ	کالج
تنخواہ 6000 روپے	تنخواہ 15000 روپے
روزانہ آنا جانا پڑے گا	رہائش ملے گی
کھانے کا فی الحال کوئی بندوبست نہیں	کھانا کالج کی طرف سے ملے گا
نوکری مستقل نہیں	نوکری مستقل ہے
سالانہ چھٹیاں نہیں ہیں	دو ماہ کی سالانہ چھٹیاں
چھٹی کرنے پر تنخواہ کٹے گی	ہفتے میں دو چھٹیاں ہیں

اس کے علاوہ بہت سی باتیں تھیں۔ خدا جانتا ہے کہ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ صبا ٹرسٹ میں جاب کروں۔ خیر میں نے صبا ٹرسٹ کا انتخاب کیا۔ جس دن میں انٹرویو کیلئے آئی۔ اس دن سے لے کر آج تک میں نے وہ کچھ سیکھا جو شاید کالج کی نوکری نہیں سکھا سکتی تھی۔ کیونکہ میں جب یہاں آئی تو بالکل کورے کاغذ کی طرح تھی۔ مگر اب میں ایک مکمل فائل (Complete Document) کی طرح ہوں۔ جس میں بہت کچھ محفوظ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میرے لئے ان کی شخصیت کسی تعلیم و تربیت دینے والے ادارے (Institute) سے کم نہیں۔

میں خدا کا ہمیشہ شکر ادا کرتی ہوں کہ زندگی میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، بالکل میری زندگی ہی بدل گئی۔ میری سوچ، میرا انداز زندگی سب کچھ بدل گیا۔ میں بھی عام لڑکیوں کی طرح دوپٹہ کندھوں پہ رکھتی

تھی۔ میں چیئر مین صاحب کی بیٹی عائشہ سے ملی جو امریکہ میں پیدا ہوئی، وہیں بڑی ہوئی اور وہیں رہتی ہے۔ وہ سو فیصد (100%) اسلامی حجاب میں ہوتی تھی۔ اس کے کپڑوں سے ہی اسلامی شخصیت نظر آتی ہے۔ مجھے چیئر مین صاحب نے کبھی نہیں کہا لیکن میں اب فخریہ طور پہ کہتی ہوں کہ میں حجاب پہنتی ہوں۔ "مسٹر عائشہ اور سر کا شکریہ۔"

صغیر اسلم صاحب نے اپنی ساری زندگی کو انسانیت کیلئے وقف کر دیا، انھوں نے ہمیشہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ سر! آپ نے مجھے نوکری کیوں دی، حالانکہ میرے پاس نوکری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر تجربہ نہیں ہے تو ہو جائے گا۔ تمھارے پاس تعلیم ہے اور جذبہ ہے۔ سیکھنے کیلئے ان دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

انھوں نے ہمیشہ عورت کو وہ مقام دینے کی کوشش کی جو اسلام نے دیا ہے۔ ان کے قریب مختلف مذاہب، فرقے اور نسل کی تمیز بے معنی ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ یہ کہتے ہوئے سنا کہ انسان کا عمل اور اس کی نیت زیادہ اہم ہے بانسبت اس کے کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے ہی فرشتہ سیرت انسان دنیا کیلئے نصیحت ہوتے ہیں، جن کی تخلیق با مقصد ہوتی ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ جو کچھ میں نے صغیر صاحب میں دیکھا ہے، وہ ولی اللہ سے کچھ کم نہیں بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ جن کی زندگی کا مقصد بہت خاص ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا نے انھیں خاص خصوصیات سے نوازا ہے۔ ایسا انسان جو اپنے بچوں کیلئے بلکہ پوری انسانیت کیلئے روتا ہے وہ عام نہیں ہو سکتا۔ اس نفس پرستی کے دور میں ایک ایسا انسان جو دوسروں کیلئے سوچتا ہے، دکھی ہوتا ہے وہ اللہ کا خاص اور پیارا انسان ہی ہو سکتا ہے۔

میں خدا کا ہمیشہ شکر ادا کرتی ہوں کہ زندگی میں مجھے صغیر احمد صاحب کیساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ خدا ایسے انسان بہت کم بناتا ہے جو

دوسروں کے لئے اپنی زندگی گزارتے ہیں، جو خدا اور اس کے بندوں سے پیار کرنا جانتے ہیں۔ جو ذات پات، اونچ نیچ کا خیال نہیں کرتے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایسا انسان دیکھا ہے جو اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے اور اپنے نوکروں کو بھی آپ کہہ کر پکارتا ہے۔

وہ بچوں کے ساتھ نرمی، پیار اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ کبھی کسی کو تم کہہ کر نہیں پکارا، کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی' ان کی آواز اور لہجہ ہمیشہ آہستہ اور دھیما ہوتا ہے۔ صبر اور برداشت ان کی شخصیت کی نمایاں صفات ہیں، چاہے کیسی بھی مشکلات ہوں' چاہے جتنے بھی مشکل حالات ہوں وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کیونکہ بقول ان کے تنقید اور طنز آپ کے استاد ہیں آپ ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ان ہی سے آپ کی اچھائیاں اور برائیاں واضح ہو جاتی ہیں۔

مستقل مزاجی کا یہ حال ہے کہ امریکہ کے کلچر کا رنگ ان کے مزاج پہ نہ چڑھ سکا۔ امریکہ جیسے ملک میں 55 سال سے زیادہ کا عرصہ گزارنے کے باوجود تمام زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گزار رہے ہیں اور ان ہی اصولوں کی وجہ سے باوقار اور باعزت مقام حاصل کیا۔ انسانوں کی مدد کرنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا ان کا نصب العین ہے۔

ایک ایسا انسان جس کو اس فانی دنیا میں ہر آسائش ہر آرام خدا نے دیا۔ اس کو کیونکر ایسے انسان کی فکر ہو گی جو کسی مشکل میں ہے، جس کے پاس دوائی خریدنے کیلئے بھی پیسے نہیں۔ منرل واٹر پینے والا انسان کیونکر ایسے لوگوں کی تکلیف کے بارے میں سوچے گا اور وہ یہاں کی بچیوں کے بارے میں کیوں سوچے گا۔ اس کے پیچھے صرف خدا کی رضا اور خوشنودی شامل ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی کو انسانیت کے لئے وقف کر دیا بلکہ ایک ایسا پلیٹ فارم

بھی مہیا کیا جو آنے والی نسل کیلئے مشعل راہ ہے۔ یہاں جاب کرتے ہوئے مجھے عورت ہونے پر فخر ہے کیونکہ آج تک میرے لئے دروازہ کسی نے نہیں کھولا تھا چاہے وہ سگا بھائی ہو یا باپ ہو کیونکہ میں لڑکی ہوں۔ ہمیں اسلام نے عورت کی عزت کا حکم دیا ہے۔ مگر Sir جو اس بات کو جانتے ہیں، انھوں نے نہ صرف میرے لئے بلکہ سب عورتوں کے لئے ہمیشہ دروازہ کھولا۔ اس لئے نہیں کہ وہ محض عورتیں ہیں بلکہ اسلام میں عورتوں کو عزّت و مقام دیا گیا ہے۔ صغیر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کیلئے یہ کہاوت ہے کہ ''پھل دار درخت ہمیشہ نیچے کی طرف جھکتا ہے۔'' حضرت علامہ اقبال نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

چیئرمین صاحب نے ہمارے معاشرے میں موجود برائیوں کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ ان کو ختم کرنے کے لئے بھی مفید اقدامات کئے۔ میں نے ایسا انسان دیکھا ہے جن کی زندگی کا مقصد اللہ کے بندوں سے پیار کرنا اور ان کی مدد کرنا ہے۔ اس انسان نے نہ صرف اپنی زندگی انسانیت کیلئے وقف کر دی بلکہ زندگی کو باقی لوگوں کے لئے رول ماڈل بنا دیا۔ میری یہ دعا ہے کہ خدا انھیں کامیاب کرے۔ خدا کرے کہ ہم اسی اسلامی ماحول کو پورے ملک میں نافذ کر سکیں جو صبا ٹرسٹ میں نافذ کیا ہوا ہے۔

میری خدا سے دعا ہے کہ خدا انھیں لمبی زندگی دے اور ان کی تمام مصیبتیں، مشکلات اور پریشانیاں ختم کرے۔ (آمین)

احمد المطوع (دلداد صغیر احمد اسلم)

میں ایسے شخص کے بارے میں لکھنے لگا ہوں جس نے اپنی پوری زندگی ایک طرح سے تاریخ رقم کرتے گزاری۔ ان کی زندگی ایک عام شخص کی زندگی سے مختلف

ہے۔ ان کے بارے میں لکھنے کی کوشش کرنا، اگرچہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، مگر میں ان کے بارے میں اس لئے لکھنا چاہتا ہوں تاکہ میری آئندہ نسل ان پہ فخر کر سکے کہ وہ ایک ایسی شخصیت سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے دنیا کو رہنے کے لئے ایک اچھی جگہ بنانے کی کوشش کی۔

صغیر اسلم اپنی بظاہر دبلی پتلی شخصیت کے برعکس اندر سے بہت بڑے ہیں۔ عربی کی ایک کہاوت ہے (ترجمہ) ''جو محض اپنے لئے زندگی گزارتا ہے وہ گمنام رہتا اور گمنام موت مرتا ہے اور جو انسانیت کی خدمت میں اپنی زندگی گزارتا ہے وہ اپنی موت کے بعد عظیم انسان کے طور پہ جانا جاتا ہے اور اپنے ورثے میں عظمت چھوڑ جاتا ہے۔''

صغیر صاحب منصوبہ بندی کرنے، اور منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی تجاویز کے مطابق عمل کرے تو وہ کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ میں ایسا کوئی کام کرتے ہوئے ان کے الفاظ دہراتا رہتا ہوں کہ ''کام کے پیچھے لگے رہو آپ دیکھو گے کہ آپ ضرور کامیابی تک پہنچو گے۔ جدوجہد ترک نہ کرو۔''

صغیر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر جسم صحت مند ہو گا تو دماغ بھی صحت مند ہو گا۔ اگر ان کی سخت محنت کے بارے میں بات نہ کی جائے تو یہ انصاف نہ ہو گا۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کی طرح جو کہ ایک مالدار تاجر تھے اور جن کو اس امّت کا بہترین شخص ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق ایک ذاتی چیز ہے۔ جو اللہ کے اور ان کے درمیان ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے کہتے ہیں کہ اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو خدا کا قرب تلاش کریں۔ میں اس کا گواہ ہوں کہ وہ رات کے دو بجے اٹھ کر اللہ کی عبادت کر رہے ہوتے ہیں اور تقریباً روز ہی ایسا کرتے ہیں۔

آخری بات جو ان کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ ایسی شخصیت ہیں جن کو دیکھ کے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اچھائی ابھی تک اپنا وجود رکھتی ہے۔ وہ اپنی ضرورت پہ دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایسے شخص ہیں جو پیسے اس لئے بچاتے ہیں تاکہ انھیں غریب اور ضرورت مند لوگوں پہ خرچ کیا جا سکے۔ امت مسلمہ کی حالت یاد کر کے اکثر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ صغیر صاحب اس وجہ سے فلسطین، کشمیر وغیرہ کا ذکر نہیں کرتے کہ ان کو یاد کر کے انھیں خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔

صغیر صاحب ایک عظیم انسان ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ صغیر صاحب پر، ان کے خاندان پر اور ان کے کام میں برکت ڈالے (آمین)۔

عائشہ اسلم (دختر صغیر احمد اسلم)

آپ نے وہ مشہور چینی کہاوت تو سنی ہو گی "اگر آپ کسی کو مچھلی دیں تو آپ اسے ایک دن کے لئے خوراک دیں گے مگر آپ نے کسی کو مچھلی پکڑنے کا طریقہ سکھایا تو آپ نے پوری زندگی کے لئے اس کی خوراک کا انتظام کر دیا۔" (میرے پاپا نے اسی طریقے کے تحت ہزاروں لوگوں کی امداد کی) اس لئے اس کہاوت کو سنتے ہی مجھے اپنے والد کا خیال آتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے اور میری بہن کو سکھایا کہ ہم ہر کام اپنے لئے خود ہی کریں اور مقصد حاصل کرنا سیکھیں۔ وہ ہمیں زگ زیگلر (Zig Zeigler)، ٹونی رابنس (Tony Robins)، ویڈ کک (Wade Cook) اور دوسرے سیمینارز میں لے کے جاتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ویڈ کک (Wade Cook) کے ایک سیمینار کے دوران میں نے سٹاک ٹریڈ کے ذریعے بارہ ہزار چھ سو اسّی ڈالر ($12,680) کا منافع حاصل کیا جب کہ دوسرے طالب علم پیپر ٹریڈنگ میں پیسے لگا رہے تھے۔

میرے پاپا ایک حیرت انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ میرے ''ہیرو'' ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کاش میں ان جیسا کچھ کر سکوں چاہے اس سے آدھا ہی کروں جتنا انھوں نے اپنی پوری زندگی میں کیا۔ جب میں ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے سامنے ایک منظم، بے لوث، فیّاض اور ہمیشہ خیال رکھنے والی شخصیت آجاتی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دوسروں کی مدد کی، چاہے وہ ان کے خاندان کا کوئی فرد ہو، کوئی دوست ہو جسے مشورے کی ضرورت ہو یا کوئی اجنبی جس نے ان سے مدد مانگی ہو۔ ان کی یہ عادت مجھے بہت پسند ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے ستائش یا صلے کی تمنا نہیں کی۔ بعض اوقات مجھے اس بات پہ سخت غصہ آتا ہے کہ لوگ ان کے کئے گئے کاموں کا بھرپور انداز میں اعتراف نہیں کرتے لیکن میرے پاپا ہمیشہ مجھے بتاتے ہیں کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا چاہیے۔

وہ مجھے سو ڈالر ($100) کے جوتے تو فوراً لے دیتے ہیں مگر اپنے اوپر کچھ خرچ نہیں کرتے۔ وہ اپنے پرانے ٹینس کے جوتے ہی سالوں تک استعمال کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کی منت سماجت کی کہ اب وہ اپنے جوتے تبدیل کر لیں تب انھوں نے حامی بھری مگر اس کے لئے بھی انھوں نے سیل لگنے کا انتظار کیا۔

میرے والد صاحب کی ایک اور خصوصیت ان کی حسّاس طبیعت اور اپنے جذبات کے اظہار کا طریقہ ہے۔ انھوں نے کھلے عام کسی کو گلے لگانے یا جذباتی مواقع پر رونے سے گریز نہیں کیا۔ میں بچپن سے ہی ان سے ہر بات کہہ سکتی ہوں اور ابھی تک ایسا ہے۔ یہ ان کی ایک اور بڑی خوبی ہے۔ وہ بات کو بڑے غور سے سنتے ہیں۔ تبصروں کو اہمیت دیتے ہیں اور لوگوں کی رائے کے مطابق اپنے کام کرنے کے طریقے کو تبدیل بھی کر دیتے ہیں۔

ان کے بارے میں آخری بات بہت متاثر کن ہے۔ میں آج تک ان جیسے منظم شخص سے نہیں ملی۔ اگر آپ ان کے دفتر یا کمرے میں جائیں تو آپ کو میری بات صحیح طریقے سے سمجھ آئے گی۔ وہ کسی دوسرے ملک سے مجھے فون کرتے اور کہتے "میرے کمرے سے فلاں چیز لے آؤ۔ اس کے لئے وہ مجھے بالکل درست ہدایات دیتے جیسا کہ "میرے کمرے میں جاؤ اور داہنی طرف جو الماری رکھی ہے اس کی تیسری دراز کھولو اس میں موجود ایک فائل جس پہ "ٹریول" لکھا ہے، وہ نکالو۔ فائل میں چھٹے نمبر پہ موجود کاغذ نکالو، جو میرے ٹکٹ کی ایک نقل ہو گی۔"

کیا یہ زبردست بات نہیں؟ وہ ایک چھوٹے پیپر کلپ سے لے کر ربڑ بینڈ تک کے بارے میں انتہائی درست جگہ کی نشان دہی کریں گے۔ یہ میرے دوست، میرے ہیرو اور میرے پاپا کے بارے میں محض چند الفاظ ہیں۔

"زندگی جئیں تو ایسی"

جمیل بھٹی (صحافی۔ کالم نگار اسلام آباد) (ان کا کالم جو جولائی 2010 کو روزنامہ جناح میں شائع ہوا)

زندگی کیسے گزاری جائے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتا کون ہے۔ زندگی تو وہ گذرتا ہوا وقت ہے جو ہم سے بن پوچھے گذر جاتا ہے۔ زندگی کی افراتفری میں سوچتا کون ہے۔ کون منصوبہ بندی کرتا ہے کہ میں زندگی ایسے نہیں تو ویسے گزاروں گا۔ ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہماری لاکھ منصوبہ بندی کے باوجود ہو گا تو وہی جو نصیب میں لکھا جاتا ہے۔ ہاں ایک چیز ہمارے اختیار میں ہے اور وہ ہے خواہش۔ ہم سوچ سکتے ہیں، سوتے جاگتے خیالات کی دنیا میں ایک آئیڈیل کو خواہشات کا پیرہن پہنا کر اس کے پیچھے بھاگ سکتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھ لگتا ہے یا نہیں یہ معاملہ بعد کا ہے۔ کوئی عمران خان سے متاثر ہے تو کوئی سلمان خان جیسی شہرت چاہتا ہے، کوئی قائداعظم کی لیڈرانہ اور ایماندارانہ

صلاحیتوں کی محبت میں مقیّد ہے تو کوئی علامہ اقبال کی پیروی کرتے بکھرتی قوم کو ایک نئی منزل دینا چاہتا ہے، کچھ لوگ نواز شریف اور آصف زرداری کی طرح بے پناہ دولت اور طاقت کے نشے سے اٹکھیلیاں کرنے کی آرزو دل میں دبائے بیٹھیں ہیں تو کوئی اپنا سارا مال و دولت اور آسائشات چھوڑ کر عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی جیسا ایک لمحہ گزارنے کو ترستا پھرتا ہے۔

آج سے چند ماہ پہلے تک (مذہب سے ہٹ کر) میرے ذہن میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں آیا، کبھی دل میں کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ میں جس کی نقل کرنے یا اس کی پیروی کرنے کی خواہش کرتا۔ طبیعت نے کبھی کسی کو مکمل شخصیت مانا ہی نہیں کہ اس کی پیروی کرتا۔ پھر اچانک ایک دن ایک ایسی ہستی سے ملاقات ہو گئی کہ میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ ان سے بات چیت کرنے، ان کے زندگی بھر میں کئے جانے والے کاموں کو جان کر اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو دیکھنے کے بعد میرے دل میں ایک آرزو نے جنم لیا کہ کاش میں ان جیسا بن جاؤں، دل بار بار خواب دیکھتا ہے کہ کاش میں کبھی ان جیسا کچھ کر سکوں۔ ان کو شاید پاکستان میں چند ایک لوگ جانتے ہوں گے اور جو جانتے ہوں گے انھیں حقیقت میں یہ بھی معلوم نہیں ہو گا کہ یہ کلین شیو سادہ سا آدمی حقیقت میں کیا ہے اور کس مرتبے پر فائز ہے۔ یہ میرے بزرگ دوست صغیر اسلم صاحب ہیں۔ طبیعت اتنی نرم اور سادہ کہ یقین کرنا مشکل اور کام اتنا بڑا کر رہے ہیں کہ دنیا میں بہت کم لوگوں کو خدا کی طرف سے اس ڈیوٹی اور ذمّہ داری کا شرف بخشا جاتا ہے۔ ان کی زندگی دکھوں، امتحانوں، خوشیوں اور قربانیوں کی ان گنت کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔

وہ پاکستان بننے سے پہلے انڈیا میں پیدا ہوئے اور جب پاکستان بنا تو وہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خون کی ندیاں پھلانگتے، بھوک اور بیماریوں سے لڑتے لڑتے پاکستان

پہنچ گئے۔ اپنی داستان سناتے سناتے اور خدا کی نعمتوں کو یاد کرتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ان کے دکھ سے زیادہ خوشی کے آنسو تھے کہ آخر گھر تو اپنا ہے نا، دیس تو اپنا ہے۔ پاکستان پہنچنے کے لئے جہاں جانوں کی قربانی دی وہیں بھوک اور پیاس سے کٹنے والے دن بھی بڑے دلخراش تھے۔ پاکستان پہنچے تو ہاتھ خالی تھے۔ ماں کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تعلیم حاصل کر کے افسر لگ جائے۔ خدا نے ماں کے دل کی دعا سنی اور صغیر صاحب دن رات کی محنت کے بعد گریجوایشن کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دل میں ایسے ہی خیال آیا کہ کیوں نہ امریکہ یا ولائت میں پڑھا جائے۔ مختلف تعلیمی اداروں میں درخواست دی تو اعلیٰ نمبروں کی بدولت کئی یونیورسٹیز نے داخلہ دے دیا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو پاس کچھ نہ تھا۔ بحری جہاز سے برطانیہ پہنچے، وہاں ایک سال تک محنت مزدوری کر کے امریکہ جانے کیلئے کرایہ اکٹھا کیا۔ امریکہ پہنچے تو پہلے ہی دن مزدوری شروع کر دی تاکہ یونیورسٹی کی فیس آسانی سے ادا ہو سکے۔ دل جما کر پڑھائی اور محنت مزدوری کرنے کی روٹین نے ان کی زندگی کو ایک نیا رستہ دے دیا۔ پیسے کی ریل پیل ہو گئی اور تعلیم بھی مکمل ہو گئی۔ 1965 میں حج کرنے گئے تو بیمار ہو گئے۔ بیماری کی حالت میں ہی پاکستان واپس آ گئے۔ صغیر صاحب کو ایک ہسپتال لے جایا گیا۔ امریکہ سے آنے کی وجہ سے خوب آؤ بھگت ہوئی، ڈاکٹر آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اسی دوران انھوں نے دیکھا کہ ہسپتال میں کئی غریب بیمار لوگ ایسے تھے جن کو کوئی پوچھ ہی نہیں رہا تھا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جس نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجھ سے جہاں تک ہو سکا غریبوں کی فلاح کروں گا۔ وہ دن اور آج کا دن 45 برس ہونے کو آئے ہیں ان کے مشن میں کمی آئی اور نہ پیسے کی بچت کے لالچ نے نیّت خراب کی۔ ان کی زندگی کا ہر سویرا ایک نئی زندگی ہے، ہر شام کامیابیوں کی مہمان ہے۔ تمام عمر امریکہ میں گزارنے والا صغیر اسلم اب ایک بالکل نئی اور مختلف زندگی گزار رہا ہے۔ ہم تو وہ بدقسمت لوگ ہیں جو ایک

ایک سکہ بچاتے، جوڑتے، ہزار سے لاکھ اور لاکھ سے کروڑ بنانے کے چکر میں زندگی ختم کر بیٹھتے ہیں مگر صغیر صاحب اس بات سے بے نیاز ہیں۔ ان کے تو مقاصد ہی کچھ اور ہیں۔ کئی سو بچّیوں کی شادی کے اخراجات ہوں یا پھر ملک کے مختلف اداروں کو ایمبولینسز دینے کا وقت آئے یا پھر کسی بھی مجبور یا ضرورت مند کا ہاتھ پھیلتا نظر آئے تو وہ خود کو اس کی طرف جھکا دیتے ہیں۔ ملک میں 2005 کا قیامت خیز زلزلہ ہو یا پھر کوئی اور آفت کسی بھی موقع پر وہ اپنے فلاحی ادارے ''صبا ویلفئیر ٹرسٹ'' کے ذریعے اپنا ایک بڑا حصہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔

میں ان کاموں کو کوئی بڑا کام نہیں سمجھتا۔ مجھے ان کے جس کام نے متاثر کیا وہ اور ہے۔ انھوں نے راولپنڈی میں اپنا ایک پانچ منزلہ شاندار اور بڑا گھر تعمیر کیا۔ پھر ملک کے کونے کونے سے یتیم بچّیاں ڈھونڈیں اور انھیں اپنی بیٹیاں بنا کر اپنے گھر میں پالنا شروع کر دیا۔ اس وقت بھی 26 بچیاں (2017 میں 31) ان کے گھر میں انھیں اور ان کی بھلی بیوی کو پاپا اور مما کہتی نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی ان کے گھر کو یتیم خانہ کہنے کی کوشش کرے تو وہ اسے فوراً ٹوک دیتے ہیں کہ وہ اسے گھر کہتے ہیں یتیم خانہ نہیں۔ چھبیس (26) بچیوں کو ایسی ایسی سہولیات میسر ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ وہ کسی امیر زادی کو بھی نصیب نہ ہوں گی۔ چھبیس (26) بچیوں کی دیکھ بھال کیلئے کم از کم بارہ (12) مرد و خواتین موجود ہیں۔ وہ اپنے گھر کی ایک بڑی گاڑی میں شہر کے بہترین سکول میں پڑھنے جاتی ہیں۔ گھر کے ساتھ ایک خوبصورت باغیچہ ان کے کھیلنے کی جگہ ہے۔ عالی شان کھانے کا انتظام، ٹی وی لاؤنج، عبادت کا ہال، کھیلنے کا کمرہ، کمپیوٹر لیب، سٹڈی رومز، سیکورٹی کا جدید نظام اور بک لائبریری، وہ کونسی سہولت ہے جو ان کو مہیا نہیں۔ دو ایسی منفرد سہولتیں میں نے وہاں دیکھی ہیں جو مجھے حیران کر گئیں۔ پہلی وہاں کتب لائبریری کے ساتھ ساتھ ایک آڈیو لائبریری موجود ہے جو بچی مطلوبہ کتاب کو پڑھنا نہیں چاہتی وہ سن سکتی ہے اور دوسرا ہے

ٹیلر روم (درزی کا کمرہ) ۔ گھر میں ایک درزی مستقل ملازم ہے جو بچّیوں کیلئے بہترین کپڑے سیتا ہے۔ میرے خیال سے شاید کوئی اپنی اولاد کو بھی اتنی شفقت سے نہ پال سکے۔ میں نے پوچھا آپ اتنی رقم خرچ کر رہے ہیں اپنی اولاد کیلئے کیا چھوڑیں گے ؟ بولے یہ بھی تو میری اولاد ہے ان کو پال رہا ہوں، اعلیٰ تربیت دے رہا ہوں تا کہ کل کو یہ ایک عظیم نسل کی بنیاد رکھ سکیں اور دوسرا خدا کا شکر ہے میری پہلی دو بیٹیاں بھی میرے جیسی ہی ہیں، ایک روپے کا بھی لالچ نہیں۔ میں نے جب کبھی خدا کی راہ میں ایک لاکھ خرچ کیا تو اس نے کاروبار میں پانچ لاکھ کا غیر متوقع منافع دے دیا۔ میں نے پوچھا کیا کبھی دل اکتا نہیں جاتا۔

"بھٹی صاحب یہ خدائی کام ہے، نیکی ہے اور نیکی تو ایک نشے کی طرح ہوتی ہے جس کے دل کو خدا لگا دے وہ تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا چاہے سب کچھ لٹانا کیوں نہ پڑ جائے" انھوں نے کہا۔ مجھے یقین ہے اگر انھیں بیوی کی صورت میں ایک نیک اور مددگار ساتھی نہ ملا ہوتا تو وہ کچھ بھی نہ کر پاتے۔

میں کالم لکھنے سے پہلے سوچ رہا تھا کہ اگر کسی نے زندہ جنتی دیکھنا ہے تو وہ صغیر اسلم کو دیکھ لے۔ کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے تو دو بیٹیاں پالنے والے کو جنتی کہا ہے اور وہ تو کئی درجن پال رہے ہیں اور ان کو دلہن بنا کر اپنے گھر سے رخصت کر رہے ہیں۔ کیا ہم ایسی زندگی گزار سکتے ہیں، یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنے والی اور یا پھر دولت جوڑ جوڑ کر جیسے سے اگلے جہاں سدھار جائیں گے حساب کتاب دینے۔

سید ظفر عباس (صحافی، کالم نگار، کیلی فورنیا۔ امریکہ)

صغیر اسلم کی منفرد شخصیت اور ہمارے معاشرے میں ان کی قیمتی شمولیت کا احاطہ میں چند الفاظ میں ادا کر کے انصاف نہیں کر سکتا، میں عرصہ دراز سے صغیر اسلم صاحب کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک پوشیدہ شخصیت کے مالک ہیں، انھوں نے اپنی

شخصیت کو لوگوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔

میں نے کئی مرتبہ مختلف مواقع پر صغیر اسلم صاحب کا انٹرویو لینے کی کوشش کی تاکہ میں ان کی عظیم شخصیت کے متعلق کچھ لکھ سکوں۔ ہر مرتبہ انھوں نے معقول بہانہ بنا کر معذرت کی۔ یہ معاملہ کئی سالوں سے چل رہا تھا لیکن ہر مرتبہ انھوں نے مجھے بہت ہی عقلمندی اور حکمت سے ٹال دیا۔ اب ان کی بیٹی کی شادی ہے، اس موقع پر مجھے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں، اس سنہری موقع سے میں فائدہ اٹھا رہا ہوں۔

کیلی فورنیا کی ممتاز و معروف شخصیت اور کئی فلاحی اداروں کے سرپرست جناب صغیر اسلم کی لاڈلی بیٹی عائشہ اسلم کی شادی خانہ آبادی مسٹر احمد مطوّع سے گذشتہ ہفتے میریٹ ہوٹل، اروائن میں انتہائی تزک واحتشام اور دھوم دھام سے قرار پائی۔ میریٹ ہوٹل کے گرینڈ ہال روم میں موجود کم و بیش سات سو مہمانوں میں قونصل جنرل سید ابن عباس، ڈاکٹر مزمّل صدیقی، ڈاکٹر احمد مقّر، شیخ سعد اللہ، صفی قریشی، حامد ملک، احمد علی، باب دین اور دیگر بہت سی ممتاز شخصیات شامل تھیں۔ مہمانوں میں مورمن و کرسچن چرچ کے رفقاء اور انوسٹمنٹ کمیونٹی کے چیدہ اکابرین بھی شامل تھے۔ دلہن عائشہ اسلم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی باصلاحیت خاتون ہیں۔ وہ اسلامک ریلیف، کئیر اور کئی دوسرے اداروں کی سرگرم ممبر ہیں۔ چنانچہ شادی کی تقریب میں کیلی فورنیا سٹیٹ یونیورسٹیوں کے مختلف کیمپوں سے لاتعداد طلباء کی شرکت نے دعوت کو رنگارنگ اور پررونق بنائے رکھا۔ دولہا احمد مطوع کا تعلق کویت سے ہے۔

ایک عرصے سے میری خواہش تھی کہ لاس اینجلس کی بے مثل شخصیت جناب صغیر اسلم کی خاموش سماجی اور فلاحی خدمات کے بارے میں کچھ لکھوں تاکہ ہمارے نوجوان اور نووارد پاکستانی صغیر صاحب کی تاریخی خدمات سے مطلع ہو سکیں۔ صغیر صاحب کو میں 1974ء سے جانتا ہوں جب میں تازہ تازہ لاس اینجلس میں وارد ہوا تھا۔ میں

نے صغیر صاحب کو ایک غیر معمولی شخصیت کا حامل پایا۔ وہ انتہائی پختہ عقیدے کے مالک، ایک خدا ترس، انسان دوست، اعلیٰ ظرف اور روشن خیال انسان ہیں جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خاموش خدمت کے لئے شب و روز مصروف کار رہتے ہیں۔ انھیں نہ تو ستائش کی تمنا ہے اور نہ ہی صلے کی پرواہ۔ یہ سادہ طبیعت بے لوث انسان نمود و نمائش سے دور، چپ چاپ انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے اپنے حصّے کی شمعیں جلانے میں مگن رہتا ہے۔ پیدائش 1936 میں شہر جالندھر میں ہوئی۔ 1947 میں ہجرت کر کے فیصل آباد (پاکستان) میں آن بسے۔ 1954 میں گریجوایشن کے بعد ایک مشہور اخبار ''تاجر'' کا اجراء کیا جو عام ڈگر سے ہٹ کے اپنی نوعیت کا پہلا علمی اور معلوماتی اخبار تھا۔ 1957 میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ آ گئے۔ برکلے یونیورسٹی اور کیلی فورنیا سٹیٹ یونیورسٹی سیکرامنٹو سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجوایشن کی۔ 1963 میں اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کی بنیاد ڈالنے والے چند افراد میں ان کا نام سر فہرست ہے۔ یہ ادارہ اس وقت امریکہ کے سب سے بڑے اسلامی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ صغیر اسلم صاحب نے اس ادارے کے انتظام و انصرام، پر شکوہ مسجد کی تعمیر اور دیگر اہم منصوبوں کی تکمیل کے لئے دو ملین ڈالرز سے زائد چندہ اکٹھا کیا۔ صغیر صاحب کو اپنے وطن کی مٹی سے والہانہ پیار ہے اور وہ اپنے وطن کے غریب اور پسماندہ علاقوں میں رہنے والے غریب اور مفلوک الحال افراد کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی زیر نگرانی ''صبا اسلم ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ'' کا فلاحی ادارہ برسہا برس سے غریب اور دکھی انسانوں کی خدمت پر مامور ہے۔ صبا ٹرسٹ کا پہلا میڈیکل کلینک 1965 میں تعمیر ہوا۔ 1969 میں صغیر صاحب کی دانشمندانہ اور دور اندیش حکمت عملی کا ثمر غرباء کے لئے ''مائیکرو کریڈٹ پروگرام'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وطن عزیز کے لوگ مائیکرو کریڈٹ تو کیا، کریڈٹ کی تعریف سے بھی نا آشنا تھے۔

صغیر اسلم صاحب کی شبانہ روز مخلص کوششوں سے صبا ٹرسٹ کے زیر انتظام بیروزگار اور نادار افراد کے لئے چھوٹے گھروں کی تعمیر، ان کی نقل و حرکت کے لئے مفت سائیکلوں کی تقسیم، دودھ کے لئے مفت بکریاں، غریب لیکن باصلاحیت خواتین کے لئے کشیدہ کاری اور حرف کے ٹریننگ کورس اور مراکز بیماروں کے لئے ادویات، کپڑے، بچوں کے لئے کھلونوں کی ترسیل، بیواؤں کی امداد کے لئے خصوصی پروگرام اور دور افتادہ علاقوں میں پانی کی دستیابی کے لئے اعلیٰ کوالٹی کے واٹر پمپ، آنکھوں کے علاج کے لئے فری آئی کلینک، مذہبی روشن خیالی اور رواداری کیلئے انٹر فیتھ سیمیناروں کا انعقاد۔ غرضیکہ صغیر اسلم صاحب نے کم و بیش گذشتہ بیالیس 42 سال سے اپنی عمر عزیز کو خدمت انسانیت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ”خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را۔ “صغیر اسلم صاحب ہماری کمیونٹی کے لئے ایک مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی روشنی بلا تفریق رنگ و نسل یا مذہب و ملت ہر ایک کو سچائی اور بھلائی کا راستہ دکھاتی ہے۔ میری دعا ہے کہ خداوند عزوجل ان کی توفیقات عالیہ کو مزید برکت و ثروت سے نوازے۔ آمین۔“

(خصوصی رپورٹ: سید ظفر عباس)

ٹاڈ شیہ (امریکی سنگر۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ سی۔ ڈی۔ آر۔ ایس)

انٹرنیشنل ایجوکیشن اور ویلفئیر سوسائٹی نیز صبا ہومز کے چیئرمین صغیر احمد اسلم میرے انتہائی قریبی دوست اور میرے ذاتی ہیرو ہیں۔ صغیر صاحب میرے ادارے کی پچھلے تین سال سے مدد کر رہے ہیں۔ یہ وہی وقت ہے جب میں ان سے پہلی مرتبہ ملا۔ انھوں نے ہمیشہ میری بہت عزّت کی۔ اگرچہ جو کچھ انھوں نے کیا میں اس کا ایک فیصد بھی ابھی تک نہ کر پایا مگر وہ ایسے ہی ہیں۔ وہ انسانیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی بھی سب سے پہلے انسان ہے اس کا عقیدہ، مذہب بعد میں آتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر

کسی کو محبت اور عزت دیتے ہیں چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ صغیر صاحب ایسے شخص کی عمدہ مثال ہیں جو اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی وسائل، وقت اور پیسے فلاحی منصوبوں میں لگاتے ہیں اور اپنی باقی زندگی 40 یتیم بچیوں کے نام کر چکے ہیں۔ جنھیں صغیر اسلم صاحب اور ان کی شریک حیات مسز بشریٰ اسلم نے 2005 کے زلزلے کے بعد گود لیا۔

صغیر صاحب کے ہاں غریب اور ضرورت مند لوگوں کو روز کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ انھوں نے پوری زندگی جتنے لوگوں کی مدد کی اور عطیّات غریبوں کی نذر کیے، ان کا شمار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود میں نے انھیں سفر کے دوران دیکھا ہے کہ وہ اپنے بیگ سے خشک میوہ جات، جیسے کہ بادام اور پستہ نکال کے کھاتے ہیں تاکہ ریسٹورنٹ کا مہنگا کھانا نہ خریدنا پڑے۔ وہ سادگی سے رہتے ہیں اور فیاّضی سے دیتے ہیں۔ یہ غیر معمولی بات ہے۔ ایک آدمی سخت محنت سے دولت بناتا ہے جس سے وہ پوری دنیا کی سیر کر سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے باقی دن دنیا کے بہترین مقامات پر فائیو سٹار ہوٹلوں میں ہر ہفتے قیام کر سکتا ہے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یتیموں اور غریبوں کی دیکھ بھال کی ذمّہ داری اٹھائی جو کسی سانحے یا آفت کے نتیجے میں مصیبت میں ہیں۔

وہ قریباً ساٹھ سال قبل امریکہ آئے۔ اس وقت ان کی جیب میں چند ڈالر تھے اور بالآخر انھوں نے اپنی محنت سے بزنس ایمپائر (کاروباری سلطنت) کھڑی کی اور اپنے خاندان کے خوابوں کی تکمیل کی۔ ایسا بہت سی عظیم شخصیات نے کیا ہے کہ انھوں نے اپنی بزنس ایمپائر کھڑی کی ہے۔ مگر ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے صغیر اسلم صاحب کی طرح تقریباً تمام دولت بے حد غریب اور ضرورت مند لوگوں پہ خرچ کی تاکہ وہ صحت اور تعلیم کی نعمت سے مستفید ہو سکیں اور تاکہ انھیں ایک نئی زندگی کی امید مل سکے۔

میں کئی مرتبہ صباہومز جا چکا ہوں اور دیکھ چکا ہوں کہ صغیر اسلم صاحب اور

ان کی نیک شریک حیات کی گود لی گئی بچیوں کا خیال کتنے اچھے طریق سے رکھا جارہا ہے۔ بچیّاں وہاں بے حد خوش ہیں۔ میں نے اپنے بہت سے احباب اور رضاکار صباہومز بھیجے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرسکیں کہ صغیر صاحب اور ان کی شریک حیات اپنی ٹیم کے ہمراہ بچیوں کے لئے کیسا عظیم کام کررہے ہیں۔ ان سب کے احساسات ایک جیسے تھے۔ ان کے دل میں صباہومز کے لئے محبّت اور عزّت تھی۔ صغیر صاحب اور ان کی شریک حیات نے بچیوں کو اپنی لازوال محبت سے نواز رکھا ہے۔ ان کی روح اور دل میں اس کا شاید کوئی چشمہ جاری ہے۔ پیسے، تعلیم، کپڑے، خوراک اور باقی سب اسی لامحدود چشمے کا فیض ہے جو رب پہ ایمان اور اس کی محبت کا چشمہ ہے۔

اس تکلیف دہ دنیا میں جہاں میں بے پناہ لالچ، تفرقہ بازی، عدم برداشت، جھگڑے، جنگ اور انسانیت کی تذلیل دیکھتا ہوں تو بجھ کے رہ جاتا ہوں۔ بعض اوقات اتنا زیادہ، کہ مجھے لگتا ہے میرے اندر کچھ باقی نہیں رہا۔ انسانیت کی امید کہیں اندھیرے میں گم ہونے لگتی ہے۔ پھر ایسے وقت میں، میں صغیر احمد اسلم صاحب جیسے لوگوں کو یاد کرتا ہوں جو خدا پہ گہرا ایمان رکھتے ہیں۔ جو نظم وضبط، مستحکم خیالات اور محبت سے لبریز ہیں جو کبھی ہار نہیں مانتے اور جو کئی لوگوں کی مدد کرتے اور ان کے لئے امید کی شمع روشن کرتے ہیں۔

صغیر صاحب انتہائی عفوّ و درگزر کرنے والے انسان ہیں۔ میں ایسے ہی ایک واقعے کا عینی شاہد ہوں۔ جب ایک شخص جس نے انھیں عطیّات دینے کے لئے اپنے گھر بلایا تھا، شراب کے نشے میں ان پر غصّے میں برس پڑا۔ وہ محض فضول باتیں کرتا رہا کیوں کہ وہ حواس میں نہیں تھا۔ حالانکہ صغیر صاحب بے قصور تھے اس کے باوجود وہ انھیں برا بھلا کہتا رہا۔ ان کی ہتک کرتا رہا۔ مگر صغیر صاحب نہ توخوفزدہ نظر آئے اور نہ ہی پریشان ہوئے۔ الٹا یہ اس وجہ سے اداس تھے کہ شراب، خانہ خراب نے اس آدمی کا یہ حال کردیا

ہے کہ وہ اپنی عقل کھو بیٹھا ہے۔

صغیر صاحب دھیمے مزاج کے آدمی ہیں۔ یہ ایسے اعلیٰ اقدار کے حامل فرد ہیں جو اپنا مقصد پانے کے لئے بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے بچوں کا بہتر مستقبل تخلیق کر رہے ہیں۔ ایسا مستقبل جو انتہا پسندی، دہشت گردی، ناامیدی اور غربت سے پاک ہے۔ میں زندگی میں بے شمار لوگوں سے ملا ہوں مگر جیسی عزت میں ان کی کرتا ہوں ویسی میں نے اپنے دل میں کسی اور کے لئے محسوس نہیں کی۔ وہ انسانیت اور پاکستان کے ہیرو ہیں جیسے ایدھی صاحب ہیں۔ ،وہ اپنے عمل، اپنے الفاظ اور اپنی پوری زندگی کے ذریعے سچے مسلمان کا عملی نمونہ ہیں۔ وہ دنیا کے لئے نمونہ عمل ہیں کہ ایک اچھے انسان کو کیسا ہونا چاہیے؟

قیامت کے دن بارے ہمارا یقین ہے کہ جو لوگ یتیموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے قریب ہوں گے۔ صغیر صاحب کے صاف دل اور نیک اعمال کے سبب، ان کی پر امن فلاحی اداروں کے لئے کی گئی کوششوں کے سبب اور صبا ہومز کی یتیم بچیوں کے لئے کی گئی محنت کی وجہ سے، مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ قیامت کے دن ان نیک روحوں کے ساتھ ہوں گے جو خدا کے قریب ہوں گی۔

محمد خان (سیّاح، دوست)

مجھے صغیر اسلم صاحب کے بارے جو بات حیرت انگیز لگتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی عمر کے اکثر لوگ ریٹائر ہو جاتے ہیں، اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آرام دہ ماحول اپنے آس پاس تخلیق کریں جیسا کہ ساحل سمندر پہ ایک آرام دہ گھر ہو۔ جہاں سے بہترین ہسپتال اور ڈاکٹر دور نہ ہوں۔ ان کے بچّے اور ان کے بچّوں کے بچّے وہاں سے قریب ہوں۔ مگر صغیر اسلم اور بشریٰ اسلم ایسے لوگوں میں سے نہیں۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے برعکس ایسے بچّوں کی کفالت اپنے ذمّہ لے لی جن کا ان سے کوئی خون کا

رشتہ نہ تھا۔ ایسے بچے، جن کے بارے قرآن کئی جگہوں پر مومنوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کا خیال رکھیں۔ یتیم، خصوصاً یتیم بچّے اس دنیا کے مظالم کا آسان شکار ہیں۔ صغیر صاحب اب اپنی زندگی ان بچّوں کا خیال رکھتے اور ان سے محبت کرتے گزاریں گے۔ ایسی محبت جیسی وہ اپنے بچّوں سے کرتے ہیں۔

Muhammad Khan (Friend, World Traveller)

My journey with Mr Saghir Aslam started when I was very young, organizing Youth Groups and Student groups. As youth 30 years ago, we called him uncle Saghir. We could always count on him and his family for support. He was our teacher, role model, and guide. Always he was dedicated to Community affairs. He is Pioneer of Our Mosque in Garden Grove California .

During the 1980s and 1990s the gang violence in Los Angeles was out of Control, Back then Uncle Saghir sponsored many of our programs to end violence. Many of the conflict resolution work between Blood and Cripps Gangs was due to Uncle Saghir Philanthropy.

Photo of graduation ceremony for life Skills and Conflict Resolution with Former Gang Leaders and members who chose to end violence by Unity One which I was Advisor to for over 18 years. Photo with Darren Bahauddin (Bo) Taylor Founder Unity One with Advisor Muhammad Akbar Khan and Legendary Football Player Jim Brown founder Amer-I-Can, all on a mission to end Violence. Uncle Saghir Always sponsored these events. I remember when he was one of the sponsors the United Nations Event.

We all traveled to NY including Uncle Saghir Amazing wife Bushra. I was co-chair with Carole Kretchman who was the Founder of Peacemakers Corp. Their mission was to train people to train others to be peacemakers. We had a conference at the UN to emphasize ending violence the Domestic Component was end Gang Violence and the International component focused on Stopping War with a focus on Africa

since Sudan just ended decades of War within its borders at the time .

Photo Carol Kretchman Founder Peacemakers Corp at UN Conference Feb 2003. During The Balkan Crisis People of Bosnia and Kosovo were being massacred and Ethnically cleansed. I with my friend Bekim Hassani help resettle over 30 Families in Southern California. Had it not been for Uncle Saghir and His Family to receive and help find Food, Clothing and Shelter for these refugee families I could not have done it .

When Uncle Saghir Told me he wanted to Set up a unique home to help the Orphan girls of Pakistan I was not surprised. He and his wife were always serving others before themselves. But what amazed me at his age people go to the nice Beach House in Huntington Beach and retire. Instead he put his life savings into building a Six Star home for Orphaned girls left the comfort of sunny California and went to Rawalpindi to raise these children as his very own children. The Holy Quran's theme is to help the Yateem, The Orphan. We meet very few people in this world that actually follow the Quran and do this.

Uncle Saghir and His wife Bushra not only follow this by building a home they fill it with Warm Love, Caring and Guidance with their presence. At Retirement age they started a new life to raise children that would have not survived the cruelty of poverty and the criminals on the street.

Quran, States "If You save one life you will have saved the whole human Race."

May Allah bless Uncle Saghir and his wife Bushra with the highest place in Heaven.

History tomorrow will show that Uncle Saghir as the Father of Orphans in Pakistan. His Model will be copied as a standard for generations to come. I remember when I went to the Inaugural of Saba Homes and we invited my good friend Qari Syed Saddaqat Ali. He was moved and touched by what uncle Saghir has accomplished. The young journalists were in tears.

People would give anything to live in America but a man and his wife left the comforts of America sacrificed their money to personally raise a generation of beautiful children. I can write a book about my Journey with uncle Saghir but I will stop here. He has allowed me and whosoever crosses his path to gain the Akhirath by simply encouraging him, supporting the mission, and promoting his much needed Saba Homes. I am not helping Uncle Saghir but he is helping me to meet Allah on the Day Of Judgment. To be known by my Intentions and deeds as a helper to his servant who is raising Allah's special children on earth, the Yateems. Keeping them out of harm's way and providing for them what every child deserves.

روم میں میرا ٹریفک چالان ہوا۔ مصروفیت کے باعث فیس وقت پہ ادا نہ کر سکا۔ کورٹ جانا پڑا۔ جج کے سامنے پیش ہوا تو اس نے مصروفیت پوچھی۔ میں نے کہا کہ پروفیسر ہوں۔ مصروف ایسا رہا کہ وقت ہی نہ ملا۔ اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا۔ جج نے کہا۔ "A teacher is in the court" اور سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ اس روز میں اس قوم کی ترقی کا راز جان گیا۔

(اشفاق احمد)

باب ہشتم

میری پسند

☆ اے رسول ﷺ فرما دیجیے کہ اگر تم دعا نہیں کرتے تو میرا پروردگار بھی تمہاری کوئی پروا نہیں کرتا۔(سورۂ فرقان 77)

☆ اے ہمارے رب اگر ہم سے بھول ہو گئی ہو یا کوئی خطا ہوئی تو ہماری پکڑ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب۔ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پہ ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب۔ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔(آمین) ۔ سورہ البقرہ۔ 286

☆ حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم.....!جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے مغفرت کی امید رکھے گا تو میں تجھے معاف کرتا رہوں گا۔ اے ابن آدم.....!اگر تیرے گناہ آسمان تک بھی پہنچ جائیں پھر بھی اگر تو مجھ سے مغفرت مانگے گا تو میں تجھے معاف کر دوں گا اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔(کتاب الداعوت 3674)

☆ غربت خیرات سے نہیں انصاف سے ختم ہوتی ہے۔ نیلسن منڈیلا

☆ نرم دل لوگ احمق ہر گز نہیں ہوتے وہ جانتے ہیں لوگ ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ بار بار در گزر کرتے ہیں کیوں کہ وہ ایک خوبصورت دل کے مالک ہوتے ہیں۔

☆ اللہ کی قربت کا بہترین راستہ عاجزی ہے۔

☆ ایک میٹھا بول خیرات سے بہتر ہے۔

☆ درخت اپنے پھل سے اور انسان اپنے قول و فعل سے پہچانا جاتا ہے۔

☆ یا اللہ ہمیں عاجزی، انکساری، درگزر اور توبہ کرنے والوں میں شامل فرما۔ (آمین)

☆ یا اللہ میں تجھ سے ہر اس گناہ کی معافی مانگتا ہوں جو میں نے جان بوجھ کر کیا یا جو مجھ سے انجانے میں ہوا۔ جو میرے علم میں ہے یا میرے علم میں نہیں ہے تو سب جانتا ہے۔ اے اللہ میرے سب گناہ معاف کر دے۔ تو ہی میرا رب ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ (آمین۔ ثم آمین)۔

☆ میں ایم بی بی ایس یا پی ایچ ڈی بھی کر لوں تو اپنی ماں کا چہرہ دیکھ کے بھی ان کی

پریشانی نہیں بتا سکتا۔ مگر میری ماں بے شک اسے اپنا نام بھی لکھنا نہ آتا ہو۔ مگر پھر بھی وہ میری مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا دکھ، اور میری آنکھوں کے اندر لکھی ہوئی پریشانی کو پڑھ لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی ماؤں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ سادگی اپنائیں، سب سے محبت کریں، سب کا خیال رکھیں، نرمی سے بات کریں۔ باقی سب خدا پہ چھوڑ دیں۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:۔ جب اندھیرا چھانے لگے یا رات تاریک ہونے لگے تو اپنے بچوں کو باہر جانے سے روک لو۔ کیوں کہ اس وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ جب عشاء کی پہلی ساعت گزر جائے تو انھیں چھوڑ دو۔ اور اللہ کا نام لے کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لو۔ اللہ کا نام لے کر چراغ بڑھا دو۔ اللہ کا نام لے کر برتنوں کو ڈھانپ دو۔ (بخاری شریف جلد دوم 510)

☆ یا اللہ میری زبان کو ٹھیک بات کہنے والی بنا دے، میرے دل کو ہدایت عطا فرما، اور میرے دل سے کھوٹ، کینہ اور حسد نکال دے۔ (آمین)

☆ جب آپ کسی عورت کو نامناسب لباس میں دیکھتے ہیں جو اسلامی لحاظ سے قابل قبول نہیں تو آپ ایک لمحے کے لئے بھی یہ ہرگز مت سوچیں کہ وہ آپ سے

اچھی مسلمان نہیں۔ اگر آپ ایسا سوچتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اچھے مسلمان نہیں ہیں۔ آپ میرا یقین کریں اسلام ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا خدا سے ایسا رابطہ ہو جو آپ کے علم میں نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایسا کردار رکھتی ہو جو آپ کے پاس نہیں۔ اس میں ایک ہی خامی ہو جو نظر آتی ہے اور آپ کے اندر پچاس خامیاں ہوں جو پوشیدہ ہیں۔

☆ یا اللہ جب میں مایوس ہو جاؤں کہ میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں تو یہ یاد کرنے میں میری مدد فرما کہ تیرا پیار اور رحمت میری مایوسیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور میری زندگی کے بارے میں تیرے فیصلے میری خواہشوں سے کہیں بہتر ہیں۔ یا اللہ میری وہی دعائیں قبول فرما جس میں تیری رحمت اور تیری رضا شامل ہو اور مجھے ایسا کچھ نہ عطا فرما جس میں میری بربادی پوشیدہ ہو۔ یا اللہ مجھے اپنی رحمتوں سے گھیرے رکھ اور مجھے کبھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔

☆ ایک بزرگ نے ایک دیوار پر بڑا سا سفید پیپر لگایا اور مار کر سے اس پر ایک کالا نقطہ ڈالا، پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر پوچھا..... تمھیں کیا نظر آ رہا ہے ..... لوگ بولے..... کالا نقطہ..... بزرگ بولے..... کمال ہے..... اتنا بڑا سفید پیپر نظر نہیں آ رہا اور ایک چھوٹا سے نقطہ نظر آ رہا ہے..... یہی حال لوگوں کا ہے۔ انھیں کسی انسان کی ساری زندگی کی اچھائیاں نظر نہیں آتیں اور کی ہوئی برائی نظر آ جاتی ہے۔

☆ آپ کی زندگی میں ایک وقت ایسا آئے گا جب آپ کو عزت اور محبت میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو گا۔ آپ ہمیشہ عزت کا انتخاب کریں کیوں کہ عزت کے بنا محبت تا دیر نہ چلے گی۔ لیکن عزت گہری اور ازلی محبت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

☆ رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کرو۔ کیوں کہ رزق انسان کو ایسے تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو موت۔

☆ کسی انسان کی خوبی پہچانو اور اسے بیان کرو لیکن اگر کسی کی خامی مل جائے تو یہاں تمہاری خوبی کا امتحان ہے۔

☆ اپنے خیالوں کی حفاظت کریں کیوں کہ یہ الفاظ بن جاتے ہیں۔ اپنے الفاظ کی حفاظت کریں کیوں کہ یہ اعمال بن جاتے ہیں۔ اپنے اعمال کی حفاظت کریں کیوں کہ یہ کردار بن جاتے ہیں اور اپنے کردار کی حفاظت کریں کیوں کہ یہ آپ کی پہچان بن جاتے ہیں۔

☆ جو شخص تم پہ غصہ بھی کرے اور تعلق بھی ختم نہ کرے تو وہ برے وقت میں تمہارا سب سے اچھا دوست ہے۔

☆ جب تمہارے دل میں کسی کے لئے نفرت پیدا ہونے لگے تو اس کی اچھائیوں کو یاد کرو۔

☆ میں نے اس دنیا پر نظر ڈالی۔ ہر کوئی کسی نہ کسی سے محبت کرتا ہے اور اس کو چھوڑ کر قبر میں چلا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں نیکیوں سے محبت کروں تاکہ وہ مجھے قبر میں بھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ (امام غزالیؒ)

☆ سمندر بہت بڑا ہے لیکن ہم اس میں سے اتنا ہی پانی لے سکتے ہیں جتنا ہمارے ہاتھ میں آتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی رحمتیں لامحدود ہیں لیکن ہم اتنا ہی پاتے ہیں جتنا ہمارا ایمان ہوتا ہے۔

☆ لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام اس طرح بنالو کہ مر جاؤ تو تمہارے لئے روئیں اور زندہ رہو تو تم سے ملنا پسند کریں۔

☆ ایک اچھا دوست پھول کی طرح ہوتا ہے جسے ہم چھوڑ بھی نہیں سکتے اور توڑ بھی نہیں سکتے۔ اگر توڑ دیا تو مرجھا جائے گا اور اگر چھوڑ دیا تو کوئی اور لے جائے گا۔

☆ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کسی کو دھوکہ نہ دینا۔ دھوکے میں بڑی جان ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں مرتا، گھوم کر ایک دن واپس آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے کیوں کہ

اس کو اپنے ٹھکانے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ (اشفاق احمد)

☆ کسی کا ظرف دیکھنا ہو تو اسے عزت دو۔ کسی کی فطرت دیکھنی ہو تو اسے آزادی دو۔ کسی کی خصلت دیکھنی ہو تو اس کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ کسی کا صبر دیکھنا ہو تو اس پر تنقید کر کے دیکھ لو۔ کسی کا خلوص دیکھنا ہو تو اس سے مشورہ کر کے دیکھ لو۔ مگر دوسروں کو دیکھنے کے بجائے خود کو ہی دیکھ لو تو سب سے بہتر ہے۔

☆ ہمارے گاؤں میں جب کوئی اماں تیلن سے دو آنے کی تیل کی کپی لینے جاتا تو اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی اور بٹھا دیتی۔ ماں کا حال پوچھتی اور کہتی پتر روٹی کھائے گا۔ وہ کہتا کہ نہیں اماں بس تیل دے دیں۔ اس کے انکار کے باوجود اماں تیلن اسے تیل دینے سے پہلے ایک پھلکا روٹی کھلاتی۔ اس پر مکھن کا پیڑا رکھتی۔ دو آنے کا تیل دیتی، حالاں کہ جو روٹی اور مکھن کا پیڑا وہ کھلاتی وہ شاید تین آنے کا بنتا ہو۔ لیکن ان وقتوں میں شاید ایسی باتیں نہیں سوچی جاتی تھیں۔ اور محبتوں میں حساب نہیں کئے جاتے تھے اور لوگ اعداد و شمار سے زیادہ محبت پہ یقین رکھتے تھے۔ پیسے سے زیادہ انسان پہ توجہ دیتے تھے۔ (اشفاق احمد)

☆ کیا آپ کو معلوم ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ روئے زمین پر سب سے بڑی فقیہہ تھیں۔ ☆حضرت عائشہؓ پر تمام عورتوں کی تربیت کی ذمہ داری تھی۔ ☆حضرت عائشہؓ کے لئے اللہ تعالیٰ نے سترہ (17) آیات نازل فرمائیں۔ ☆حضرت عائشہ صدیقہؓ عورتوں کے مسائل کی تمام حدیثوں کی راوی تھیں۔

☆حضرت عائشہؓ حضور پاک ﷺ کی وہ زوجہ محترمہ تھیں جن کے بستر پر وحی نازل ہوئی۔ ☆حضرت عائشہؓ کی عصمت و طہارت اور پاکیزگی کی شہادت سورۂ نور میں ہے۔

☆ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، میرے ذکر کے لئے وقت نکالو، میں تمہارے کام میں برکت عطا کروں گا۔ ورنہ دنیاوی کاموں کی کثرت تم پر اس قدر مسلط کر دوں گا کہ تمہیں فرصت ہی نہ ہو گی اور سکون سے محروم رہو گے۔ (صحیح بخاری)

☆ محبت وہ شخص کر سکتا ہے جو اندر سے خوش ہو، مطمئن ہو اور پر باش ہو۔ محبت کوئی سہ رنگا پوسٹر نہیں کہ کمرے میں لگا لیا..... سونے کا تمغہ نہیں کہ سینے پہ سجا لیا..... پگڑی نہیں کہ خوب کلف لگا کر باندھ لی اور بازار میں آگئے طرہ چھوڑ کے۔ محبت تو روح ہے..... آپ کے اندر کا اندر..... آپ کی جان کی جان..... محبت کا دروازہ صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے جو اپنی انا، اپنی ایگو اور اپنے نفس سے جان چھڑا لیتے ہیں۔ (اشفاق احمد)

☆ خاموشی ایسا درخت ہے جس پر کڑوا پھل نہیں لگتا۔

☆ حسد ایسا دیمک ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کر دیتی ہے۔

☆ سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی اور تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔

☆ ذہانت ایسا پودا ہے جو بغیر محنت کے نہیں لگتا۔

☆ خوش اخلاقی ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس ہوتی ہے۔

☆ نفس وہ گھوڑا ہے جس پر انسان اگر قابو پالے تو دنیا اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔

☆ ہاتھ میرے گر کمزوری سے کانپ اٹھیں اور کھانا میرے اوپر گر جائے تو مجھ کو نفرت سے مت تکنا، لہجے کو بیزار نہ کرنا، بھول نہ جانا ان ہاتھوں سے تم نے کھانا کھانا سیکھا۔ جب تم کھانا میرے کپڑوں اور ہاتھوں پر مل دیتے تھے۔

☆ گلستانِ سعدی میں لکھا ہے کہ ایک شخص ایک بزرگ کے پاس گیا اور درخواست کی کہ میرے گھر میں غربت اور پریشانیاں ہیں ان کے لئے کوئی حل تجویز کریں۔ بزرگ نے فرمایا تم کیا کام کرتے ہو۔ انھوں نے کہا میں کسی کے ہاں اجرت پہ کام کرتا ہوں۔ بزرگ نے کہا تم اپنے مالک سے کہو کہ وہ تمہاری اجرت کم کر دے۔ اس شخص نے سوچا کہ پہلے ہی میرے گھر میں غربت ہے۔ تنخواہ کم کرنے سے حالات مزید خراب ہی ہوں گے۔ تاہم وہ بزرگ کے سامنے

خاموش رہا اور واپس آ کے اپنے مالک سے اپنی اجرت کم کرنے کی درخواست کی۔ مالک نے بخوشی اس کی تنخواہ کم کر دی۔ چند ماہ بعد وہ شخص دوبارہ اس بزرگ کے پاس گیا اور کہا کہ میری پریشانیاں کافی حد تک ختم ہو گئی ہیں مگر ابھی بھی حالات پورے طور پر درست نہیں ہوئے۔ بزرگ نے فرمایا اپنے مالک سے کہو کہ وہ تمہاری اجرت مزید کم کر دے۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ چند ماہ بعد وہ دوبارہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ آپ اللہ کے فضل سے ہمارے گھر میں خوشحالی ہے۔ پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں سمجھ آ رہی کہ پہلے جب زیادہ اجرت لے رہا تھا تو گھر میں پریشانیاں زیادہ تھیں مگر جب میں نے اجرت کم لینا شروع کی تو حیران کن طور پر حالات اچھے ہو گئے۔ بزرگ نے فرمایا تم اپنے حق سے زیادہ تنخواہ لے رہے تھے۔ اس وجہ سے تمہارے گھر میں پریشانیاں اور مسائل زیادہ تھے۔ جب تم نے اپنے حق کے مطابق اجرت لینا شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ساری پریشانیاں ختم فرما دیں۔

اقوالِ زریں

☆ تفکر سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے

☆ دنیا ایک ایسا زہر ہے جسے وہی پی سکتا ہے جو اس کی پہچان نہیں رکھتا۔

☆ تعلیم اور عمل سے انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

☆ قرآن مجید صرف پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ہے۔

☆ سب سے افضل حیا، اللہ تعالیٰ سے ہے۔

☆ انتقام ہمارے نفس کی کمزوری ہے۔(حضرت علی ؓ)

☆ ہر عمل کے اندر اس کا انجام چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

☆ پرانے دوستوں کی حفاظت انسان کی عظمت ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ اور دولتِ دنیا کی پوجا ایک ساتھ نہیں کی جا سکتی۔

☆ گفتگو ایک دوا ہے۔ ٹھیک مقدار میں فائدہ مند، زیادہ ہو تو نقصان دہ۔

☆ جو گناہ کر کے کامیاب ہوا وہ کامیاب نہیں۔

☆ اپنی خوراک کو گھٹاؤ تا کہ بیماری گھٹ جائے۔

☆ جو دوست بنا کے دھوکہ دیتا ہے وہ سب سے بدنصیب شخص ہے۔

☆ ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے امید نہ رکھے۔ گناہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے۔

☆ کامیاب شخص وہ ہے جو آخرت کی خاطر دنیا کو بیچ دے۔

☆ اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے نرمی سے دیتا ہے۔ سختی سے نہیں۔

☆ اگر نرمی کی شکل ہوتی تو اس سے اچھی شکل کسی کی نہ ہوتی۔

☆ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: تین دن سے زیادہ کسی کے ساتھ ناراض نہ رہو۔

☆ بے عمل علما، تیر کے بغیر تیر انداز ہیں۔

☆ رسول پاک ﷺ رحم دل، امین اور دیانت دار تھے۔

☆ دشمن پر قابو پانے کے بعد نعمت کا شکر ادا کرو۔ اسے معاف کر دو۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ:

'توحیدِ خالص، صراطِ مستقیم، نیت اور عمل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشنودی کے لئے تھا۔

☆ جو زیادہ ہوشیاری دکھاتا ہے وہ بدگمانی میں ہے۔

☆ جو شخص اپنی قدر آپ نہیں کرتا دوسرے کیسے کریں گے۔

☆ اللہ تعالیٰ اور موت کو کبھی نہ بھولیں۔

☆ جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔

☆ چار قسم کے لوگ بخشے نہیں جائیں گے:

1۔ شراب پینے والا 2۔ ماں باپ کا نافرمان 3۔ رشتوں کو توڑنے والا 4۔ بغض و کینہ رکھنے والا

☆ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

☆ قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ فرقہ بندی ہے۔

☆ دنیا کافر کے لئے جنت ہے اور مومن کے لئے قید خانہ

☆ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا انسان میں کتنے عیب ہوتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا بے شمار عیب ہیں لیکن ایک خوبی سب پہ پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ہے زبان پہ قابو۔

اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے

میری طرف آ کر تو دیکھ — متوجّہ نہ ہوں تو کہنا
میری راہ میں چل کر تو دیکھ — راہیں نہ کھول دوں تو کہنا
مجھ سے سوال کر کے تو دیکھ — بخشش کی حد نہ کر دوں تو کہنا
میرے لئے بے قدر ہو کے تو دیکھ — تیری قدر کو بے حد نہ کر دوں تو کہنا
میرے لئے ملامت سہہ کر تو دیکھ — اکرام کی انتہا نہ کر دوں تو کہنا
میرے لئے لٹ کر تو دیکھ — رحمت کے خزانے نہ لٹا دوں تو کہنا
میرے کوچے میں بک کر تو دیکھ — انمول نہ کر دوں تو کہنا
مجھے ربّ مان کر تو دیکھ — سب سے بے نیاز نہ کر دوں تو کہنا
میرے خوف سے آنسو بہا کر تو دیکھ — مغفرت کے دریا نہ بہا دوں تو کہنا
وفا کی لاج نبھا کر تو دیکھ — عطا کی حد نہ کر دوں تو کہنا
میرے نام کی تعظیم کر کے تو دیکھ — تکریم کی حد نہ کر دوں تو کہنا
اپنی ہستی کو فنا کر کے تو دیکھ — جام بقاء سے سرفراز نہ کر دوں تو کہنا
مجھے حیّ القیّوم مان کر تو دیکھ — ابدی حیات کا امین نہ بنا دوں تو کہنا
بالآخر میرا ہو کر تو دیکھ — ہر کسی کو تیرا نہ بنا دوں تو کہنا

اے ابن آدم!

ایک تیری چاہت ہے
اور ایک میری چاہت ہے
ہو گا وہی جو میری چاہت ہے
پس اگر تو نے سپرد کر دیا
اپنے آپ کو اس کے جو میری چاہت ہے
تو وہ بھی تجھے دونگا جو تیری چاہت ہے
اگر تو نے مخالفت کی اس کی جو میری چاہت ہے
تو تھکا دونگا تجھ کو اس میں جو تیری چاہت ہے
پھر ہو گا تو وہی جو میری چاہت ہے۔

کی جاناں میں کون بلھیا

نہ میں مومن وچ مسیتاں نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں نہ وچ بیٹھن نہ وچ بھون
بلھیا! کی جاناں میں کون

نہ میں اندر وید کتاباں نہ وچ بھنگاں، شرب شراباں
نہ وچ رنداں مست خراباں نہ وچ جاگن نہ وچ سون
بلھیا! کی جاناں میں کون

نہ وچ شادی نہ غم ناکی نہ میں وچ پلیتی پاکی
نہ میں آبی نہ میں خاکی نہ میں آتش نہ میں پون
بلھیا! کی جاناں میں کون

نہ میں بھید مذہب دا پایا نہ کجھ اپنا نام دھرایا
نہ میں آدم حوّا دا جایا نہ میں موسیٰؑ نہ فرعون
بلھیا! کی جاناں میں کون

اوّل آخر آپ نوں جاناں ناں کوئی دوجا ہور پچھاناں
میتھوں کیہڑا ہور سیاناں بلھا، اوہ کھڑا ہے کون

ایک نظم

امید ابھی کچھ باقی ہے
اک بستی بسنے والی ہے
جس بستی میں کوئی ظلم نہ ہو
اور جینا کوئی جرم نہ ہو
وہاں پھول خوشی کے کھلتے ہوں
اور موسم سارے ملتے ہوں
بس رنگ اور نور برستے ہوں
اور سارے ہنستے بستے ہوں
امید ہے ایسی بستی کی
جہاں جھوٹ کا کاروبار نہ ہو
کوئی دہشت کا بازار نہ ہو
اور جینا بھی دشوار نہ ہو
کچھ مرنا بھی آزار نہ ہو
یہ بستی کاش تمہاری ہو
یہ بستی کاش ہماری ہو
وہاں خون کی ہولی عام نہ ہو
اس آنگن غم کی شام نہ ہو
جہاں منصف سے انصاف ملے
دل سب کا سب سے صاف ملے
ایک آس ہے ایسی بستی کی
جہاں روٹی زہر سے سستی ہو
امید ابھی کچھ باقی ہے
اک بستی بسنے والی ہے

متفرق اشعار

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینے میں اجالا کر دل صورت سپنا دے

☆☆☆

گھپ اندھیروں کو نور دیتا ہے ذکر اس کا سرور دیتا ہے
اس کے در سے جو بھی مانگے گا، میرا اللہ ہے ضرور دیتا ہے

☆☆☆

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

☆☆☆

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

☆☆☆

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

☆☆☆

مرنے والے مرتے ہیں، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

☆☆☆

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
اے موج دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

☆☆☆

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

☆☆☆

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

☆☆☆

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے
تیری محفل بھی گئی،چاہنے والے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے،اپنا صلہ لے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

☆☆☆

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

☆☆☆

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆☆☆

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

☆☆☆

منفعت ایک ہے اس قوم کی،نقصان بھی ایک
حرم پاک بھی،اللہ بھی، قرآن بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی، ایمان بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی،ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

☆☆☆

قلب میں سوز نہیں،روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

☆☆☆

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو،افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

☆☆☆

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

☆☆☆

مرد مے آئد کہ زنجیر غلامی بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

☆☆☆

دل میں افسوس آنکھوں میں نمی سی رہتی ہے
زندگی میں شاید کوئی کمی سی رہتی ہے
مجھ سے روٹھ جاتے ہیں اکثر اپنے وصی
شاید میرے خلوص میں کمی سی رہتی ہے

☆☆☆

ہر مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

☆☆☆

تصویر گیلری

Sacramento Junior College
SACRAMENTO, CALIFORNIA

November 19, 1957

TO WHOM IT MAY CONCERN:

Mr. Saghir Aslam is a Pakistanian student in the Sacramento City College. He needs work and I have found him to be a very responsible and diligent employee. I list the following jobs he has held as a student:

1. He served as both janitor and porter for the Stewart Commissary Company.
2. He was stockboy and salesman for Wood Bros., 12th and North B Streets.
3. He worked as delivery boy for Capitol Photo Service.
4. He has worked as a gas station attendant.
5. He has served as bus boy for Hart's Restaurant, and dishwasher for the ElDorado Hotel.
6. He worked as salesman for Capitol Tractor and Implement Company.

When employment is scarce he does painting, garden work and general work around the house, such as, window washing and floor polishing. He was in England for seven months and worked as a bell-boy for a hotel. As you can see Mr. Aslam is an enterprising young man.

He needs to have a part-time job in order to accomplish his educational objectives. I am happy to recommend him for any work for which he is qualified.

Sincerely yours,

Gladys Hayford

Gladys Hayford
Foreign Students' Advisor

GH:es

مسز ہیفورڈ کا لکھا گیا سفارشی خط

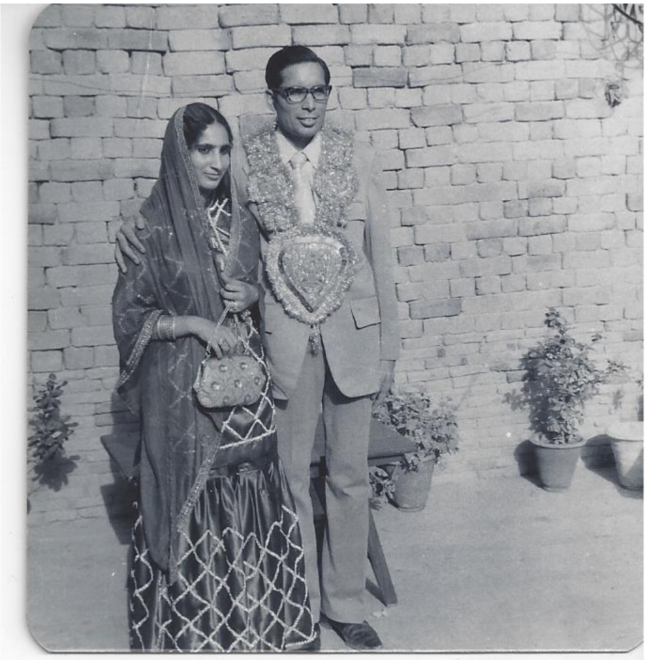

شادی کے موقع پر اپنی بیگم بشریٰ سلطانہ اسلم کے ہمراہ

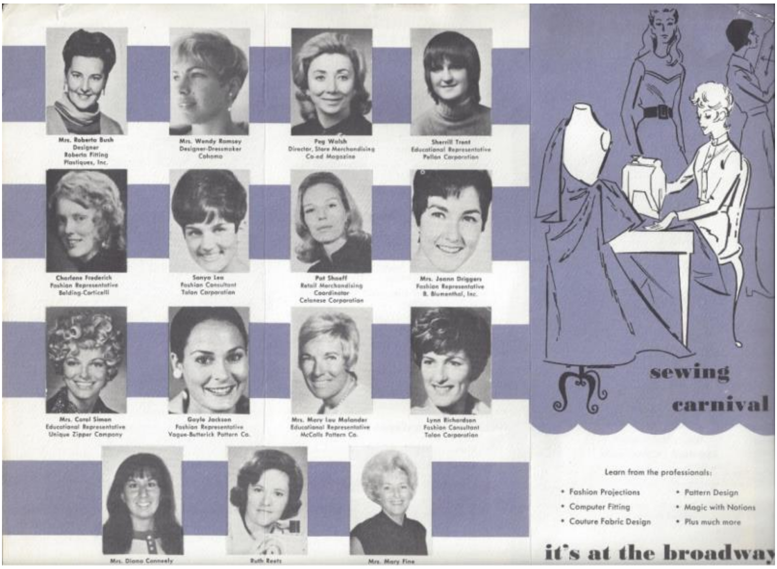

براڈوے کی طرف سے بلائے گئے ماہرین کا تعارف اور تصاویر

دیگر بھائیوں کے ہمراہ ایک یادگار تصویر

گولڈن نیڈل سٹور کی منیجر صائمہ کے ساتھ

YOUNG IDEAS — *Surrounded by the hundreds of available fabrics and sewing needs at the Golden Needle, 10-year-old Syma Aslam shows off a hand-painted and beaded tee-shirt to her sister Aisha, 5. Materials for this form of clothing art are available among the many clothing accessories and decorations. The Golden Needle, 1152 Irvine Blvd., in Tustin Heights Shopping Center, has one of the largest stocks west of the Rockies, floor to ceiling. of fabrics for every need.*

NEWS Photo

ایک اخباری تراشہ جس میں صائمہ اور عائشہ گولڈن نیڈل سٹور میں نظر آ رہی ہیں

بسم الله الرحمن الرحيم

To the Muslim Youth

TEN BASIC PRINCIPLES TO REMEMBER

1 Love Allah and love His Prophet Muhammad -peace be upon him- more than anyone or anything else.

2 Pray regularly and on time. Remember that thoughtful prayers prevent from all sins and bad deeds.

3 Read the Qur'an everyday with the meaning and try to follow what you learn. Remember, the Qur'an is a spiritual food for you, do not starve your soul from this food. A day without the Qur'an is a lost day.

4 Always be careful about what you say, what you eat and what you do. Remember, if you do something Haram knowingly, you will never be happy, neither in this life nor in the life to come.

5 Always respect your parents, your elders and be kind to all your relatives. Remember, the best people are those who are good to their families.

6 Love all Muslims and pray for them. Treat every person with respect and kindness whether they are young or old, poor or rich.

7 Always seek excellence in your education, work, behavior and life in general. Be clean, punctual and smart. Remember, Allah loves those who strive for excellence.

8 Be good to all people, Muslims and non-Muslims. Never compromise on your principles, but be tolerant and listen attentively and carefully to other people's viewpoints. Change your opinions and admit your mistakes as soon as you realize that you were wrong.

9 Be always cheerful and optimistic. Have faith and confidence that with patience and persistence all obstacles will be removed and Allah will grant you success.

10 Always believe that the final judgement of everything will be in the Hereafter. Always pray to Allah for forgiveness and for success and salvation in the eternal life.

Presented to the Muslim youth on the occasion of Aisha Aslam's Ameen & Syma Aslam's Completion of the Qur'an with Translation held on Rabi'ul Awwal 29, 1413/September 26, 1992 by Dr. Muzammil H. Siddiqi.

نوجوانوں کے لئے 10 بہترین اصول

Manager Diane Waters with firm's vice president Mukhtar Ahmad Nuarat

Golden Needle still sews them while-U-wait

In the mid-1970's Saghir Aslam made headlines with a notice that his store in South Coast Plaza Mall would make "dresses while you wait."

The Golden Needle still is delivering "instant dresses," but Aslam has added a Fantasy Room and a home-decorating room.

"We are no longer just a fabric store," Aslam said, "we provide personalized designer fabrics. Customers come from 50 miles away."

The Fantasy Room carries silks, ranging from $6.99 a yard to $200 a yard, material for wedding dresses and party dresses. If a bride expects to make her own dress, the Golden Needle staff will tell her how to do so and will also advise her on all the other items necessary for the ceremony whether for flower girls or groom.

The home-decorating room will show customers how to make drapes, cur-

Santa Ana firm leads all in sales of Elna machines

"We have always believed in giving a dollar's worth for a dollar. In other words, we treat people the way we would like to be treated," said Walt Hunt, owner of Wheeler's, located at 316 W. Fourth St., Sante Ana.

"amount to about one-half of my business," he said.

Not content with just the sales and service of sewing machines, home overlocks, cabinets, and notions, the firm offers classes, and a display area for those who want to

'Know thy dealer,' says Mel

The single most important thing to the buyer of a sewing machine is the dealer who sells it.

That is the view of Edwin Lytton who started repairing and selling sewing machines more than a quarter-century ago. His shop, Mel's Industrial Machines, has been located in the vicinity of 1023 N. Euclid St., Anaheim, most of that time.

"The question with a dealer," Lytton said, "is what does he offer besides the machine itself. How about lessons on its use? How about service."

He stresses the lessons part, even for experienced seamstresses.

"Sure, you can do a few things without going back to class," he acknowledged. "But you don't really get all you paid for unless you bone up on the machine itself."

The second suggestion that Lytton has for sewing machine users is to standardize on a specific thread.

"Many of the problems that crop up are just thread tension. Pick out one brand and stick with it," he said.

Today he holds a fran-

na. The name of his shop, Mel's, was coined from his wife's initials, Mary E. Lytton.

As he talked, a customer carried in a Bernina. Lytton flipped open the dust cover, swiftly dabbed and oiled, popped in a bobbin, sewed a test pattern, adjusted the thread tension, tested again, successfully recommended a new bobbin wheel, and handed the instrument back.

"I can take it now?" she asked with a note of surprise.

Learn the new way to sew
in four easy lessons
Special Offer Yes!
Offer good until April 28.
STRETCH & SEW FABRICS
ORANGE
HUNTINGTON BEACH

گولڈن نیڈل سٹور کی اخباری کوریج کا ایک تراشہ

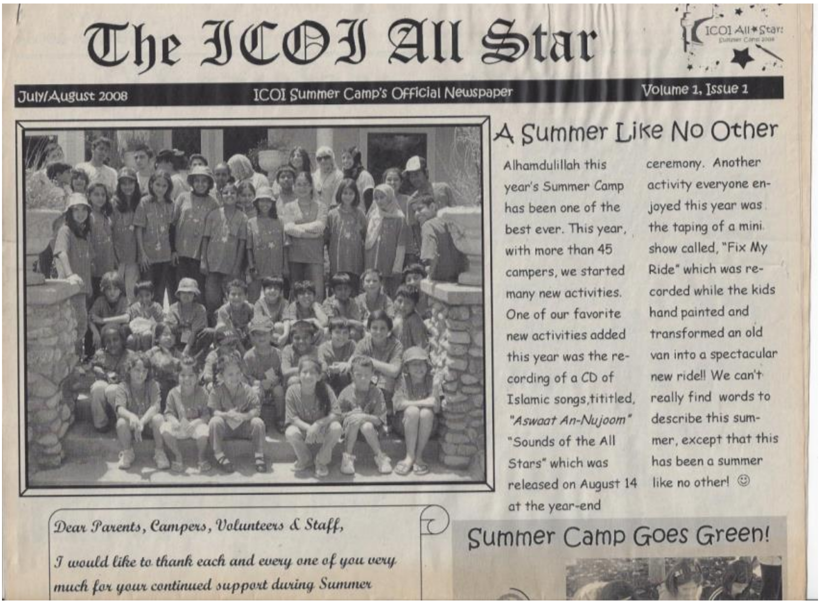

The ICOI All Star

ICOI All★Star Summer Camp 2008

July/August 2008 | ICOI Summer Camp's Official Newspaper | Volume 1, Issue 1

A Summer Like No Other

Alhamdulillah this year's Summer Camp has been one of the best ever. This year, with more than 45 campers, we started many new activities. One of our favorite new activities added this year was the recording of a CD of Islamic songs,tititled, *"Aswaat An-Nujoom"* "Sounds of the All Stars" which was released on August 14 at the year-end ceremony. Another activity everyone enjoyed this year was the taping of a mini show called, "Fix My Ride" which was recorded while the kids hand painted and transformed an old van into a spectacular new ride!! We can't really find words to describe this summer, except that this has been a summer like no other! ☺

Dear Parents, Campers, Volunteers & Staff,

I would like to thank each and every one of you very much for your continued support during Summer

Summer Camp Goes Green!

عائشہ اپنے سکول کے بچوں کے ہمراہ سمر کیمپ کے موقع پر

OCS students pay tribute to local emergency services.

OCS Pays Tribute to Local Emergency Services

GARDEN GROVE, CA: Students from Orange Crescent School paid a special tribute to local Emergency Services on Wednesday, Nov 5, 1997. Members from Garden Grove Police Department. Fire Crew and local paramedics arrived at the school where they were presented with Appreciation Awards from Dr. Muzammil Siddiqi. Aceile Ahmed, Aisha Aslam, Ahmed Huzair, Abdel Rahman and Masood Omar gave speeches to acknowledge the efforts of our Emergency Services. Sister Sabiha Quidwai (PTA Co-Chairperson) said that she was proud that the PTA was able to sponsor such a program.

عائشہ اسلم اورنج کریسنٹ سکول کے بچّوں کے ہمراہ

عائشہ اپنے سکول کے بچوں کے ہمراہ

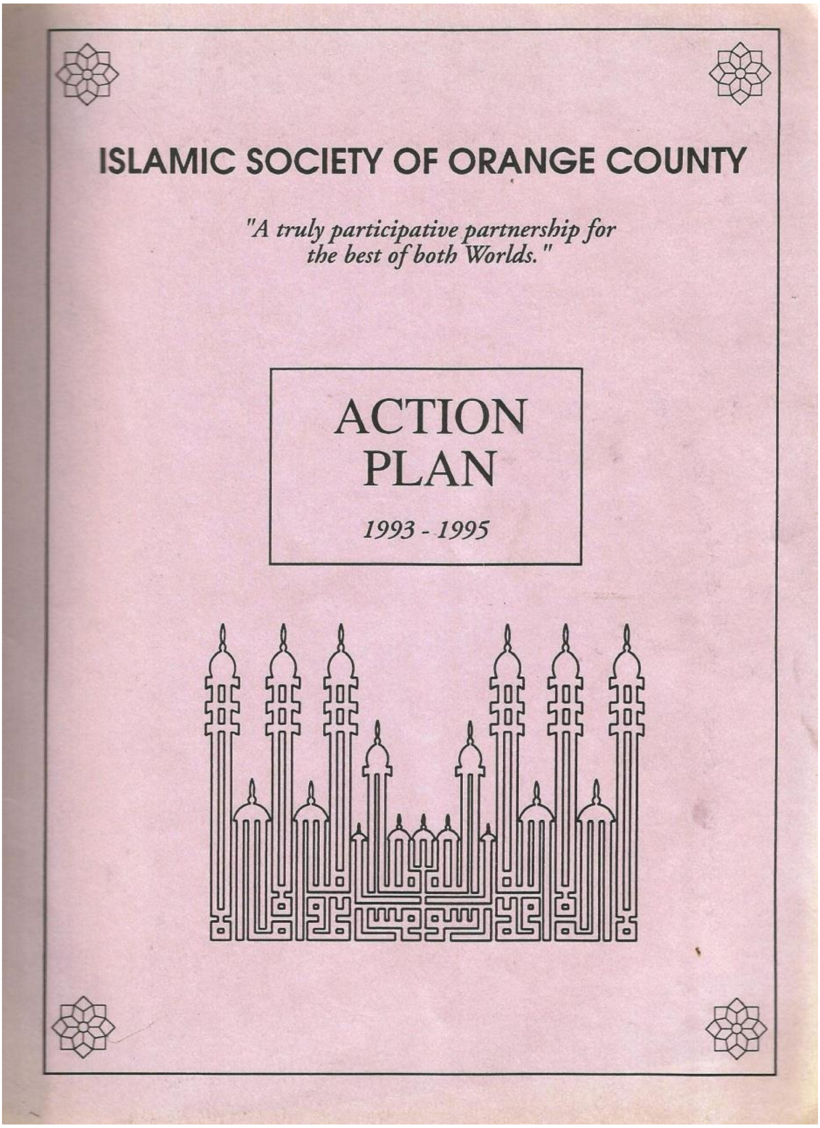

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے ایکشن پلان کا ایک ٹائٹل

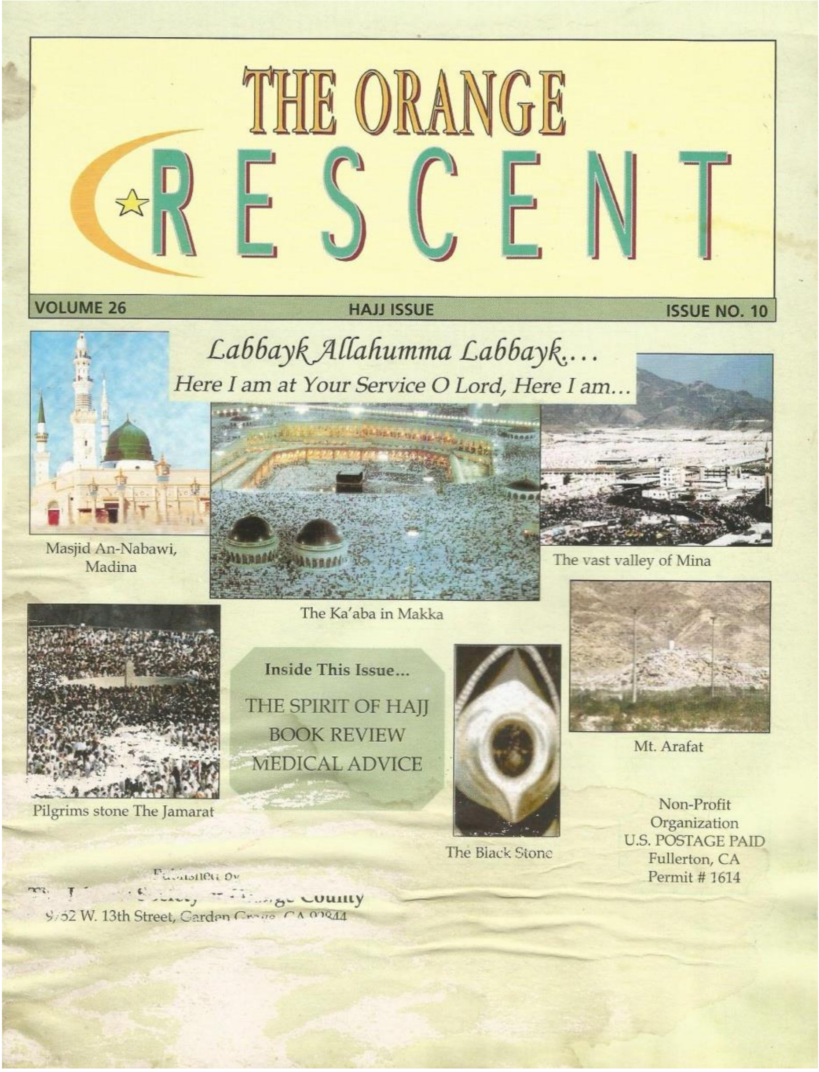
THE ORANGE CRESCENT
VOLUME 26 HAJJ ISSUE ISSUE NO. 10
Labbayk Allahumma Labbayk....
Here I am at Your Service O Lord, Here I am...
Masjid An-Nabawi, Madina
The Ka'aba in Makka
The vast valley of Mina
Pilgrims stone The Jamarat
Inside This Issue...
THE SPIRIT OF HAJJ
BOOK REVIEW
MEDICAL ADVICE
The Black Stone
Mt. Arafat
Non-Profit Organization
U.S. POSTAGE PAID
Fullerton, CA
Permit # 1614
County
W. 13th Street, Garden

2003ء میں اورنج کریسنٹ میگزین کے فرنٹ ٹائٹل کی ایک تصویر

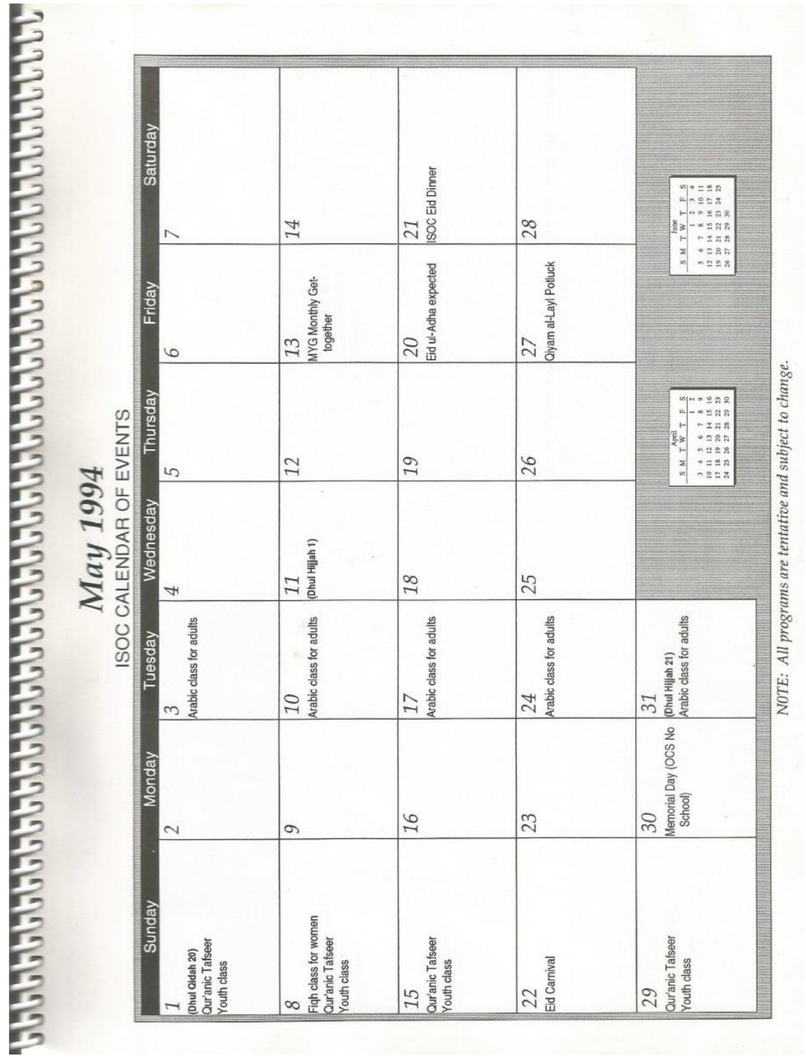

May 1994
ISOC CALENDAR OF EVENTS

Sunday	Monday	Tuesday	Wednesday	Thursday	Friday	Saturday
1 (Dhul Qidah 20) Qur'anic Tafseer Youth class	2	3 Arabic class for adults	4	5	6	7
8 Fiqh class for women Qur'anic Tafseer Youth class	9	10 Arabic class for adults	11 (Dhul Hijjah 1)	12	13 MYG Monthly Get-together	14
15 Qur'anic Tafseer Youth class	16	17 Arabic class for adults	18	19	20 Eid ul-Adha expected	21 ISOC Eid Dinner
22 Eid Carnival	23	24 Arabic class for adults	25	26	27 Qiyam al-Layl Potluck	28
29 Qur'anic Tafseer Youth class	30 Memorial Day (OCS No School)	31 (Dhul Hijjah 21) Arabic class for adults				

April

S	M	T	W	T	F	S
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

June

S	M	T	W	T	F	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30		

NOTE: All programs are tentative and subject to change.

اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی کے مختلف پروگرامز پر مشتمل کیلنڈر

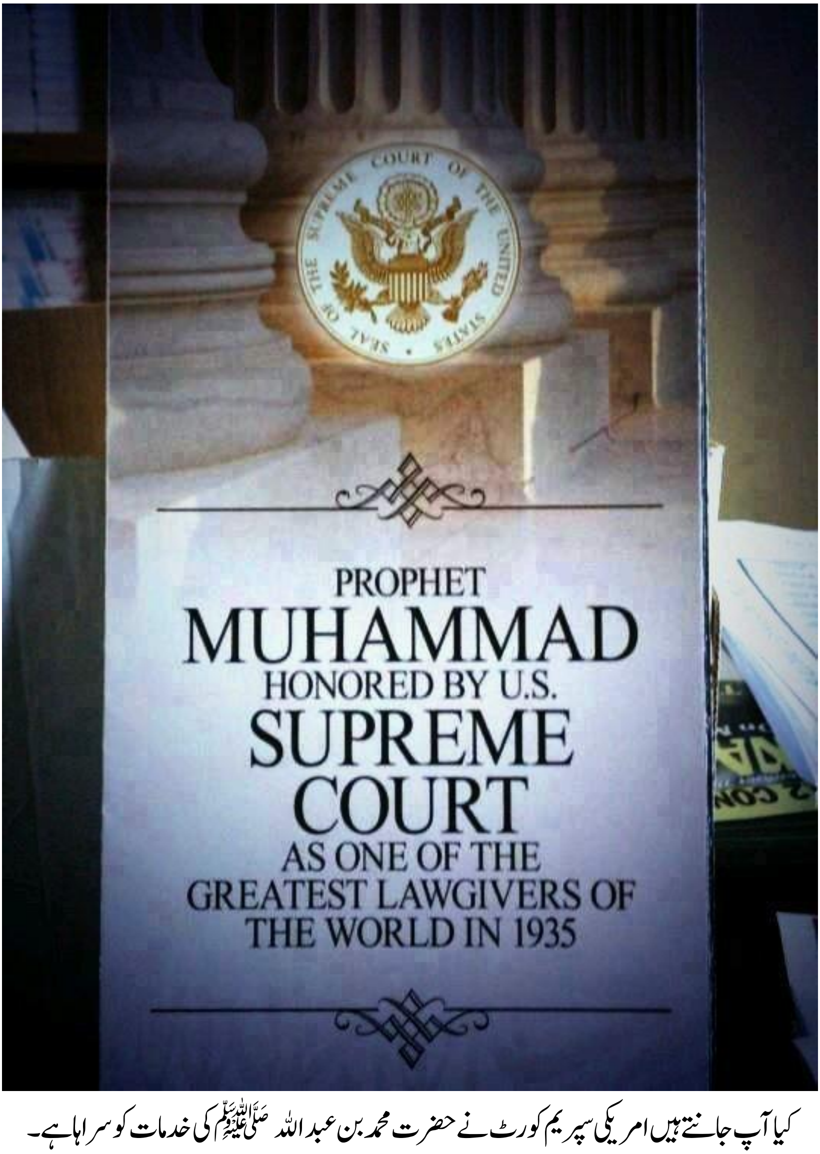

کیا آپ جانتے ہیں امریکی سپریم کورٹ نے حضرت محمد بن عبد اللہ ﷺ کی خدمات کو سراہا ہے۔

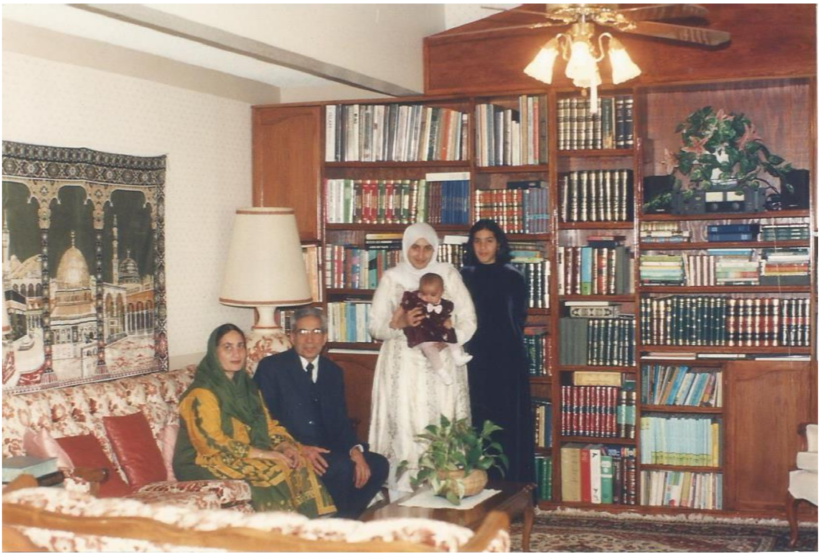

بیگم بشریٰ اسلم اور بیٹیوں عائشہ اور صائمہ کے ساتھ ایک یادگار فوٹو

ایک یادگار تصویر

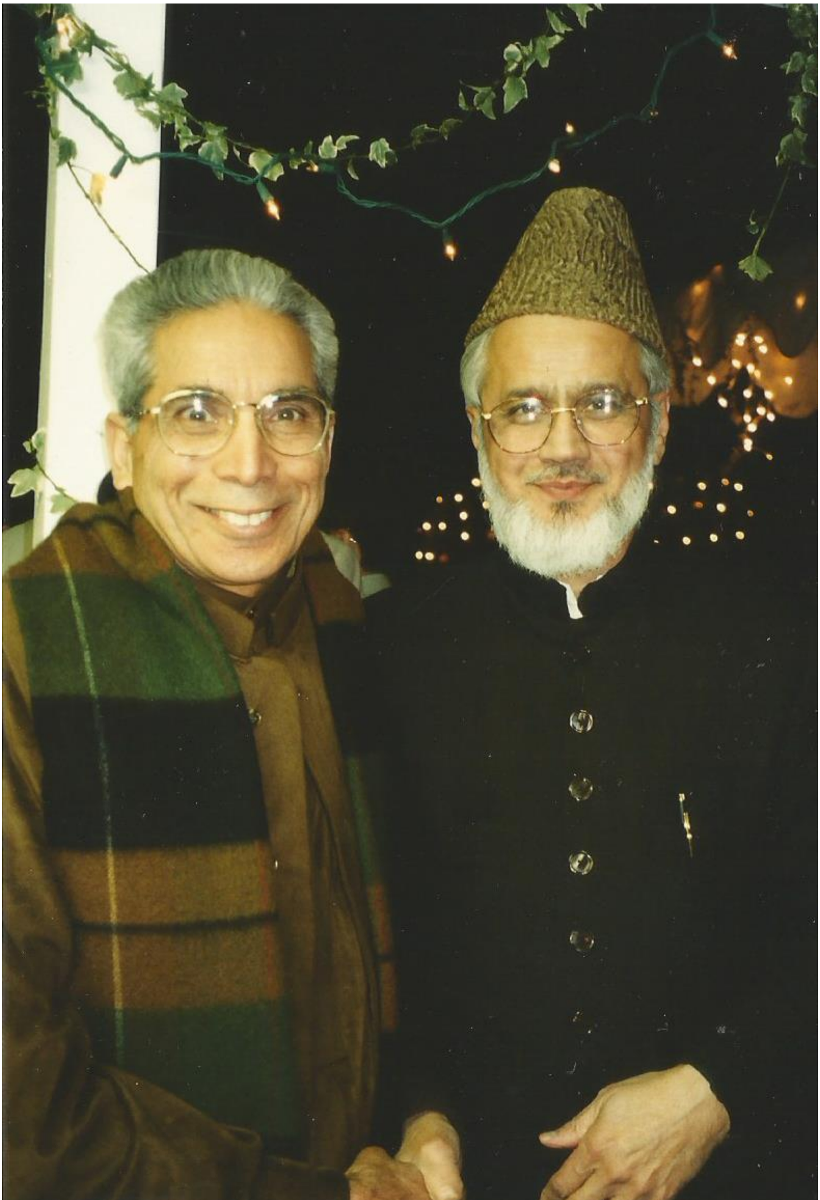

اپنے دوست ڈاکٹر مزمل صدیقی صاحب کے ساتھ

اپنے امریکی احباب کے ہمراہ

اپنے امریکی دوست کے ہمراہ

صائمہ اسلم اور عائشہ اسلم اپنے شوہروں کے ہمراہ

صباٹرسٹ نے نقشے میں نشان زدہ ملکوں میں خدمات سرانجام دیں۔

صباٹرسٹ نے پاکستان میں ان علاقوں میں خدمات سرانجام دیں۔

عبدالستار ایدھی صاحب کے ساتھ امریکہ میں

عبدالستار ایدھی صاحب کے امریکہ کے دورے کے موقع پر لی گئی تصویر

1965 میں کمالیہ میں شروع کیا گیا پہلا فری میڈیکل کلینک

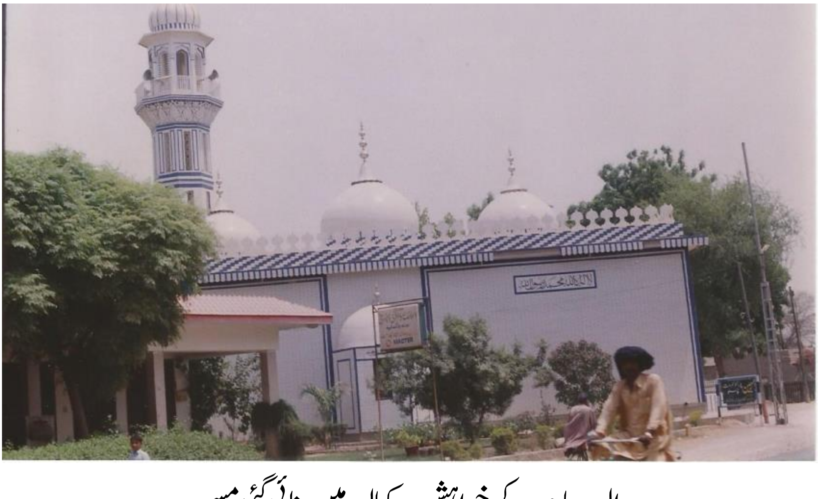

والد صاحب کی خواہش پہ کمالیہ میں بنائی گئی مسجد

کمالیہ میں بچیوں کے لئے بنایا گیا سکول

کمالیہ میں بنایا گیا بچوں کا ہائی سکول

غریبوں کے لئے تحائف تقسیم کرنے کی ایک تقریب

صباٹرسٹ کی طرف سے ضرورت مند افراد میں تحائف کی تقسیم کا ایک منظر

صباٹرسٹ نے نوجوانوں کے لئے تعلیمی وتربیتی سیمینار منعقد کئے

اساتذہ کے لئے ٹریننگ پروگرام تشکیل دیئے گئے

مصباح الحق صبا ہومز کے امریکہ میں ہونے والے فنڈ ریزنگ پروگرام میں شریک ہیں

سٹیٹ آف آرٹ ایمبولینسز کی ریلوے ہسپتال کو فراہمی کے موقع پر

بین المذاہب ہم آہنگی کانفرنس

سیلاب سے متاثرہ بچے تحفہ حاصل کرنے کے بعد

2010 کے سیلاب کے دوران صبا ٹرسٹ کی طرف سے لگائے گئے میڈیکل کیمپ کا ایک منظر

نوشہرہ کے سیلاب متاثرین میں جانوروں کی تقسیم کا ایک منظر

نوشہرہ میں ایک انتہائی غریب معذور بزرگ کے گھر کا منظر

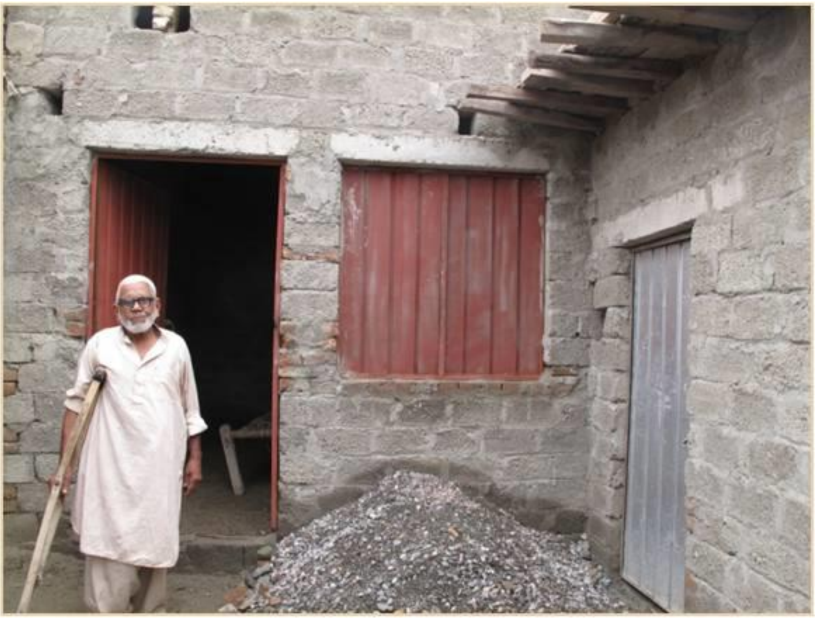

صبا ٹرسٹ کی طرف سے انھیں نیا گھر تعمیر کرنے میں مدد کی گئی

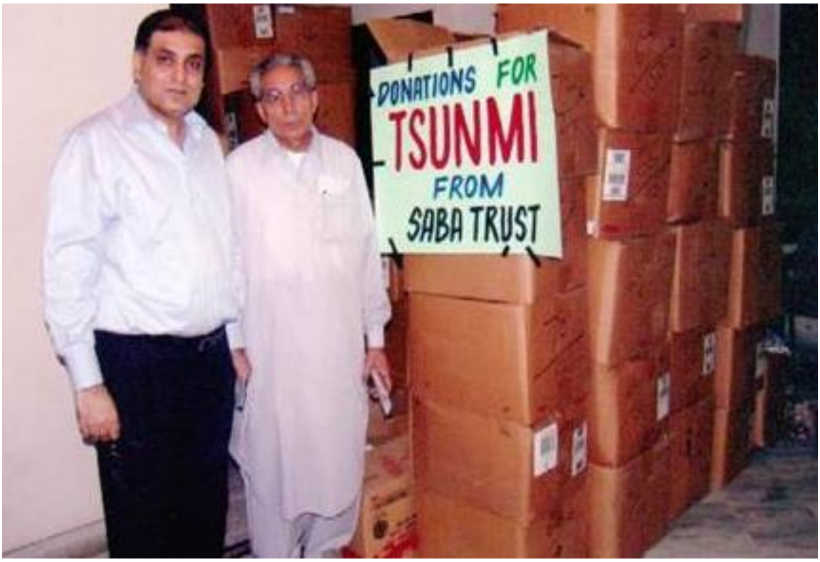

صبا ٹرسٹ کی طرف سے سونامی سے متاثرہ علاقوں کے لئے سامان بھجوایا جارہا ہے

ایدھی فاؤنڈیشن کو ادویات عطیہ کرتے ہوئے

صبا ٹرسٹ کی طرف سے سیلاب متاثرین کے لئے بنائے گئے گھر کا منظر

قائداعظم یونیورسٹی کو کتابیں عطیہ کرنے کے موقع پر

صبا ہومز کی عمارت

صبا گرلز دعائے امن کرتے ہوئے

صباہومز کی بچیاں ایک دوسرے سے بہنوں کی مانند پیار کرتی ہیں

بچیوں کو اپنے دفاع کے لئے مارشل آرٹ / کراٹے کی تربیت کا ایک منظر

صباگرلز پاپا کے ہمراہ خوشگوار موڈ میں

مایہ ناز کرکٹر مصباح الحق صبا ہومز کے دورے کے موقع پر

صبا گرل امبش

برٹش ہائی کمشنر مسٹر ایڈم تھامپسن صبا ہومز کے دورہ کے موقع پر

قلعہ روہتاس کی سیر کے دوران لی گئی ایک تصویر

جان لیوا حملہ صفحہ نمبر 40
نوکری اور ترقی صفحہ نمبر 61
مالی اور جمعدار کا کام صفحہ نمبر 87
امریکی حکومت میں عہدے کی پیشکش صفحہ نمبر 138
ریاض الجنۃ میں عزت افزائی صفحہ نمبر 165
میری کامیابی کے زریں عوامل صفحہ نمبر 180
صبا ٹرسٹ صفحہ نمبر 233
صبر و تحمل صفحہ نمبر 287
جب موت مجھے چھو گزری صفحہ نمبر 324